اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد 17

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

فہرست

مضامین	صفحہ
سورۂ لقمان	۲۵
سورۂ لقمان کے مضامین	۲۶
سورۂ لقمان کی فضیلت	۲۸
آیت ۱ تا ۵	۲۹
نیکوکار کون لوگ ہیں؟	۲۹
آیت ۶ تا ۹	۳۲
شانِ نزول	۳۲
غنا شیاطین کے بڑے جالوں میں سے ایک جال ہے	۳۲
چند قابلِ توجہ نکات:	۳۶
۱۔ غنا کی حرمت	۳۶
۲۔ غنا کیا ہے؟	۳۹
۳۔ حرمت غنا کا فلسفہ	۴۰
(الف) اخلاقی تباہ کاریوں کی رغبت	۴۰
(ب) یادِ خدا سے غفلت۔	۴۱
(ج) اعصاب پر اس کے مضر اثرات۔	۴۱
۴۔ غناء استعمار کا ایک حربہ ہے۔	۴۲
آیت ۱۰ تا ۱۱	۴۳
دوسروں نے کیا پیدا کیا؟	۴۳
آیت ۱۲ تا ۱۵	۴۷
ماں باپ کا احترام	۴۸
چند اہم نکات:	۵۳
۱۔ لقمان کون تھے؟	۵۳
۲۔ لقمان کی حکمت کا ایک نمونہ	۵۵
آیت ۱۶ تا ۱۹	۵۸
پہاڑ کی طرح ڈٹ جاؤ اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرو	۵۹
چند اہم نکات:	۶۳
۱۔ چلنے پھرنے کے آداب	۶۳
۲۔ گفتگو کے آداب	۶۴
۳۔ معاشرتی آداب	۶۴
آیت ۲۰ تا ۲۴	۶۶
قابلِ اطمینان سہارا	۶۸
آیت ۲۵ تا ۳۰	۷۳
پروردگار کی دس صفات	۷۵
آیت ۳۱ تا ۳۲	۸۲
گرداب بلا میں	۸۳
آیت ۳۳ تا ۳۴	۸۷
خدا کے علم کی وسعت	۸۸
چند اہم نکات:	۹۱
۱۔ غرور و فریب کی قسمیں	۹۱
۲۔ دنیا کی فریب کاری	۹۱
۳۔ یہ پانچ علوم خدا کے ساتھ مخصوص ہیں	۹۳
سورۂ الٓمٓ سجدہ	۹۷
اس سورہ کے نام	۹۸
تلاوت کی فضیلت	۹۸
سورۂ سجدہ کے مندرجات	۹۹

آیت ۱ تا ۵ ۱۰۱
عظمت قرآن اور مبدأ و معاد ۱۰۲
چند ایک نکات: ۱۱۰
آیت ۶ تا ۹ ۱۱۴
خلقت انسان کے حیران کن مراحل ۱۱۵
خلاصہ ۱۱۶
ایک نکتہ ۱۲۰
آیت ۱۰ تا ۱۴ ۱۲۲
ندامت اور بازگشت کا تقاضا ۱۲۳
چند اہم نکات: ۱۲۸
۱۔ روح کا استقلال اور اس کی اصلیت ۱۲۸
۲۔ موت کا فرشتہ ۱۲۹
آیت ۱۵ تا ۲۰ ۱۳۱
عظیم جزائیں جنہیں کوئی نہیں جانتا ۱۳۲
ایک نکتہ ۱۴۰
عابد شب زندہ دار ۱۴۰
آیت ۲۱ تا ۲۲ ۱۴۳
تربیتی اور اصلاحی سزائیں ۱۴۳
آیت ۲۳ تا ۲۵ ۱۴۷
امامت کا اہم ترین سرمایہ ۱۴۸
ایک نکتہ ۱۵۲
خدائی رہبروں کا صبر و استقامت ۱۵۲
آیت ۲۶ تا ۳۰ ۱۵۵
ہماری کامیابی کا دن ۱۵۶
سورۂ احزاب ۱۶۱
سورۂ احزاب کی وجہ تسمیہ اور فضیلت ۱۶۲
سورۂ احزاب کے مندرجات ۱۶۳
آیت ۱ تا ۳ ۱۶۵
شانِ نزول ۱۶۵
صرف وحی الٰہی کی پیروی کریں ۱۶۶
آیت ۴ تا ۶ ۱۶۹
فضول دعوے ۱۷۱
ایک نکتہ ۱۸۲
آیت ۷ تا ۸ ۱۸۴
خدا کا محکم عہد و پیمان ۱۸۴
آیت ۹ تا ۱۱ ۱۸۹
میدان احزاب میں کڑی آزمائش ۱۹۰
چند قابل غور مطلب ۱۹۲
آیت ۱۲ تا ۱۷ ۱۹۵
منافقین اور ضعیف الایمان میدانِ احزاب میں ۱۹۷
آیت ۱۸ تا ۲۰ ۲۰۳
روکنے کا ٹولہ ۲۰۵
آیت ۲۱ تا ۲۵ ۲۰۹
جنگِ احزاب میں سچے مومنین کا کردار ۲۱۱
جنگِ احزاب کے چند اہم پہلو ۲۱۷
۱۔ جنگ کی اہمیت ۲۱۷
۲۔ لشکروں کی تعداد ۲۱۰
۳۔ خندق کی کھدائی ۲۱۸
۴۔ بہت بڑی آزمائش کا میدان ۲۱۹
۵۔ حضرت علی کی تاریخی جنگ ۲۱۹
۶۔ پیغمبر اسلام کے فوجی اور سیاسی اقدام ۲۲۲
۷۔ نعیم بن مسعود کی داستان اور دشمن کے لشکر میں پھوٹ ۲۲۳
۸۔ خدیعہ کا واقعہ ۲۲۵
۹۔ جنگِ احزاب کے نتائج ۲۲۶

رسول اللہؐ "اسوہ" اور "قدوہ" ہیں ۲۲۶
خدا کو بہت یاد کرو ۲۲۸
آیت ۲۶ تا ۲۷ ۲۳۰
ایک اور عظیم کامیابی ۲۳۱
چند اہم نکات: ۲۳۳
۱۔ جنگِ بنی قریظہ کے علل و اسباب ۲۳۳
۲۔ جنگِ بنی قریظہ کے واقعات ۲۳۴
۳۔ جنگِ بنی قریظہ کے نتائج ۲۳۵
۴۔ آیات کی معنی خیز تعبیریں ۲۳۵
آیت ۲۸ تا ۳۱ ۲۳۷
شانِ نزول ۲۳۸
سعادتِ ابدی یا دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ ۲۳۹
گناہ اور ثواب دوگنا کیوں؟ ۲۴۲
آیت ۳۲ تا ۳۴ ۲۴۵
ازواجِ نبی کو کیسا ہونا چاہیئے؟ ۲۴۶
چند اہم نکات: ۲۵۱
۱۔ آیت تطہیر عصمت کی واضح دلیل ۲۵۱
۲۔ آیت تطہیر کن افراد کے بارے میں ہے ۲۵۲
۳۔ خدا کا ارادہ تشریعی ہے یا تکوینی؟ ۲۵۶
۴۔ بیسویں صدی کی جاہلیت ۲۵۷
آیت ۳۵ ۲۵۹
شانِ نزول ۲۶۰
اسلام میں عورت کا مقام ۲۶۰
خدا کی بارگاہ میں مرد اور عورت برابر ہیں ۲۶۴
آیت ۳۶ تا ۳۸ ۲۶۶
شانِ نزول ۲۶۷
ایک بہت بڑی رسم ٹوٹتی ہے ۲۶۸
چند اہم نکات ۲۷۳
۱۔ جھوٹے افسانے ۲۷۳
۲۔ حق کے سامنے جھک جانا ہی عین اسلام ہے ۲۷۵
آیت ۳۹ ۲۷۶
پہلے مبلغ کون ہیں؟ ۲۷۷
چند اہم نکات: ۲۷۸
۱۔ "تبلیغ" سے مراد ۲۷۸
۲۔ "خشیت" کا معنی ۲۷۹
۳۔ ایک سوال کا جواب ۲۷۸
۴۔ کیا انبیاء بھی تقیہ کرتے ہیں ۲۷۹
۵۔ تبلیغی امور میں کامیابی کی شرط ۲۸۰
آیت ۴۰ ۲۸۲
ختمِ نبوت ۲۸۲
چند اہم نکات: ۲۸۴
۱۔ "خاتم" کیا ہے ۲۸۴
۲۔ ختمِ نبوت کے دلائل ۲۸۵
۳۔ چند سوال اور ان کے جواب ۲۸۹
۱۔ ختمِ نبوت ارتقاء سے کیونکر ہم آہنگ ہے؟ ۲۸۹
۲۔ ثابت قانون اور بدلتی ضرورتیں ۲۹۰
۳۔ غیبی فیض سے محرومی ۲۹۱
آیت ۴۱ تا ۴۴ ۲۹۳
خدا اور فرشتوں کا درود ۲۹۴
چند ایک نکات: ۲۹۷
۱۔ ہر حال میں خدا کی یاد ۲۹۷
۲۔ لقاء اللہ کیا ہے؟ ۲۹۹
۳۔ مومنین کی جزا بھی تیار ہے ۳۰۰

آیت ۴۵ تا ۴۸ ۳۰۱
رسول اللہؐ چراغ فروزاں ہیں ۳۰۲
چند قابل توجہ نکات ۳۰۳
۱۔ رسالت مآب کا مقام شہود ۳۰۳
۲۔ خدا کی طرف دعوت کا مرحلہ ۳۰۳
۳۔ دعوت اذن الٰہی سے ۳۰۳
۴۔ آپ کا سراج منیر ہونا ۳۰۴
آیت ۴۹ ۳۰۸
طلاق کے کچھ احکام ۳۰۸
آیت ۵۰ ۳۱۲
آپ کے لیے کن عورتوں سے نکاح جائز ہے؟ ۳۱۳
چند اہم نکات: ۳۱۵
۱۔ رسول اللہ کی ایک خصوصیت ۳۱۵
۲۔ اس حکم کا خارجی مصداق ۳۱۵
۳۔ ہبہ اور صیغۂ نکاح ۳۱۶
۴۔ تعدد ازواج کا فلسفہ ۳۱۶
آیت ۵۱ ۳۱۹
شان نزول ۳۱۹
ایک اور مشکل آسان ہوتی ہے ۳۲۰
کیا یہ حکم آپ کی سب بیویوں کے بارے میں تھا! ۳۲۲
آیت ۵۲ ۳۲۴
ازواج رسول کے بارے میں ایک اور اہم حکم ۳۲۴
چند ایک نکات ۳۲۵
۱۔ اس حکم کا فلسفہ ۳۲۵
۲۔ مخالف روایات ۳۲۶
۳۔ آیا نکاح سے پہلے عورت کو دیکھا جاسکتا ہے ۳۲۷
آیت ۵۳ تا ۵۴ ۳۲۹
شان نزول ۳۳۰
چند اہم نکات: ۳۳۶
۱۔ مہمان نوازی ۳۳۶
۲۔ میزبانی میں سادگی ۳۳۷
۳۔ مہمان کا حق ۳۳۸
۴۔ مہمان کی ذمہ داری ۳۳۹
آیت ۵۵ ۳۴۱
شانِ نزول ۳۴۱
قانون حجاب سے مستثنیٰ موارد ۳۴۱
آیت ۵۶ تا ۵۸ ۳۴۴
آنحضرت پر درود وسلام ۳۴۵
چند قابل توجہ نکات ۳۴۵
آیت ۵۹ تا ۶۲ ۳۵۲
شانِ نزول ۳۵۳
زبردست انتباہ ۳۵۴
چند ایک نکات: ۳۵۷
۱۔ پہل خود سے کرنا چاہیئے ۳۵۷
۲۔ دونوں طریقوں سے بچاؤ ۳۵۷
۳۔ مسلمانوں کی طاقت در پوزیشن ۳۵۸
۴۔ فساد کو جڑ سے کاٹ دو۔ ۳۵۸
۵۔ خدا کی اٹل سنتیں ۳۵۸
آیت ۶۳ تا ۶۸ ۳۶۱
قیامت کب آئے گی ۳۶۲
آیت ۶۹ تا ۷۱ ۳۶۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ناروا تہمتیں ۳۶۷
اعمال کی درستی کے لیے حق بات کیا کرو ۳۶۹
آیت ۷۲ تا ۷۳ ۳۷۲
نوع بشر کا بہت بڑا اعزاز ۳۷۳
چند اہم نکات ۳۷۸

جلد — ۱۷

تفسیر نمونہ

سورہ ہائے

لقمان ، الم سجدہ ، واحزاب

پارہ ۲۱ ، ۲۲ قرآن مجید

سُورۂ لقمان

◎ ـــــــ مکّہ میں نازل ہُوئی

◎ ـــــــ اِس کی ۳۴ آیات ہیں

سورہ لقمان کے مضامین

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا بعض علماء مثلاً شیخ طوسی نے تفسیر تبیان میں اس کی تھوڑی سی آیات مثلاً چوتھی آیت جو نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں ہے یا فخرالدین رازی نے اس چوتھی آیت کے علاوہ ستائیسویں آیت کو بھی مستثنیٰ کیا ہے۔ یہ آیت خداوند عالم کے وسیع علم کے بارے میں بحث کرتی ہے لیکن اس قسم کے استثناء کی کوئی واضح دلیل نہیں ملتی۔ کیونکہ نماز اور (اپنے کلی مفہوم کے لحاظ سے) زکوٰۃ مکہ میں بھی موجود تھیں اور خداوند عالم کے وسعت علم کی حقیقت بھی کوئی ایسی چیز نہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ آیت مدنی ہے۔

اسی بناء پر سورہ لقمان مکی ہونے کے لحاظ سے دوسری مکی سورتوں کے مضامین پر مشتمل ہے اور اس میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد مثلاً "مبدء" و "معاد" اور "نبوت" کے سلسلہ میں بحث کی گئی ہے۔

بطور کلی اس سورۃ کے مضامین پانچ حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں:

پہلے حصہ میں حروف مقطعات کے ذکر کے بعد عظمت قرآن اور خاص صفات کے حامل مومنین کے لیے قرآن کا ہدایت اور رحمت ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کے بارے میں بھی گفتگو موجود ہے جو ان آیات کے بارے میں سختی اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں اور جنہیں قرآن نے بہروں سے تشبیہ دی ہے۔ اور ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنی غلط سرگرمیوں کی بدولت لوگوں کو قرآن سے منحرف کرتے رہتے ہیں۔

دوسرے حصہ میں آسمانوں کی تخلیق اور انہیں بغیر کسی ستون کے برقرار رکھنے اور زمین میں پہاڑ پیدا کرنے، مختلف جانور معرض وجود میں لانے، بارش نازل کرنے اور نباتات وغیرہ اگانے کا تذکرہ ہے۔

تیسرے حصہ میں خلاق عالم کی صفات اور قدرت کی مناسبت سے حضرت لقمان کے کچھ حکمت آمیز ارشادات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ نصیحتیں اس مرد خدا نے اپنے فرزند سے کیں۔ چنانچہ ان نصائح میں توحید کے تذکرے اور شرک کے ساتھ محاذ آرائی کی منزل سے لے کر ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجا لانے، سخت قسم کے حوادث کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی کا مظاہرہ کرنے، لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے، تواضع اور فروتنی اختیار کرنے اور تمام امور میں اعتدال پیدا کرنے تک کا حکم موجود ہے۔

چوتھے حصہ میں ایک بار پھر توحید کے دلائل پیش کئے گئے ہیں اور آسمان و زمین کی تسخیر اور خداوند عالم کی وافر نعمتوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں ایسے بت پرستوں کی منطق کی مذمت کی گئی ہے جو صرف اپنے بڑوں کی تقلید میں گمراہی کی وادی میں سرگرداں ہیں اور انہی سے خداوند عالم کی خلاقیت کا اقرار لینے کا ذکر ہے جو عبودیت کی بنیاد اور اساس ہے۔

نیز اس سلسلہ میں قرآن اسی حصہ میں خداوند عالم کے وسیع اور غیر متناہی علم سے ایک واضح مثال کے ذریعہ پردہ اٹھاتا ہے اور اسی سلسلے میں کائنات کی آفاقی نشانیوں کے ذکر کے علاوہ توحید فطری کا ذکر بھی موجود ہے جس کی تجلی انسان کے امواج بلا میں گرفتار ہونے کے

وقت ہوتی ہے اور اس بارے میں یہاں نہایت عمدہ پیرائے میں بحث کی گئی ہے۔

پانچویں حصہ میں معاد اور موت کے بعد زندگی کی طرف مختصر لیکن دل ہلا دینے والا اشارہ موجود ہے جو خبردار کر رہا ہے کہ اس دنیاوی زندگی پر مغرور نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ آخرت کی سرائے جاودانی کی فکر میں رہنا چاہیئے۔

یہاں پر پروردگار عالم کے علم غیب کے اس حصّے کو بیان کیا گیا ہے جو انسان کے جلد امور سے متعلق ہے۔ ان امور میں سے انسان کی موت کا لمحہ بھی ہے اور وہ بچہ بھی جو ابھی شکم مادر میں ہے۔ خدا ان سب کیفیات سے باخبر ہے۔ اسی مطلب پر یہ سورہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ اس سورہ کو "سورہ لقمان" سے موسوم کرنے کی وجہ وہی اہم اور پر مغز گفتگو ہے جو حضرت لقمان کی نصیحتوں پر مشتمل ہے اور یہ واحد سورہ ہے جس میں اس مرد دانا کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

سورۂ لقمان کی فضیلت :

اس سورہ کی فضیلت میں بہت سی روایات پیغمبر اسلام[1] اور آئمہ اہلبیت[2] سے نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ حدیث پیغمبر اکرم سے مروی ہے :

من قرء سورۃ لقمان ، کان لقمان لہ رفیقا یوم القیامۃ ، و اعطی من الحسنات عشرا بعدد من عمل بالمعروف و عمل بالمنکر۔

"جو شخص سورہ لقمان پڑھے، حضرت لقمان قیامت میں اس کے رفیق اور دوست ہوں گے اور جن لوگوں نے نیک یا بد اعمال انجام دئے ہیں (امر بمعروف اور نہی از منکر کے حکم کے بعد) ان کی تعداد کے مطابق دس گنا نیکیاں اسے دی جائیں گی"[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے :

من قرء سورۃ لقمان فی لیلۃ وکل اللہ بہ فی لیلتہ ثلاثین ملکا یحفظونہ من ابلیس وجنودہ حتی یصبح فاذا قرئتھا بالنھار لم یزالوا یحفظونہ من ابلیس و جنودہ حتی یمسی۔

"جو شخص رات کو سورہ لقمان کی تلاوت کرے تو خداوند عالم تیس فرشتوں کو اس کی حفاظت کے لیے صبح تک شیطان اور اس کے لشکر کے مقابلہ کے لیے مامور کر دیتا ہے۔ اور اگر دن کو اس کی تلاوت کرے تو یہ تیس فرشتے غروب آفتاب تک شیطان اور اس کے لشکر سے اس کی حفاظت کرتے ہیں"[2]

ہم بارہا عرض کر چکے ہیں اور اب بھی یہی کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی ایک سورت پڑھنے کے اس قدر فضائل، اس قدر ثواب اور اعزاز اس بنا پر ہیں کہ چونکہ تلاوت، فکر و نظر اور غور و فکر کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور غور و فکر عمل کرنے کا مقدمہ ہے۔ ورنہ محض زبانی قرار پڑھ لینے سے ان تمام فضیلتوں کی توقع نہیں رکھنا چاہیئے۔

---

[1] مجمع البیان ج ۸ ص ۳۱۲۔ [2] نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۱۹۳۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ الٓمّٓ ۚ ○

۲۔ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ۙ ○

۳۔ ھُدًی وَّرَحۡمَۃً لِّلۡمُحۡسِنِیۡنَ ۙ ○

۴۔ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ ○

۵۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّھِمۡ ۟ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○

ترجمہ

بخشنے والے اور نہایت ہی مہربان خدا کے نام سے۔

۱۔ الم۔

۲۔ یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں (مطالب سے لبریز اور محکم آیات)۔

۳۔ نیک لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت کا سبب ہیں۔

۴۔ وہی جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

۵۔ وہی لوگ اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔

تفسیر

نیکوکار کون لوگ ہیں؟

یہ سورہ قرآن مجید کی عظمت و اہمیت کے ذکر کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور حروف مقطعات کا اس کی ابتداء میں ہونا بھی اس

حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ یہ آیات جو الف با جیسے سادہ سے حروف سے مرکب ہیں اس قسم کے عظیم اور اعلیٰ مضامین کی حامل بھی ہیں جو انسانوں کی تقدیر یکسر بدل کر رکھ دیتی ہیں: (الم)۔

لہٰذا حروف مقطعات کے ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ "یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں" (تلک ایات الکتاب الحکیم)۔ "تلک" عربی زبان میں دور کے اشارے کے لیے آتا ہے اور جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ یہ تعبیر خاص طور پر ان آیات کی عظمت و اہمیت پر دلالت کر رہی ہے۔ گویا یہ آیات آسمان کی سی بلندی اور نہایت ارفع مقام کی حامل ہیں۔

"کتاب" کو "حکیم" کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یا تو اس کے مندرجات کا استحکام ہے کیونکہ باطل ہرگز اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ہر قسم کی خرافات اور بیہودگی اس سے کوسوں دور ہے۔ یہ کتاب سوائے حق کے کوئی بات نہیں کہتی اور راہ حق کے علاوہ کسی چیز کی دعوت نہیں دیتی۔ ٹھیک "لھو الحدیث" (لغو اور بیہودہ باتوں) کے مقابلے میں ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

یا پھر اس معنی میں ہے کہ یہ قرآن ایک دانشمند اور حکیم و دانا عالم کی طرح ہے جو خاموش رہ کر بھی بہ ہزار زبان گفتگو کرتا ہے تعلیم دیتا ہے، پند و نصیحت کرتا ہے، تشویق و ترغیب دلاتا ہے، عذاب سے ڈراتا ہے اور عبرت انگیز داستانیں بیان کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ ہر لحاظ سے حکمت سے لبریز ہے۔ اور یہ آغاز حضرت "لقمان حکیم" کی باتوں سے براہ راست مناسبت رکھتا ہے جن کا اس سورہ میں تذکرہ ہے۔

البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں "حکمت" کے دونوں معانی مراد لیے جائیں۔

بعد والی آیت نزول قرآن کا اصلی مقصد یوں بیان کرتی ہے "یہ کتاب حکیم نیکوکاروں کے لیے سبب ہدایت و رحمت ہے" (ھدًی و رحمۃ للمحسنین)۔

"ہدایت" درحقیقت مقدمہ اور تمہید ہے "رحمت پروردگار" کے لیے کیونکہ انسان پہلے نور قرآن کی روشنی میں حقیقت کو معلوم کرتا ہے اور اس پر عقیدہ رکھتا ہے اور اسے اپنے عمل کا پیش خیمہ بناتا ہے اس کے بعد اپنے پروردگار کی وسیع رحمت اور بے انتہا نعمتوں کا حقدار بنتا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیہ میں قرآن مجید کو "محسنین" کے لیے ہدایت اور رحمت کا سبب شمار کیا گیا ہے اور سورہ نمل کی ابتداء میں "مومنین" کے لیے باعث ہدایت و بشارت بتایا گیا ہے: (ھدًی و بشری للمؤمنین)

اور سورہ بقرہ کی ابتداء میں "متقین" کے لیے سبب ہدایت ذکر کیا گیا ہے: (ھدًی للمتقین)

ہو سکتا ہے کہ یہ مختلف تعبیریں اس لیے ہوں کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے بغیر حقائق کو قبول اور تسلیم کرنے کی روح انسان میں بیدار نہیں ہوتی اور نہ ہی طبیعی طور پر کوئی ہدایت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر حق کو قبول کرنے کے اس مرحلہ سے گزر جائیں اور ایمان کا مرحلہ آجائے تو پھر ہدایت کے علاوہ نعمات خداوندی کی بشارت بھی موجود ہوگی۔

اور اگر ایمان اور تقویٰ کے مراحل سے گزر کر عمل صالح کی حد تک جا پہنچیں تو وہاں رحمت خدا میں بھی اضافہ ہوگا۔

اسی بناء پر اُوپر والی تین آیات بندگان خدا کے تدریجی کمال اور ارتقائی مراحل میں سے سلسلہ وار تین مراحل کو بیان کرتی ہیں۔ حق کو

قبول کرنے کا مرحلہ، ایمان کا مرحلہ اور عمل صالح کا مرحلہ۔ اور قرآن ان تینوں مراحل میں بالترتیب "ہدایت" "بشارت" اور "رحمت" کا سرمایہ ہے (غور کیجئے)۔

بعد والی آیت محسنین کو تین اوصاف کے ساتھ متصف کرتے ہوئے کہتی ہے" وہ ایسے لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں"۔ (الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم بالاٰخرۃ ھم یوقنون)۔

ان کا خالق کے ساتھ نماز کے ذریعہ اور مخلوق کے ساتھ زکوٰۃ کے ذریعہ اٹوٹ رابطہ ہے اور قیامت کی عدالت کے بارے میں یقین ان کا قوی سبب ہے کہ وہ گناہ سے پرہیز اور فرائض کو ادا کرتے ہیں۔

اور محل بحث آخری آیت میں "محسنین" کی عاقبت اور انجام کار کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ" وہ اپنے پروردگار کے طریق ہدایت پر ہیں اور وہی رستگاری اور فلاح پانے والے ہیں"۔ (اولٰئک علیٰ ھدًی من ربھم و اولٰئک ھم المفلحون)۔

"اولٰئک علیٰ ھدًی من ربھم" کا جملہ ایک طرف تو اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ پروردگار ان کی ہدایت کا ضامن ہے اور دوسری طرف "علیٰ" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ گویا ہدایت ان کے لیے ایک راہوار اور مرکب ہے اور وہ اس پر سوار ہو کر مکمل طور پر اسی پر مسلط ہیں۔

اور یہاں پر اس "ہدایت" کا فرق اس ہدایت سے جو اسی سورہ کے آغاز میں آئی ہے، واضح ہو جاتا ہے کیونکہ پہلی ہدایت حق کے قبول کرنے کی آمادگی ہے اور یہاں پر بیان شدہ ہدایت مقصد تک پہنچنے کا سرنامہ ہے۔

یاد رہے کہ" اولٰئک ھم المفلحون" کا جملہ جو عربی ادب کے مطابق حصر کی دلیل ہے اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ نجات اور فلاح کی راہ بس یہی ہے یعنی نیک لوگوں کی راہ، ان کی راہ جو خدا اور خلق خدا کے ساتھ قریبی رابطہ رکھتے ہیں، اور ان کی راہ جو مبداء اور معاد پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔

۶۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○

۷۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○

۸۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ○

۹۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

ترجمہ

۶۔ بعض لوگ باطل اور بیہودہ باتیں (باقاعدہ) خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو جہالت و نادانی کی بناء پر گمراہ کریں اور آیات الٰہی کا استہزاء کریں اور مذاق اڑائیں، ان کے لیے ذلیل اور خوار کرنے والا عذاب ہے۔

۷۔ جس وقت اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ تکبیر کی بناء پر ان سے منہ موڑ لیتا ہے گویا اس نے سنا ہی نہیں۔ گویا اس کے کان بالکل بہرے ہیں۔ اسے دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

۸۔ (لیکن) جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال انجام دیئے ہیں نعمتوں سے بھرے ہوئے بہشت کے باغات ان کے لیے ہیں۔

۹۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہ خدا کا مسلم اور یقینی وعدہ ہے اور وہی عزیز و حکیم (ناقابل شکست اور دانا) ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ زیر بحث پہلی آیات "نضر بن حارث" کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ جو ایک تاجر شخص تھا اور تجارت

کی غرض سے ایران کا سفر کیا کرتا تھا اور ساتھ ہی ایرانیوں کی داستانیں قریش کے سامنے بیان کیا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ اگر محمد (ص) تمہارے سامنے عاد و ثمود کی داستانیں بیان کرتا ہے تو میں تمہیں رستم اور اسفندیار کے قصے کہانیاں اور کسریٰ اور سلاطین عجم کی خبریں سناتا ہوں چنانچہ وہ اس کے گرد بیٹھ جاتے اور قرآن کو چھوڑ کر اس کی داستانوں کو خوب غور سے اور کان لگا کر سنتے تھے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیات کا یہ حصہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوا ہے جس نے ایک گویا لونڈی خرید رکھی تھی جو وہ دن رات گانے گا گا کر اسے یاد خدا سے غافل رکھتی تھی۔

عظیم مفسر طبرسی مرحوم اس شان نزول کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ وہ حدیث جو پیغمبر اسلامؐ سے اس سلسلے میں نقل ہوئی ہے وہ اسی نظریے کی تائید کرتی ہے کیونکہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

لایحل تعلیم المغنیات ولا بیعھن، و اثمانھن حرام و قد نزل تصدیق ذلک فی کتاب اللہ" و من الناس من یشتری لھو الحدیث ..."

گانے والی کنیزوں کو تعلیم دینا اور ان کی خرید و فروخت کرنا اور اس طریقہ سے حاصل کی ہوئی آمدنی سب کچھ حرام ہے۔ اور یہ آیت اسی مطلب پر شاہد ہے: (و من الناس من یشتری لھو الحدیث ....)۔

تفسیر

غنا شیاطین کے بڑے جالوں میں سے ایک جال ہے:

ان آیات میں گفتگو اس گروہ کے بارے میں ہے جو "محسنین" اور "مومنین" کے گروہ کے بالکل مدمقابل قرار دیئے گئے ہیں جن کا ذکر گزشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔

یہاں پر گفتگو ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے سرمائے کو بیہودہ اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اپنے لیے دنیا و آخرت کی بدبختی مول لیتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "بعض لوگ وہ ہیں جو باطل اور بے ہودہ باتیں خرید کرتے ہیں تاکہ خلق خدا کو جہالت اور نادانی کی بنا پر راہ خدا سے گمراہ کردیں" (و من الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم)۔ اور یہ آیاتِ خدا کا مذاق اڑاتے ہیں "(و یتخذھا ھزوا)"[1]

اور آیت کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے "ایسے لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے" (اولئک لھم عذاب مھین)۔

باطل اور بے ہودہ باتوں کی خریداری یا تو اس طرح ہے کہ وہ واقعاً باطل اور خرافات سے بھرپور داستانیں پیسے دے کر حاصل

---

[1] یتخذھا کی ضمیر "آیات الکتاب" کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا گزشتہ آیات میں ذکر ہو چکا ہے۔ اور بعض مفسرین کا احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ "سبیل" کی طرف لوٹتی ہے جو قرآن مجید میں کبھی مذکر اور کبھی مونث استعمال ہوا ہے۔

کرتے ہیں جیسا کہ "نضر بن حارث" کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔

اور یا اس طرح سے ہے کہ لہو ولعب اور راگ و رنگ کی محفلیں گانے والی کنیزیں خرید کر منعقد کرتے ہیں جیسا کہ اسی آیت کے شان نزول کے ضمن میں پیغمبر اکرمؐ کی حدیث بیان ہو چکی ہے۔

یا وہ مال و دولت کو اس طرح خرچ کرتے ہیں کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ اس غیر شرعی مقصد یعنی باطل اور بے ہودہ باتوں تک رسائی ضرور حاصل کریں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ دل کے اندھے باطل اور لغویات کو گراں ترین قیمت ادا کر کے بھی خرید لیتے ہیں لیکن آیات الٰہی اور حکمت سے بھرپور اقوال جو خداوند عالم نے بلا قیمت انہیں دیئے ہیں، اُن کی پرواہ تک نہیں کرتے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں پر (اشتراء) یعنی خریداری کو کنایہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہو جس سے مراد اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ہر قسم کی سعی و کوشش ہے۔

لیکن "لھو الحدیث" کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کی باتوں یا سرگرم رکھنے اور غافل کرنے والی راگ و رنگ کی سُروں اور آہنگوں کو بھی شامل ہے جو انسان کو بے ہودگی یا برائی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہیں۔ چاہے وہ غنا ہو گانا ہو، شہوت انگیز و ہوس آلود لحن اور آہنگیں ہوں یا ایسی تقریریں اور تحریریں جو آہنگ و طرز کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے مفہوم و مطالب کے لحاظ سے انسان کو برائیوں کی طرف کھینچ کر لے جائیں۔

یا دونوں طریقوں سے جیسا کہ عام گانے والوں کی تصنیفات اور عشقیہ اشعار ہوتے ہیں۔ اور ان کے مضامین بھی گمراہ کن ہوتے ہیں اور آہنگیں اور سُریں بھی۔

یا وہ واہیات اور خرافات قصے کہانیاں اور داستانیں ہوتی ہیں جو لوگوں کو خدا کے مقرر کردہ "صراط مستقیم" سے انحراف کا سبب بنتی ہیں۔

یا تمسخر آمیز اور ہنسی مذاق پر مبنی باتیں جو حق کو مٹانے اور ایمان کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ابوجہل اور اس کے احباب کے بارے میں ابھی بیان کر چکے ہیں کہ وہ قریش کی طرف منہ کر کے کہتا تھا:

"آیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں وہ "زقوم" کھلاؤں جس سے محمدؐ تمہیں ڈراتے ہیں؟"

پھر وہ کسی کو بھیج کر "مکھن اور خرما" منگوا لیتا اور کہتا "یہ وہی زقوم ہے" اور اس طرح سے وہ آیات الٰہی کا مذاق اڑاتا تھا۔

بہرحال "لھو الحدیث" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ان تمام مذکورہ اشیاء اور امور کو شامل ہے۔ اور اگر اسلامی روایات اور مفسرین کے اقوال میں ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جائے تو وہ ہرگز آیت کے مفہوم کے انحصار اور محدودیت کی دلیل نہیں ہے۔

جو احادیث اہل بیت اطہار (ع) سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو اس لفظ کے مفہوم کی وسعت کو بیان کرتی ہیں۔

منجملہ ان کے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

الغناء مجلس لا ینظر اللہ الی اھلہ وھو مما قال اللہ عز وجل "ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ۔

غنا اور لہو ولعب کی محفل ایسی محفل ہے جس کے اہل پر خدا (اپنے لطف وکرم) کی نگاہ نہیں ڈالتا۔ اور یہ اسی آیہ کا مصداق ہے۔

کہ خداوند عزوجل فرماتا ہے بعض لوگ ایسے ہیں جو بیہودہ باتوں کو خرید کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے گمراہ کردیں[1]

"الحدیث اللھو" کی بجائے "لھو الحدیث" کو بیان کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا اصل مقصد تو وہی لہو ولعب ہے بات یا گفتگو تو اس تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

"لیضل عن سبیل اللہ" کا جملہ بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو اعتقادات کے گمراہ کرنے کو بھی شامل ہے جیسا کہ ابھی نضر بن حارث اور ابوجہل کی داستان میں بیان ہوچکا ہے۔ اور اخلاقی طور پر گمراہ کرنے کو بھی شامل ہے جیسا کہ غنا کے بارے میں مذکور احادیث میں آیا ہے۔

"بغیر علم" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گمراہ اور منحرف گروہ اپنے باطل مذہب پر بھی ایمان نہیں رکھتا بلکہ صرف جہالت اور اندھی تقلید کی وجہ سے دوسروں کی پیروی کرتے ہیں اور ایسے جاہل ہیں کہ دوسروں کو بھی اپنی جہالت اور نادانی میں پھنساتے ہیں۔

یہ اس صورت میں ہے اگر ہم "بغیر علم" کی تعبیر کو گمراہ کرنے والوں کی صفت قرار دیں۔ لیکن بعض مفسرین کا یہ احتمال بھی ہے کہ شاید "گمراہ ہونے والوں" کی صفت ہے۔ یعنی وہ جاہل اور بے خبر لوگوں کو لاشعوری طور پر وادی انحراف وباطل کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

یہ بے خبر لوگ کبھی کبھار اس سے بھی آگے چلے جاتے ہیں یعنی وہ صرف ان سرگرمیوں، کھیل کود اور غافل کرنے والی حرکتوں پر ہی قانع نہیں ہوتے بلکہ اپنی فضول، لایعنی اور بے ہودہ باتوں کو آیات الٰہی کے مذاق اور تمسخر کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف اوپر والی آیت کے آخر میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "ویتخذھا ھزوا"۔

باقی رہا "عذاب" کو "مھین" (خوار اور رسوا کرنے والا) کے ساتھ موصوف کرنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سزا کو جرم کے مانند ہونا چاہیے۔ انہوں نے آیات الٰہی کی توہین کی تو خدا نے بھی ان کے لیے وہی سزا معین کی ہے جو دردناک ہونے کے علاوہ ذلت آمیز بھی ہے۔

بعد والی آیت، آیات الٰہی کے مقابلہ میں اس گروہ کے ردعمل کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ درحقیقت لہو الحدیث کے مقابلہ میں ان کے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے فرماتا ہے "جس وقت ان کے سامنے آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ متکبرانہ انداز میں منہ پھیر لیتا ہے گویا اس نے ہماری آیات کو سنا ہی نہیں۔ گویا اس کے کان بہرے ہیں" اور وہ بالکل ہی کوئی بات نہیں سنتا: (واذا تتلی علیہ آیاتنا ولّی مستکبرا کان لم یسمعھا کان فی اذنیہ وقرا)۔

اور آخر میں اس شخص کی سزا اور دردناک عذاب کو اس طرح بیان کرتا ہے "اس کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو" (فبشرہ بعذاب الیم)۔

"ولّی مستکبرا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کا روگردانی کرنا اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کے دنیاوی مفادات اور ہوس رانی پر زد پڑ رہی ہوتی ہے بلکہ معاملہ تو اس سے بھی بالاتر ہے اور وہ یہ کہ خدا و آیات خدا کے مقابلہ میں استکبار و تکبر جو عظیم ترین گناہ ہیں اس کے عمل میں موجود ہیں۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ پہلے تو یہ کہا ہے کہ "وہ اس طرح آیات الٰہی سے بے اعتنائی کرتے ہیں گویا انہیں سنا ہی نہیں اور مکمل طور

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۵ (باب تحریم الغناء)۔

پر بے اعتنائی کے ساتھ ان کے قریب سے گزر جاتے ہیں" پھر مزید کہتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ان آیات کو سنتا ہی نہیں بلکہ گویا بالکل بہرہ ہے اور کوئی بات نہیں سن پاتا۔

اس قسم کے افراد کی سزا بھی ان کے اعمال سے مطابقت رکھتی ہے کہ جس طرح ان کا عمل اہل حق کے لیے دردناک تھا خدا نے اس کی سزا بھی دردناک مقرر کی ہے کہ انہیں دردناک عذاب میں گرفتار کرے گا۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ "بشر" (خوشخبری دیدو) کی تعبیر خدا کے دردناک عذاب کے سلسلہ میں ایسے متکبرین کے کام کے شایان شان ہے جو آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے اور ابوجہل جیسے افراد جو "زقوم جہنم" کی "مکھن اور خرما" سے تفسیر کرتے تھے۔

بعد والی آیات میں سچے مومنین کے حالات کی تفصیل و تشریح کی طرف لوٹتا ہے کہ ابتداء میں جن کے ساتھ یہ تقابل شروع ہوا آخر میں اختتام بھی انہی پر کرتا ہے، فرماتا ہے "جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیا تو نعمت سے بھرپور جنت کے باغات ان کے لیے ہیں" (ان الذین امنوا و عملوا الصالحات لھم جنات النعیم)۔

جی ہاں یہ گروہ مومنان، بے ایمان متکبرین اور دل کے اندھوں کے بالکل برعکس ہے جو نہ تو دنیا میں خدا کے آثار اور نشانیوں کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی خدا کے بھیجے پیغمبروں کے ارشادات کو دل کے کانوں سے سنتے ہیں بلکہ یہ مومن لوگ بیدار عقل و خرد اور چشم بینا اور گوش شنوا کے حکم سے جو خدا نے انہیں عطا فرمائے ہیں آیات الٰہی پر ایمان بھی لاتے ہیں اور اپنے اعمال صالحہ میں انہیں استعمال بھی کرتے ہیں۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ وہ متکبرین "عذاب الیم" کے اور یہ مومنین "جنات نعیم" کے مستحق ہیں۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جنت کے یہ نعمتوں بھرے باغات ان کے لیے جاودانہ اور ہمیشہ کے لیے ہیں "ہمیشہ اسی میں رہیں گے" (خالدین فیھا)۔

"یہ خدا کا اٹل اور مسلّم وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی ہرگز نہیں ہو سکتی" (وعد اللہ حقّا) خدا نہ تو جھوٹا وعدہ کرتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے وعدہ کی وفائی سے عاجز ہے کیونکہ "وہ عزیز" صاحب قدرت اور حکیم و آگاہ ہے" (وھو العزیز الحکیم)۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ متکبرین کے بارے میں "عذاب" بصورت مفرد ذکر ہوا ہے اور صالح العمل مومنین کے بارے میں "جنات" کو جمع کی صورت میں بیان کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی رحمت ہمیشہ اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

خلود اور خدا کے وعدہ حق پر تاکید کرنا بھی "رحمت" کے "غضب" پر زیادہ ہونے کی تاکید ہے۔ "نعیم" جو "نعمت" کے مادہ سے ہے ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کی مادی اور معنوی نعمتوں کو شامل ہے یہاں تک کہ ان نعمتوں کو بھی جو اس دنیا کے زندان بدن میں محبوس و مقید لوگوں کے لیے قابل ادراک ہیں۔ "راغب" اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں کہ "نعیم" "بہت سی نعمتوں" کے معنی میں ہے" (النعیم النعمة الکثیرة)

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ غنا کی حرمت:

اس میں شک نہیں کہ غنا (گانا) مشہور شیعہ علماء کی نظر میں حرام ہے اور اجماع و اتفاق کی حد تک شہرت رکھتا ہے۔

بہت سے علماء اہل سنت بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ استثناء کے بھی قائل ہوئے ہیں اور شاید ان میں سے بعض استثناء درحقیقت استثناء نہ ہوں بلکہ ان کا شمار غنا کے موضوع سے خارج ہو۔ (جسے اصطلاح میں "تخصص" کے لحاظ سے خارج کہا جاتا ہے)۔

"قرطبی" زیر بحث آیات کے ذیل میں اس بارے میں یوں کہتے ہیں "بعض لوگوں کے درمیان جو غنا اور گانا معمول ہے وہ وہ ہے جب عورتوں کے بارے میں عشقیہ اشعار، ان کے حسن وجمال کی تعریف اور شراب وکباب اور دوسرے محرمات کا تذکرہ ہو۔ تو ایسی صورت میں تمام علماء اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ کیونکہ یہ لہو ولعب اور غنائے مذموم کا مصداق ہے۔ لیکن اگر ان امور سے خالی ہو تو اس کا کچھ حصہ عید اور شادی کے جشنوں میں جائز ہوتا ہے۔ اور اسی طرح مشکل کاموں کے انجام دینے کے وقت فرحت اور نشاط بخشنے کے لیے گاتے ہیں جیسا کہ تاریخ اسلام میں خندق کھودنے کے سلسلہ میں ملتا ہے یا جو اشعار "انجشہ" نے قافلوں کے مکہ کی طرف چلنے کے وقت حجۃ الوداع کے موقعہ پر اونٹوں کے لیے پڑھے تھے لیکن موجودہ زمانہ میں جو کچھ "صوفیا" کے درمیان معمول ہے کہ وہ اس سلسلہ میں انواع واقسام کے آلات طرب و نشاط استعمال کرتے ہیں، حرام ہے"[1]

قرطبی نے استثناء کی جو صورت بیان کی ہے مثلاً "حدی خوانی" (مخصوص آواز میں گانا، جو اونٹوں کے چلاتے وقت گایا جاتا ہے) یا وہ مخصوص اشعار جو مسلمان خندق کھودتے وقت خاص طرز میں پڑھتے تھے احتمال قوی یہ ہے کہ یہ نہ تو غنا کی جزء تھے اور نہ ہیں۔ اسی طرح وہ اشعار بھی غنا نہیں جو مخصوص آواز میں مذہبی جلوسوں، جشنوں اور عزاداری کے مواقع پر پڑھے جاتے ہیں۔

اسلامی مصادر کے لحاظ سے غنا کی حرمت پر ہمارے پاس بہت سے دلائل موجود ہیں جن میں سے ایک تو وہی اوپر والی آیت ومن الناس من یشتری لھو الحدیث .... ہے نیز اور بھی قرآنی آیات ہیں جو کم از کم ان روایات کی رو سے جو ان آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں غنا اور گانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں۔ یا ان کی رو سے غنا اور گانا حرام ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

واجتنبوا قول الزور (حج ۳۰) والی آیت کی تفسیر میں فرمایا: قول الزور، الغنا۔

"باطل بات، غنا ہی تو ہے"[2]

نیز آپ ہی نے آیہ والذین لا یشھدون الزور (فرقان ۷۲) کی تفسیر میں فرمایا:

"اس سے مراد غنا ہے"[3]

اور اسی زیر بحث آیت کی تفسیر میں متعدد روایات امام محمد باقر، امام جعفر صادق اور امام علی رضا علیہم السلام سے منقول ہیں کہ "لھو الحدیث" کے مصداقوں میں سے ایک مصداق جو "عذاب مہین" کا سبب ہے غنا اور راگ رنگ بتایا گیا ہے[4]

علاوہ ازیں، آیات کی تفسیر سے ہٹ کر اور بھی بہت سی روایات اسلامی کتابوں میں ملتی ہیں جو زوردار انداز میں غنا کی حرمت کو بیان کرتی ہیں۔

ایک حدیث جو جابر بن عبد اللہ انصاری نے پیغمبر اسلام سے بیان کی ہے آپ فرماتے ہیں:

کان ابلیس اول من تغنی "شیطان وہ پہلا شخص ہے جس نے گانا گایا"[5]

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۸، صفحہ ۵۱۳۰، [2]، [3]، [4]، [5] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۵ تا ۲۲۷، ۲۳۱۔ باب ۹۵ تحریم الغنا۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

بیت الغناء لاتؤمن فیہ الفجیعۃ، ولا تجاب فیہ الدعوۃ، ولا یدخلہ الملک

"جس گھر میں گانا گایا جاتا ہو وہ موت اور مصائب وآلام سے محفوظ نہیں ہوتا اور نہ تو اس میں دعا قبول ہوتی ہے اور نہ ہی فرشتے داخل ہوتے ہیں"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

الغناء یورث النفاق و یعقب الفقر

"غنا روح نفاق کو پروان چڑھاتا اور فقر وفاقہ اور بدبختی وجود میں لاتا ہے۔"[2]

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے جس میں آپؑ نے گانے والی عورت اور جو شخص اسے اجرت دیتا ہے اور جو اس کی کمائی کھاتا ہے ان سب کو ملعون اور رحمت خدا سے دور لوگوں کے زمرے میں شمار فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

المغنیۃ ملعونۃ، ومن اداھا ملعون، و اکل کسبھا ملعون[3]

اہلسنت کے مشہور منابع میں بھی اس بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔

منجملہ ان کے وہ روایت ہے جو "در منثور" میں محدثین کی کثیر جماعت سے ابوامامہ کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

لا یحل تعلیم المغنیات و لا بیعھن و اثمانھن حرام۔

"گانے والی عورتوں کو تعلیم دینا حلال نہیں ہے اور اسی طرح ان کنیزوں کی خرید وفروخت اور وہ چیز جو اس کے مقابلے میں لی جائے نیز حرام ہے"۔[4]

اس سے ملتے جلتے معانی کو مولف "التاج" نے ترمذی اور امام احمد سے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "التاج" جلد ۵ صفحہ ۲۸۰

"ابن مسعود" نے پیغمبر اسلامؐ سے نقل کیا ہے آپؐ نے فرمایا:

الغناء ینبت النفاق فی القلب کما ینبت الماء البقل

"غنا اور راگ رنگ، روح نفاق کو دل میں اس طرح پروان چڑھاتا ہے جس طرح پانی سبزہ جات کو"۔[5]

مجموعی طور پر جو روایات اس بارے میں نقل ہوئی ہیں اس قدر زیادہ ہیں کہ تواتر کی حد تک جا پہنچتی ہیں۔ اسی بنا پر اکثر علماء اسلام نے اس کی حرمت کا فتوٰی دیا ہے، علاوہ شیعہ علماء کے جو تقریباً اس بارے میں متفق القول ہیں، اس کی حرمت ابوحنیفہ سے بھی منقول ہے۔ اور جس وقت اہلسنت کے مشہور امام، احمد سے غنا کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا:

ینبت النفاق "انسان کے اندر روح نفاق کو اگاتا ہے"

اسی طرح اہلسنت کے ایک اور امام، مالک نے اسی سوال کے جواب میں فرمایا:

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۵، ۲۳۰۔ [2] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۳۳۸۔ [3] در منثور ذیل آیہ زیر بحث۔ [4] تفسیر روح المعانی اسی آیہ کے ذیل میں۔

یفعلہ الفساق "فاسق لوگ ہی اس کے پیچھے جاتے ہیں"

اور امام شافعی نے تو صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ:

"گانے والوں کی شہادت (وگواہی) قابل قبول نہیں ہے اور یہ خود ان کے فسق کی دلیل ہے"

شافعی کے اصحاب سے بھی نقل ہوا ہے کہ وہ اس بارے میں ان کا فتوٰی حرمت پر مبنی جانتے ہیں، برخلاف اس کے جو بعض لوگوں نے خیال کیا ہے۔[1]

۲۔ غنا کیا ہے؟

حرمت غنا کے بارے میں تو چنداں مشکل نہیں، مشکل امر تو غنا کے موضوع کی تشخیص ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر اچھی اور خوبصورت آواز غنا ہے؟

یقیناً ایسا نہیں ہے کیونکہ اسلامی روایات میں بھی ہے اور مسلمانوں کی سیرت بھی اسی بات کو بیان کرتی ہے کہ قرآن، اذان اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو اچھی اور زیبا آواز سے پڑھنا چاہیئے۔

کیا غنا ہر وہ آواز ہے جس میں "ترجیع ہو" (گلے میں آواز کی الٹ پھیر جسے اصطلاح میں آواز کا پھیرنا یا گرگری مارنا کہا جاتا ہے)۔ یہ بھی ثابت نہیں۔

اس بارے میں جو کچھ فقہاء اور اہل لغت کے بیانات سے مجموعی طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ غنا، طرب انگیز آہنگوں، سُروں، لہو اور باطل کو کہتے ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں وہ آہنگیں اور طرزیں ہیں جو فسق و فجور اور اہل گناہ و فساد کی محفلوں کے لائق اور شایان ہیں، غنا میں شامل ہیں۔

بالفاظ دیگر غنا اس آواز کو کہا جاتا ہے جو انسان کے اندر شہوانی طاقتوں کو ہیجان میں لائیں اور انسان اس حالت میں محسوس کرے کہ اگر اس آواز کے ساتھ ساتھ شراب اور جنسی لذات بھی ہوں تو مکمل طور پر مناسب ہوگا۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ کبھی ایک "آہنگ" و طرز خود بھی غناء، لہو اور باطل ہے، اور اس کے مشمولات اور مضامین بھی، وہ اس لحاظ سے کہ عشقیہ اور فساد انگیز اشعار کو مطربانہ آہنگوں اور طرزوں کے ساتھ پڑھا جائے۔ اور کبھی صرف آہنگ و طرز غناء ہوتی ہے اس طرح سے کہ اچھے مطالب پر مبنی اشعار یا قرآنی آیات، دعا اور مناجات کو اس طرز کے ساتھ پڑھیں جو عیاش اور بدکار افراد کی محافل کے لائق ہوتی ہیں تو ان دونوں صورتوں میں حرام ہے۔ (غور کیجئے)۔

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات غنا کے دو معنی کئے جاتے ہیں "عام معنی" اور "خاص معنی"۔ خاص معنی تو وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یعنی شہوت کو بھڑکانے والی اور فسق و فجور کی محفلوں سے تعلق رکھنے والی آہنگیں، طرزیں اور سُریں، لیکن اس کا عام معنی ہر قسم کی اچھی آواز ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے غنا کی عام معنی سے تفسیر کی ہے اس کی دو قسمیں کی ہیں: "حلال غنا" اور "حرام غنا"۔

---

[1] تفسیر روح المعانی اسی آیہ کے ذیل میں۔

حرام غنا سے مراد وہی ہے جو ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں اور حلال غنا سے مراد زیبا اور اچھی آواز ہے جو فساد انگیز بھی نہ ہو اور فسق و فجور کی محفلوں سے بھی اس کا تعلق نہ ہو۔

تو اس بنا پر تقریباً اصل تحریم غنا میں کوئی اختلاف نہیں ہے صرف اس کی تفسیری نوعیت میں اختلاف ہے۔

البتہ (دوسرے مفاہیم کی طرح) غنا کے مشکوک مصداق بھی ہیں جہاں انسان واقعاً نہیں جان سکتا کہ فلاں آواز فسق و فجور کی محافل سے تعلق رکھتی ہے یا نہیں؟ تو اس صورت میں اصل برائت کے حکم کے تحت اس پر حلال ہونے کا حکم لگایا جائے گا، (البتہ تعریف بالا کے مطابق غنا کے عرفی مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد)۔

یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حماسی (یعنی حربی آوازیں، طرزیں اور آہنگیں جو جنگ یا ورزش وغیرہ کے میدانوں سے تعلق رکھتی ہیں) کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ملتی۔

البتہ غنا کے سلسلہ میں کئی ایک مباحث ہیں از قبیل ان چند مستثنیات کے جن کے بعض علما قائل ہیں اور بعض قائل نہیں ہیں، اسی طرح کئی اور مسائل جن کا تعلق فقہ سے ہے۔

آخری بات جس کا تذکرہ ہم یہاں پر ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اُوپر لکھا ہے اس کا تعلق صرف اور صرف غنا اور گانے سے ہے، رہا موسیقی اور اس کے آلات کا استعمال وہ ایک علیحدہ بحث ہے جو ہمارے اس موضوع سے باہر ہے۔

۳۔ حُرمت غنا کا فلسفہ:

"غنا" کے مفہوم میں ان شرائط کے ساتھ مکمل غور و خوض سے کہ جن کی تفصیل و تشریح ہم بیان کر چکے ہیں، اس کی حرمت کا فلسفہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

اگر اس میں تھوڑا سا بھی غور و فکر سے کام لیا جائے تو اس کے مندرجہ ذیل مفاسد اور تباہکاریوں کا پتہ چلتا ہے:

الف: اخلاقی تباہ کاریوں کی رغبت: تجربہ بتاتا ہے اور تجربہ ہی بہترین شاہد ہے کہ بہت سے افراد غنا اور راگ کی سروں اور طرزوں سے متاثر ہو کر تقویٰ اور پرہیز گاری کی راہ کو چھوڑ کر خواہشات نفسانیہ کی تکمیل کا رخ کر چکے ہیں۔

عام طور پر مجالس غنا انواع و اقسام کی خرابیوں کا مرکز ہیں اور جو چیز ان خرابیوں کو وسعت بخشتی ہے وہ غنا ہی ہے۔

بعض غیر ملکی اخبارات کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ راگ و رنگ کی کسی محفل میں جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکٹھا تھے وہاں پر غنا کی ایک ایسی طرز لگائی گئی کہ اس سے ان کے جذبات اس قدر بھڑک اٹھے کہ وہ بے قابو ہو کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور اس قدر جنسی برائیوں کا ارتکاب کیا کہ قلم ان کے ذکر سے شرماتا ہے۔

تفسیر "روح المعانی" میں "بنی امیہ" کے کسی سردار سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ اس نے اموالیوں سے کہا راگ رنگ اور گانے بجانے سے پرہیز کرو کیونکہ یہ شرم و حیا کو کم، شہوت میں اضافہ اور شخصیت کو بے آبرو کر دیتے ہیں، شراب کے جانشین ہیں اور وہی سب کچھ کر گزرتے ہیں جو مستی کرتی ہے[1]

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۱ صفحہ ۷۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ راگ رنگ اس قدر بری چیزیں ہیں! انھیں یہ لوگ بھی سمجھ چکے تھے۔

اور اگر اسلامی روایات میں ہمیں بارہا یہ چیز نظر آتی ہے کہ غنا اور راگ دل میں روح نفاق کی پرورش کرتا ہے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ روح نفاق وہی فساد سے آلودہ اور تقویٰ اور پرہیزگاری سے کنارہ کشی اختیار کرنے والی روح ہوتی ہے۔

نیز اگر روایات میں آیا ہے کہ جس گھر میں گانا گایا جاتا ہے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے تو بھی اسی فساد کی آلودگی کی وجہ ہوتی ہے کیونکہ فرشتے خود پاک ہیں اور پاکیزہ چیزوں کے طالب ہوتے ہیں لہٰذا وہ اس قسم کے آلودہ ماحول سے بیزار ہوتے ہیں۔

ب۔ یاد خدا سے غفلت: بعض اسلامی روایات میں غنا کی تفسیر میں اسے "لہو" بھی کہا گیا ہے، تو یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ غنا انسان کو شہوات میں اس طرح مست کر دیتا ہے کہ وہ یاد خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔

اُوپر والی روایات میں ابھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ "لھو الحدیث" "سبیل اللہ" سے "ضلالت" گمراہی کا ایک عامل اور "عذاب الیم" کا موجب ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

کل ما الھی عن ذکر اللہ فھو من المیسر۔ ہر وہ چیز جو انسان کو یاد خدا سے غافل اور شہوات نفسانیہ میں داخل کر دے وہ قمار یا جوئے کے حکم میں ہے۔[1]

ج۔ اعصاب پر اس کے مضر اثرات: غنا اور موسیقی درحقیقت اعصابی نشے کے اہم عامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں منشیات کبھی تو منہ کے ذریعہ یا پینے کی وجہ سے انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہیں (جیسے شراب ہے)۔

کبھی سونگھنے یا قوت شامہ کے ذریعہ (جیسے ہیروئن ہے)۔

کبھی انجکشن INJECTION کے ذریعہ (جیسے مارفین ہے)۔

اور کبھی قوت سامعہ (کانوں) کے ذریعہ (جیسے راگ و رنگ اور غنا و گانا ہے)۔

اسی بناء پر کبھی کبھی غنا اور اس کی مخصوص طرزیں انسان کو نشے میں اس قدر غرق کر دیتی ہیں کہ اس میں مستی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے البتہ بعض اوقات اس مرحلے تک نہیں پہنچتا لیکن پھر بھی معمولی سا نشہ ضرور آ ہی جاتا ہے۔

اسی بنا پر غنا میں منشیات کے بہت سے مفاسد پائے جاتے ہیں چاہے وہ خفیف ہوں یا شدید، مشہور موسیقی دانوں کے حالات زندگی کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی عمر کے دوران تدریجاً ایسی روحانی تکالیف اور پریشانیوں سے دوچار ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اپنے اعصاب کھو بیٹھتے ہیں بلکہ کچھ لوگ تو نفسیاتی بیماریوں میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ اپنے عقل و شعور کو کھو بیٹھتے ہیں اور پھر دیوانوں کی طرف اس پار ہو جاتے ہیں۔ کچھ مفلوج، عاجز اور ناتواں ہو جاتے ہیں۔ اور بعض تو موسیقی کے دوران ہی خون کے دباؤ BLOOD PRESSURE میں مبتلا ہو کر ناگہانی موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔[2]

بعض کتب جو انسانی اعصاب پر موسیقی کے مضر اثرات کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں، ان میں موسیقی دانوں اور گلوکاروں کی ایک جماعت کے بارے میں آیا ہے کہ وہ اپنا پروگرام پیش کرتے ہوئے حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے عنوان اجل بن گئے۔[3]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۲۳۵۔ [2] کتاب تاثیر موسیقی بر روان و اعصاب صفحہ ۹۰۔ [3] تاثیر موسیقی بر روان و اعصاب صفحہ ۵۲ اور مابعد۔

خلاصہ یہ کہ اعصاب پر غنا اور موسیقی کے مضر اثرات، جنون کی پیدائش، خون کے دباؤ اور دوسری ناپسندیدہ تحریکات اس کثرت سے ہیں کہ ان پر زیادہ بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

موجودہ دور میں اس قسم کی اموات کے بارے میں جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ دور کی نسبت اس زمانہ میں ناگہانی اموات کی تعداد زیادہ ہے اور اس اضافے کے متعدد عوامل ہیں جن میں سے ایک عالمی سطح پر موسیقی اور غنا کی افزائش ہے۔

۴۔ غنا، استعمار کا ایک حربہ ہے :

عالمی استعمار ہمیشہ سے عوام خاص کر نوجوان نسل کی بیداری سے وحشت زدہ ہے اس بناء پر وہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے اپنے وسیع پروگراموں میں معاشرے کو غفلت، لاعلمی اور ناآگاہی اور انواع و اقسام کی غلط سرگرمیوں کو شامل کئے ہوئے ہے تاکہ اس طرح سے وہ ان کا بیڑہ غرق کردے۔

چنانچہ موجودہ دور میں اشیاء منشیات صرف تجارتی اہمیت کی حامل ہی نہیں رہیں بلکہ استعمار کا ایک اہم سیاسی حربہ بھی ہیں۔ فحاشی کے مراکز کا قیام، جوئے اور قمار بازی کے کلبوں CLUBES کی وسعت اسی طرح کی دوسری غلط سرگرمیاں ہیں جن میں سے غنا اور موسیقی کو رواج عام دینا بھی شامل ہے اور وہ استعمار کے عظیم آلات میں سے ایک ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے افکار کو مفلوج کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اسی بنا پر دنیا بھر کے ریڈیوز کے اوقات کا بیشتر حصہ موسیقی پروگرام پر مشتمل ہوتا ہے اور ذرائع ابلاغ عامہ کا ایک اہم اور عمدہ موضوع ہے۔

۱۰۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ○

۱۱۔ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

ترجمہ

۱۰۔ آسمانوں کو قابل رؤیت ستونوں کے بغیر خلق کیا اور زمین میں پہاڑ رکھے تاکہ تمہیں لرزانہ دے اور ہر قسم کے حرکت کرنے والے کو اس پر پھیلا دیا۔ اور ہم نے آسمانوں سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ ہم نے روئے زمین پر مختلف قسم کے قیمتی نباتات کے جوڑے جوڑے اگائے۔

۱۱۔ یہ خدا کی خلقت ہے لیکن دکھاؤ کہ خدا کے علاوہ جو معبود ہیں انہوں نے کس چیز کو پیدا کیا ہے؟ لیکن ظالم تو واضح گمراہی میں ہیں۔

تفسیر

دوسروں نے کیا پیدا کیا؟

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قرآن اور اس پر ایمان کے بارے میں تھی موجودہ دو آیات میں توحید کے بارے میں ایک اور دلیل کا ذکر ہے جو عقیدہ کی نہایت بنیادی اصل ہے۔

پہلی آیت میں پروردگار عالم کی آفرینش کے پانچ حصوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو آپس میں اٹوٹ رشتہ رکھتے ہیں (آسمان کی

خلقت، کرات کا فضا میں معلق ہونا، زمین کا اپنی جگہ برقرار رہنا، پہاڑوں کی پیدائش اور پھر جانداروں کی تخلیق، اس کے بعد پانی اور نباتات کی پیدائش جو ان کی غذا کا ذریعہ ہیں)، چنانچہ فرماتا ہے:

خدا نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر پیدا کیا ہے جو قابل رؤیت ہوں (خلق السماوات بغیر عمد ترونها)۔

"عمد" (بروزن قفل) عمود کی جمع ہے جس کا معنی ہے ستون، اور اسے "ترونها" کے ساتھ مقید کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ آسمان مرئی (دیکھے جانے والے) ستون نہیں رکھتے۔ بالفاظ دیگر اس کے ستون تو ہیں لیکن قابل رؤیت نہیں، چنانچہ اس سے پہلے بھی ہم سورہ رعد کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ یہ تعبیر قانون جاذبہ و دافعہ (کشش ثقل) کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے جو نظر نہ آنے والے بہت ہی قوی ستونوں کی طرح آسمانی کرات کو اپنی جگہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اس حدیث میں جسے "حسین بن خالد" نے امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے نقل کیا ہے اس معنی کی تصریح موجود ہے۔ امام نے فرمایا:

سبحان اللہ! الیس اللہ یقول بغیر عمد ترونها؟ قلت بلی، فقال ثم عمد ولکن لا ترونها

"سبحان اللہ! کیا خدا نہیں فرماتا بغیر ستونوں کے کہ جنہیں تم مشاہدہ کرو؟

راوی کہتا ہے، میں نے عرض کیا جی ہاں! تو فرمایا:

پس ستون ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھ پاتے۔[1] و[2]

بہرحال اوپر والا جملہ قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ایک ہے جس کی مزید تفصیل سورہ رعد کی آیہ ۲ کے ذیل میں (جلد ۱۰ صفحہ ۱۰۰ میں) لائے ہیں۔

اس کے بعد "پہاڑوں کی آفرینش" کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے "خدا نے زمین میں پہاڑ رکھے ہیں تاکہ زمین تمہیں مضطرب اور متزلزل نہ کرے" (والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم)[3]۔

یہ اور اس قسم کی دوسری قرآنی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ پہاڑ زمین کے ٹھہراؤ اور ثبات کا ذریعہ ہیں۔ موجودہ زمانے میں علمی لحاظ سے بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ پہاڑ متعدد جہات سے ثبات زمین کا سبب ہیں۔

اس لحاظ سے بھی کہ ان کی جڑیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں جو ایک محکم زرہ کی طرح کرۂ ارض کو اندرونی حرارت سے پیدا ہونے والے دباؤ کے مقابلہ میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ ہوتے تو نہایت خطرناک اور تباہ کن زلزلے اس قدر ہوتے کہ شاید کسی بھی انسان کو زندگی گزارنے کی مجال ہی نہ ہوتی۔

اور اس لحاظ سے بھی کہ یہ مضبوط اور محکم طبقہ چاند اور سورج کی کشش کے دباؤ کا سختی سے مقابلہ کرتا ہے اور اگر پہاڑ نہ ہوتے

---

[1] "تفسیر برہان" جلد ۲ صفحہ ۲۷۸۔ [2] جو لوگ آیہ بالا کو مطلق ستونوں کی نفی کی دلیل سمجھتے ہیں مجبور ہیں کہ آیت میں تقدیم و تاخیر کے قائل ہوں، اور کہیں کہ آیہ دراصل یوں ہے "خلق السماوات ترونها بغیر عمد" جو یقیناً خلاف ظاہر ہے۔ [3] "تمید" "مید" (بروزن "صید") کے مادہ سے اشیاء عظیم کے تزلزل و اضطراب کے معنی میں ہے اور "ان تمید بکم" کا جملہ نحوی لحاظ سے (لئلا تمید بکم) ہے۔

تو زمین کی خاکی پوست میں سمندروں جیسے عظیم مدوجزر پیدا ہوتے جو انسان کے لیے زندگی کو ناممکن بنا دیتے۔

اور اس لحاظ سے بھی کہ آندھی اور طوفان کے دباؤ کو کم کر دیتے ہیں، اور زمین سے ملحق ہوا کے باہمی ملاپ کو زمین کی وضعی حرکت کے موقعہ پر کم سے کم حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو صفحہ ارضی خشک اور بے آب و گیاہ صحراؤں کے مانند تمام دن رات تباہ کن طوفانوں، آندھیوں اور جھکڑوں کی آماجگاہ ہوتا۔[1]

اب جبکہ غیر مرئی (دکھائی نہ دینے والے) ستونوں کی وجہ سے آسمان کے سکون اور پہاڑوں کے ذریعہ زمین کے سکون کی نعمتوں کی بات پوری ہو گئی تو زندہ موجودات کی آفرینش اور ان کے آرام و سکون کی نوبت آتی ہے کہ وہ سکون اور آرام دہ ماحول اور عرصۂ حیات میں قدم رکھتے ہیں چنانچہ فرماتا ہے "اور روئے زمین میں ہر چلنے والے کو پھیلایا" (و بث فیھا من کل دابۃ)۔

"من کل دابۃ" کی تعبیر چلنے پھرنے والے جانوروں کی زندگی کے مختلف اور گوناگوں پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔ ان جانداروں سے لے کر جو اس قدر چھوٹے ہیں کہ آنکھ سے نظر نہیں آتے اور ہمارے سارے ماحول کو پُر کر رکھا ہے، غول پیکر اور کوہ پیکر جانوروں تک جو عظیم الجثہ ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر انسان وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح وہ جانور جن کے رنگ اور چہرے مختلف ہوتے ہیں کچھ تو فضا میں اڑنے والے پرندے اور زمین پر رینگنے والے اور گوناگوں حشرات کہ جن میں سے ہر ایک کی اپنی علیحدہ دنیا ہے اور مسائل زندگی کو لاکھوں آئینوں میں منعکس کرتے ہیں۔

اور پھر یہ بھی واضح ہے کہ چلنے پھرنے والے یہ جاندار آب و غذا کے محتاج ہیں لہٰذا بعد والے جملوں میں ان دو موضوعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ روئے زمین پر انواع و اقسام کی نباتات کے قیمتی جوڑے اگائے" (و انزلنا من السماء ماء فانبتنا فیھا من کل زوج کریم)۔

اور اس طرح سے تمام چلنے پھرنے والے جانداروں خصوصاً انسان کی زندگی کی بنیاد کو پانی اور نباتات تشکیل دیتے ہیں لہٰذا اسے بیان کر رہا ہے، ایسا دسترخوان جو انواع و اقسام کی غذاؤں کے ساتھ تمام روئے زمین پر بچھا ہوا ہے جس میں سے ہر ایک آفرینش و خلقت کے لحاظ سے پروردگار کی عظمت و قدرت پر دلیل ہے۔

قابل توجہ یہ کہ پہلے تین حصوں کی آفرینش کے بیان میں افعال کو غیب کے صیغوں کے ساتھ بیان کیا ہے جب نزول باراں اور نباتات کی پرورش کے مسئلہ پر پہنچا ہے تو افعال کو متکلم کی صورت میں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور ہم نے ہی زمین میں نباتات کو اگایا"۔

یہ خود فصاحت کا ایک فن ہے کہ مختلف امور کے ذکر کے وقت انہیں دو یا چند مختلف شکلوں میں بیان کرتے ہیں تاکہ سننے والے کو کسی قسم کی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا احساس نہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ تعبیر نشان دہی کرتی ہے کہ بارش کے نزول اور نباتات کی پرورش پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

یہ آیت ایک بار پھر "عالم نباتات میں زوجیت" کی طرف اشارہ کرتی ہے جو قرآن کے علمی معجزات میں سے ایک ہے کیونکہ

---

[1] مزید وضاحت تفسیر نمونہ کی جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۰ کے بعد کے صفحات کا مطالعہ فرمائیں۔

اس زمانے میں عالم نباتات میں زوجیت (نر و مادہ کی جنس کا وجود) کا تصور وسیع طور پر ثابت نہیں ہوا تھا اور قرآن ہی نے اس سے پردہ اٹھایا ہے۔ (اس مسئلہ کے سلسلہ میں مزید تشریح کے لیے سورہ شعراء کی آیہ ۷ کے ذیل میں تفسیر نمونہ جلد ۸ کا مطالعہ فرمائیں)۔

یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ نباتات کے جفت کی "کریم" کے ساتھ توصیف، انواع و اقسام کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو ان میں موجود ہیں۔

عالم آفرینش میں خدا کی عظمت اور خلقت کے مختلف پہلوؤں کے ذکر کے بعد روئے سخن مشرکین کی طرف کرتے ہوئے اور ان کو جواب دہ قرار دے کر ان سے جواب طلبی کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ خدا کی آفرینش و خلقت ہے لیکن مجھے یہ دکھاؤ کہ اس کے علاوہ جو معبود ہیں انھوں نے کسی چیز کو خلق کیا ہے؟" (هذا خلق الله فاروني ماذا خلق الذين من دونه)۔

یقیناً وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ اس جہان کی مخلوقات میں سے کوئی بھی چیز بتوں کی تخلیق ہے اسی بنا پر وہ توحید خالقیت کے تو معترف تھے لیکن اس حالت میں وہ کس طرح عبادت میں شرک کی توجیہ کر سکتے تھے؟ کیونکہ خالقیت کی توحید، ربوبیت کی توحید اور مدبر عالم کی یکتائی یہ سب کچھ عبودیت میں توحید کی دلیل ہے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں اُن کے عمل کو ظلم و گمراہی پر مبنی شمار کرتے ہوئے کہتا ہے "لیکن ظالم واضح گمراہی میں ہیں"۔ (بل الظالمون في ضلال مبين)۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ "ظلم" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو کسی چیز کو اس کے غیر محل میں قرار دینے کو شامل ہے اور چونکہ مشرکین عبادت کو اور گاہے تدبیر عالم کو بتوں کے اختیار میں قرار دیتے تھے۔ لہٰذا عظیم ترین ظلم و ضلالت کے مرتکب تھے۔

یاد رہے اوپر والی تعبیر "ظلم" و "ضلالت" کے درمیان باہمی رابطے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کیونکہ انسان جب اس دنیا میں عینی موجودات کی حیثیت اور اُن کے موقع و محل کو نہ پہچانے یا پہچانے تو سہی لیکن اس کی رعایت نہ کرے اور ہر چیز کو اس کے اپنے مقام میں نہ دیکھے تو یقیناً یہ ظلم اس کی ضلالت و گمراہی کا سبب بن جائے گا۔

۱۲۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○

۱۳۔ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ○

۱۴۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○

۱۵۔ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ لَّا فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۪ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۔ ہم نے لقمان کو حکمت دی (اور ان سے کہا) خدا کا شکر ادا کرو، اور جو شکر ادا کرے وہ اپنے فائدہ کے لیے شکر ادا کرے گا۔ اور جو شخص کفران کرے (تو خدا کو کوئی نقصان نہیں دیتا) کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔

۱۳۔ اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا جبکہ وہ اسے وعظ و نصیحت کر رہے تھے۔ بیٹا! کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہ دو کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

۱۴۔ اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں وصیت کی، اس کی ماں زحمت پر زحمت اٹھا کر حاملہ ہوئی (حمل کے زمانے میں ہر روز نت نئی تکالیف کی متحمل ہوتی تھی)۔ اور اس کے دودھ پلانے کی مدت دو سال میں مکمل ہوتی ہے۔ (جی ہاں! ہم نے اسے وصیت کی) کہ میرا شکر اور ماں باپ کا شکریہ ادا کرو کیونکہ تم سب کی بازگشت میری طرف ہے۔

۱۵۔ اور جس وقت وہ دونوں کوشش کریں کہ کسی کو تم میرا شریک قرار دو کہ جس سے تم آگاہی نہیں رکھتے (بلکہ جانتے ہو کہ باطل ہے) تو ان کی اطاعت نہ کرنا، تاہم دنیا میں ان کے ساتھ شائستہ طرز کا سلوک کرو۔ اور ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو میری طرف آتے ہیں۔ اس کے بعد تم سب کی بازگشت میری طرف ہے اور میں تمہیں اس عمل سے آگاہ کروں گا جو تم انجام دیتے تھے۔

تفسیر

ماں باپ کا احترام:

گزشتہ مباحث توحید و شرک اور اہمیت و عظمت قرآن اور اس آسمانی کتاب میں استعمال ہونے والی حکمت کے بارے میں تھے۔ اسی مناسبت سے زیر بحث اور چند بعد والی آیات میں "لقمان حکیم" کے بارے میں اور اس مرد خدا کے چند نصائح، توحید کی عظمت اور شرک سے برسرپیکار رہنے کے سلسلے میں درمیان میں آئی ہیں۔ اور اہم اخلاقی مسائل کہ جن میں لقمان کی اپنے بیٹے کو پند و نصائح کا بیان ہے۔ یہ دس نصیحتیں جو چھ آیات کے اندر بیان ہوئی ہیں اعتقادی مسائل کو بھی دلکش طور پر بیان کرتی ہیں اور دینی فرائض اور ذمہ داریوں کے اصول اور اخلاقی مباحث کو بھی۔

اس بارے میں کہ "لقمان" کون تھے اور کن خصوصیات کے حامل تھے؟ انشاء اللہ آگے چل کر نکات کی بحث میں بیان کریں گے۔ یہاں پر تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک سلجھے ہوئے، سنجیدہ اور مہذب انسان تھے جو ہوائے نفس کے میدان مقابلہ میں سرخرو اور کامیاب ہوئے۔ اور خدا نے ان کے دل پر علم و حکمت کے چشمے جاری کر دیئے۔ ان کے مقام عظمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ خدا نے ان کے پند و نصائح کو اپنے ارشادات کے ساتھ ذکر کیا ہے اور آیات قرآن کے اندر بیان فرمایا ہے۔ جی ہاں! جب انسان کا دل پاکیزگی اور تقویٰ کے زیر اثر نور حکمت سے روشن ہو جائے تو خدا کے ارشادات اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اور وہی کچھ کہتا ہے جو خدا کہتا ہے، اور وہی سوچتا ہے جو خدا

پسند کرتا ہے۔

اس مختصر سی وضاحت کے ساتھ آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے "ہم نے لقمان کو حکمت دی اور انہیں کہا کہ خدا کا شکر ادا کرو کیونکہ جو شخص نعمت کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لیے کرتا ہے۔ اور جو شخص کفران نعمت کرتا ہے وہ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق تعریف ہے" (ولقد آتینا لقمان الحکمۃ ان اشکر للہ ومن یشکر فانما یشکر لنفسہ ومن کفر فان اللہ غنی حمید)۔[1]

رہا یہ سوال کہ "حکمت" کیا ہے؟ تو جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ "حکمت" کے بارے سے معانی بیان ہوئے ہیں مثلاً "عالم ہستی کے اسرار کی پہچان"، "حقائق قرآن سے آگاہی"، "گفتار و عمل کے لحاظ سے حق تک پہنچنا اور" خدا کی معرفت اور پہچان"۔ لیکن ان تمام معانی کو ایک جگہ پر جمع بھی کیا جا سکتا ہے اور حکمت کی تفسیر میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس حکمت کے بارے میں قرآن نے گفتگو کی ہے اور خدا نے لقمان کو عطا فرمائی ہے، وہ مجموعہ ہے "معرفت علم، پاکیزہ اخلاق، تقویٰ اور ہدایت کا نور"۔

ایک حدیث میں اسی آیت کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہشام بن حکم سے ارشاد فرماتے ہیں کہ "حکمت سے مراد فہم و عقل ہے"۔[2]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

اوقی معرفۃ امام زمانہ یعنی حکمت یہ ہے کہ لقمان اپنے زمانہ کے امام اور خدائی رہبر کی معرفت رکھتے تھے۔[3]

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا حکمت کے وسیع مفہوم میں شمار ہوتا ہے اور آپس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔

بہر حال "لقمان" نے اس حکمت کا حامل ہونے کی بناء پر اپنے پروردگار کا شکر شروع کیا، وہ نعمات الٰہی کے اہداف اور نتائج کو جانتے تھے۔ اور انہیں ٹھیک اسی میں کہ جس کے لیے وہ پیدا ہوئی تھیں استعمال میں لائے، اور اصولی طور پر حکمت اسی چیز کا نام ہے۔

"ہر چیز کو اس کی جگہ پر استعمال کرنا" اس بناء پر "شکر" و "حکمت" کی بازگشت ایک ہی نقطہ کی طرف ہوتی ہے۔

ضمنی طور پر آیت میں نعمتوں کے "شکر" اور "کفران" کا نتیجہ اسی صورت میں بیان ہوا ہے کہ "شکر نعمت خود انسان کے اپنے فائدہ کے لیے ہے" اور "کفران نعمت اس کے اپنے نقصان میں ہے" کیونکہ خداوند عالم تو تمام دنیا سے بے نیاز ہے اگر کائنات کی ہر چیز شکر گزاری کرے تو اس کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوگا اور "اگر تمام کائنات کافر ہو جائے تو اس کے دامن کبریائی پر گرد نہیں

---

[1] "ان اشکر للہ" کے جملہ میں کوئی چیز مقدر ہے یا نہیں؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "قلنا لہ" کا جملہ اس سے پہلے مقدر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مقدر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ "ان اشکر" کے جملہ میں خود "ان" تفسیر یہ ہے۔ کیونکہ شکر گزاری عین حکمت ہے اور حکمت عین شکر گزاری (اور دونوں تفسیریں قابل قبول ہیں)۔ [2] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۳ (کتاب العقل والجہل حدیث ۱۲)۔

[3] نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۱۹۰۔

بیٹھ سکتی ہے۔

"ان اشکر للہ" کے جملہ میں "لام" "لام اختصاص" ہے اور لنفسہ کی "لام" "لام نفع" ہے۔ اسی بنا پر شکر گزاری کا نفع اور فائدہ جو کہ آخرت کے ثواب کے علاوہ دوام نعمت اور اس کا اضافہ ہے، خود انسان کی طرف لوٹتا ہے۔ جیسا کہ "کفران" کا زیان اور نقصان صرف اسی کے دامنگیر ہوتا ہے۔

"غنی حمید" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عام افراد کا شکر ادا کرنے والا یا تو کوئی چیز نعمت دینے والے کو دیتا ہے یا اگر نہیں دیتا تو اس کا مقام لوگوں کی نگاہ میں ضرور بلند کرتا ہے لیکن خدا کے بارے میں ان دونوں میں سے کوئی چیز صادق نہیں آتی۔ وہ تو سب سے بے نیاز ہے اور سب تعریف کرنے والوں کی ستائش و تعریف کے لائق اور مستحق ہے۔ فرشتے اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور موجودات کے تمام ذرات اس کی حمد و تسبیح میں مشغول ہیں۔ اور اگر کوئی انسان "زبان قال" سے کفران کرے تو اس کا ذرہ برابر بھی اس پر اثر نہیں پڑتا۔ جبکہ اس کے وجود کے تمام ذرات "زبان حال" سے اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں۔

قابل توجہ یہ نکتہ ہے کہ "شکر" "مضارع کے صیغہ" کے ساتھ آیا ہے جو کہ دوام اور استمرار کی علامت ہے اور "کفر" "ماضی کے صیغہ" کے ساتھ جو ایک مرتبہ پر بھی صادق آتا ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک بار کا کفران ممکن ہے کہ دردناک انجام کا سبب بن جائے۔ لیکن شکر گزاری ضروری ہے اور اسے ہمیشہ جاری رہنا چاہیئے تاکہ انسان ارتقاء کے تدریجی مراحل کو طے کرتا رہے۔

حضرت لقمان اور ان کے مقام علم و حکمت کے تعارف کے بعد ان کی پہلی نصیحت جو ان کے اپنے بیٹے کے لیے ہے وہ اہم ترین وصیت ہے اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے "اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو موعظہ کرتے ہوئے کہا بیٹا! کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہ دے کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے" (واذ قال لقمان لابنہ وھو یعظہ یابنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم)۔

لقمان کی حکمت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ سب سے پہلے اہم اور بنیادی اعتقادی مسئلہ کی طرف جائے اور وہ ہے "توحید" کا مسئلہ۔ توحید تمام اطراف اور جہات سے کیونکہ تخریب پر مبنی اور خدا کے خلاف ہر تحریک کا سرچشمہ شرک ہے خواہ وہ دنیا پرستی ہو یا مقام پرستی، ہوا پرستی اور ان جیسے دوسرے امور جو شرک کا شعبہ شمار ہوتے ہیں جس طرح کہ تمام صحیح، تعمیری اور تربیتی تحریکوں کی اساس توحید ہے یعنی دل کو صرف خدا سے وابستہ رکھنا، اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اس کے غیر سے ناتا توڑنا اور تمام بتوں کو اس کی کبریائی کے آستان پر چکنا چور کرنا۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ لقمان حکیم نفی شرک کی یہ دلیل ذکر کرتے ہیں کہ شرک ظلم عظیم ہے اور وہ بھی خدا کے بارے میں ایسی تعبیر کے ساتھ جو کئی لحاظ سے تاکید کی حامل ہے[1]

اور اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ بے قدر و قیمت چیز کو اس کے مقابلہ میں قرار دیا جائے اور مخلوق کے بارے میں یہ کہ اسے گمراہی کی طرف کھینچ کر لے جائیں اور اپنے مجرمانہ اعمال کے ذریعہ انہیں گمراہی کی طرف لائیں، ان پر ظلم و ستم کریں اور اپنے

---

[1] "ان" اور "لام" اور "جملہ کا اسمیہ ہونا" ہر ایک تاکید پر دلالت کرتا ہے۔

بارے میں یہ کہ پروردگار کی عبودیت کے شرف اور عزت وعظمت سے ہٹ کر اس کے غیر کی پرستش کرکے خود کو قعر مذلت میں گرادیں۔

بعد والی دونوں آیات درحقیقت جملہ معترضہ ہیں جو لقمان کے پند ونصائح کے درمیان خدا کی طرف سے بیان ہوئی ہیں لیکن بے ربط معانی میں نہیں بلکہ خداوند عالم کا کلام ہے جو لقمان کی باتوں سے واضح ربط رکھتا ہے، کیونکہ ان دو آیات میں ماں باپ کے وجود کی نعمت ان کی زحمات، خدمات اور حقوق اور اللہ کے "شکر" کے ساتھ والدین کے "شکریہ" کو بھی قرار دیا ہے۔

علاوہ ازیں لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی ہیں وہ ان کے پُرخلوص ہونے پر بھی دلالت کرتی ہیں کیونکہ اولاد کے ساتھ والدین کو دلی محبت، قلبی لگاؤ اور خلوص دل سے پیار ہوتا ہے، قطعاً ناممکن ہے کہ وہ اولاد کی بہتری کے علاوہ کچھ اور سوچ بھی سکیں۔

پہلے فرماتا ہے کہ "ہم نے انسان کو ہم نے ماں باپ کے بارہ میں سفارش اور وصیت کی" (ووصینا الانسان بوالدیہ)۔

اس کے بعد ماں کی حد سے زیادہ تکالیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "ان کی ماں نے اسے ایسی حالت میں حمل کیا کہ ہر روز اس کے ضعف اور کمزوری پر نئے ضعف کا اضافہ ہوتا" (حملتہ امہ وھنا علی وھن)[1]

علمی لحاظ سے بھی اور تجربہ کی رو سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ مائیں ایام حمل کے دوران کمزوری اور سستی میں مبتلا ہوجاتی ہیں کیونکہ اپنی جان کا شیرہ اور ہڈیوں کا گودہ شکم میں موجود اپنے بچے کی پرورش کے ساتھ مخصوص کردیتی ہیں اور اپنے وجود کے سارے حیاتیاتی مواد کا بہترین حصہ اسے پیش کرتی رہتی ہیں۔

اسی بنا پر مائیں حمل کے زمانہ میں مختلف قسم کے وٹامنز کی کمی کا شکار ہوجاتی ہیں اور اگر اس کی تلافی نہ کی جائے تو انہیں کئی تکالیف اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہاں تک کہ یہی عمل زمانہ رضاعت (یعنی دودھ پلانے) کے دوران میں بھی جاری رہتا ہے کیونکہ دودھ عورت کی جان کا شیرہ ہوتا ہے۔

لہٰذا اس کے بعد کہتا ہے کہ "اس کے دودھ پلانے کے اختتام کا زمانہ دو سال ہے" (وفصالہ فی عامین)۔

جیسا کہ قرآن کی ایک دوسری جگہ بھی اشارہ ہوا ہے "والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین" "مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں گی" (البقرہ۔ ۲۳۳)

البتہ مراد مکمل دودھ پلانے کی مدت ہے اگرچہ ممکن ہے کہ اس سے کم مدت بھی انجام پائے۔

بہرحال مائیں ان ۳۰ ماہ (حمل اور دودھ پلانے کی مدت) میں اپنے بچے کے لیے روحانی اور جسمانی ہر طرح سے خدمت کرکے عظیم ترین قربانی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ ابتدا میں تو ماں اور باپ دونوں کے بارے میں وصیت کرتا ہے لیکن تکالیف اور خدمات کے بیان کے موقعہ پر صرف ماں کی زحمات کا ذکر کرتا ہے تاکہ انسان کو ماں کے ایثار وقربانی اور عظیم حق کی طرف متوجہ کیا جائے۔

---

[1] "وھنا علی وھن" کا جملہ ہوسکتا ہے کہ لفظ "ام" کا "حال" ہو اور لفظ "ذات" کو مقدر (پوشیدہ) مانا جائے۔ تو اس وقت مکمل جملہ یوں بنے گا "حملتہ امہ ذات وھن علی وھن" اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ "وھن" کے مادہ سے مقدر (پوشیدہ) فعل کا مفعول مطلق ہو۔ تو پھر اس صورت میں جملہ یوں ہوگا۔ "تھن وھنا علی وھن"۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ ہم نے اسے وصیت کی کہ میرا شکر بھی ادا کرو اور ماں باپ کا بھی (ان اشکر لی ولوالدیک)۔

میرا شکر ادا کرو کہ میں تمہارا خالق اور منعم ہوں اور اسی قسم کے مہربان ماں باپ تجھے دیئے ہیں اور اپنے ماں باپ کا بھی شکریہ ادا کرو جو اس فیض کا واسطہ اور تمہاری طرف میری نعمتوں کے منتقل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

کس قدر توجہ طلب اور معنی خیز ہے یہ کہ ماں باپ کے شکریہ کو بالکل ہی خدا کے شکر کے ساتھ اور اس کے پہلو میں ذکر فرمایا ہے۔

آیت کے آخر میں جو ایک قسم کی تنبیہ اور عتاب سے خالی نہیں فرماتا ہے "تم سب کی بازگشت میری طرف ہے" (الی المصیر)۔

جی ہاں! اگر تم نے یہاں کسی قسم کی کوتاہی کی تو وہاں پر ان حقوق، تکالیف اور خدمات کے بارے میں بازپرس کی جائے گی اور ذرے ذرے کا حساب لیا جائے گا جہاں تمہیں خدا کی نعمتوں کے شکر اور اسی طرح ماں باپ کے وجود کی نعمت اور ان کے پاک اور بے آلائش تشکر کے سلسلہ میں خدائی حساب سے عہدہ برآ ہونا ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں ایک نکتہ کی طرف توجہ کی ہے کہ قرآن مجید میں والدین کے حقوق کی رعایت پر تو بار بار تاکید کی ہے لیکن اولاد کے بارے میں بہت کم سفارش نظر آتی ہے (سوائے ایک موقعہ پر کہ جس میں اولاد کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت کی ایک منحوس اور بری عادت تھی) تو یہ اس بنا پر ہے کہ اپنے زبردست پیار کی وجہ سے بہت کم ممکن ہوتا ہے کہ والدین اپنی اولاد کو فراموش کردیں جبکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ والدین جب بہت بوڑھے اور بے کار ہوجاتے ہیں تو اولاد انہیں فراموش کردیتی ہے اور یہ ان کے لیے دردناک ترین حالت اور اولاد کے لیے بدترین ناشکری شمار ہوتی ہے[1]

اور ماں باپ کے بارے میں نیکی کی وصیت سے ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوجائے کہ عقائد، کفر اور ایمان کے مسئلہ میں بھی ان کی پیروی کی جائے یا نرمی برتی جائے؟ لیکن بعد والی آیت میں فرماتا ہے "جس وقت وہ دونوں سعی و کوشش کریں کہ کسی چیز کو میرا شریک قرار دو کہ جس سے (کم از کم) آگاہی نہیں رکھتے تو ان کی اطاعت نہ کرو" (وان جاھداک علی ان تشرک بی مالیس لک بہ علم فلا تطعھما)۔

کبھی بھی انسان اور اس کے والدین کے رابطے کو خدا کے رابطے پر مقدم نہ کرنا اور نہ ہی رشتہ داری کی محبت اعتقاد پر حاکم ہو۔

"جاھداک" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کبھی کبھی اس بنا پر کہ وہ اپنی اولاد کی سعادت چاہتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ انہیں اپنے غلط عقائد کی طرف گھسیٹیں اور یہ چیز ہر ایک والدین کے بارے میں دکھائی دیتی ہے۔

اولاد کا فرض بنتا ہے کہ کبھی بھی اس قسم کے دباؤ کے آگے نہ جھکیں اور اپنے فکری استقلال کو محفوظ رکھتے ہوئے عقیدہ توحید کا کسی چیز سے تبادلہ نہ کریں۔

ضمناً "مالیس لک بہ علم" (یعنی وہ چیز کہ جس کا تمہیں علم نہیں) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر بالفرض شرک کے باطل ہونے کو مدنظر نہ بھی رکھا جائے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہے ہی کہ اس کے اثبات پر کوئی دلیل نہیں بن سکتی اور نہ ہی کوئی بہانہ جو شخص اس کے اثبات پر دلیل قائم کرسکتا ہے۔

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۶ صفحہ ۴۰۸۔

علاوہ ازیں اگر شرک کی کوئی حقیقت ہوتی تو یقیناً اس کے اثبات پر کوئی دلیل ضرور ہوتی اور اس قسم کی کسی دلیل کا نہ ہونا یقیناً انہی کے بطلان کی دلیل ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس فرمان سے یہ وہم و گمان پیدا ہو کہ مشرک ماں باپ کے سامنے سختی اور بے احترامی کو استعمال کیا جانا چاہیئے؟ تو فوراً ہی کہتا ہے کہ شرک اور کفر کے مسئلہ میں ان کی پیروی نہ کرنا مطلقاً قطع رابطہ کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کے باوجود "ان کے ساتھ دنیا میں شائستگی کا سلوک کرو" (وصاحبھما فی الدنیا معروفاً) دنیا داری اور مادی زندگی میں ان سے معروجت سے پیش آؤ اور نرمی کا سلوک کرو اور مذہبی امور میں ان کے افکار اور نظریات کے سامنے نہ جھکو۔ یہ ٹھیک اعتدال کا نقطۂ اصلی ہے جس میں خدا اور ماں باپ کے حقوق حسین امتزاج ہے۔

لہٰذا اس کے بعد مزید کہتا ہے "ایسے لوگوں کی پیروی کرو جنہوں نے میری طرف رجوع کیا ہے" (واتبع سبیل من اناب الیّ)۔ کیونکہ "اس کے بعد تم سب کی بازگشت میری طرف ہے اور میں تمہیں اس عمل سے آگاہ کروں گا جو تم انجام دیا کرتے تھے" اور اس کے مطابق ہی جزا اور سزا دوں گا: (ثم الیّ مرجعکم فانبئکم بما کنتم تعملون)۔

اوپر والی آیات میں پے در پے کے اثبات و نفی اور امر و نہی اس لیے ہیں تاکہ مسلمان اس قسم کے مسائل کہ جن میں ابتدائی نظر میں دو ضروری فرائض اور ذمہ داریوں کے انجام دینے میں تضاد کا تصور ہوتا ہو صحیح خطوط کو تلاش کریں اور تھوڑی سی بھی افراط و تفریط کے بغیر صحیح راہ پر گامزن ہو جائیں، اور قرآن مجید میں اس قسم کی جزئیات کو اس باریک بینی اور ظرافت و لطافت کے ساتھ بیان کرنا اس کی فصاحت و بلاغت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔

بہرصورت اوپر والی آیت مکمل طور پر سورہ عنکبوت کی آیہ ۸ کے عین مشابہ ہے جس میں خدا کہتا ہے: (ووصینا الانسان بوالدیہ حسناً وان جاھداک لتشرک بی مالیس لک بہ علم فلا تطعھما الیّ مرجعکم فانبئکم بما کنتم تعملون)۔

بعض تفسیروں میں مذکورہ آیت کا شان نزول منقول ہے جسے ہم سورہ عنکبوت کی آیت ۸ کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ لقمان کون تھے؟ حضرت لقمان کا نام قرآن مجید کی اس سورت کی دو آیات میں آیا ہے۔ آیا وہ پیغمبر تھے یا صرف ایک دانا اور صاحب حکمت انسان تھے؟ قرآن میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی، لیکن ان کے بارے میں قرآن کا لب و لہجہ نشان دہی کرتا ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے کیونکہ عام طور پر پیغمبروں کے بارے میں جو گفتگو ہوتی ہے اس میں رسالت، توحید کی طرف دعوت، شرک اور ماحول میں موجود بے راہ روی سے نبرد آزمائی، رسالت کی ادائیگی کے سلسلہ میں کسی قسم کی اجرت کا طلب نہ کرنا نیز امتوں کو بشارت و انذار کے مسائل وغیرہ دیکھنے میں آتے ہیں، جبکہ لقمان کے بارے میں ان مسائل میں سے کوئی بھی بیان نہیں ہوا۔ صرف ان کے پند و نصائح بیان ہوئے ہیں جو اگرچہ خصوصی طور پر تو ان کے اپنے بیٹے کے لیے ہیں لیکن ان کا مضمون عمومی حیثیت کا حامل ہے اور یہی چیز اس بات پر گواہ ہے کہ وہ صرف ایک مرد حکیم و دانا تھے۔

جو حدیث پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے اس طرح درج ہے:

حقًا اقول لم یکن لقمان نبیًا، و لکن کان عبدًا کثیر التفکر، حسن الیقین، احب اللہ فاحبہ و من علیہ بالحکمۃ ..... یعنی سچی بات یہ ہے کہ لقمان پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ اللہ کے ایسے بندے تھے جو زیادہ غور و فکر کیا کرتے، ان کا ایمان و یقین اعلیٰ درجے پر تھا، خدا کو دوست رکھتے تھے اور خدا بھی انہیں دوست رکھتا تھا اور اللہ نے انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا.....

بعض تواریخ میں ہے کہ لقمان مصر اور سوڈان کے لوگوں میں سے سیاہ رنگ کے غلام تھے باوجودیکہ اُن کا چہرہ خوبصورت نہیں تھا لیکن روشن دل اور مصفا روح کے مالک تھے وہ ابتدائے زندگی سے سچ بولتے اور امانت کو خیانت سے آلودہ نہ کرتے اور جو امور اُن سے تعلق نہیں رکھتے تھے اُن میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے[1]

بعض مفسرین نے اُن کی نبوت کا احتمال دیا ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ واضح شواہد اس کے خلاف موجود ہیں۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص نے لقمان سے کہا کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ ہمارے ساتھ مل کر جانور چرایا کرتے تھے؟ آپ نے جواب میں کہا ایسا ہی ہے! اس نے کہا تو پھر آپ کو یہ سب علم و حکمت کہاں سے نصیب ہوئے؟ لقمان نے فرمایا قدر اللہ، واداء الامانۃ وصدق الحدیث والصمت عما لا یعنینی ۔ اللہ کی قدر، امانت کی ادائیگی، بات کی سچائی اور جو چیز مجھ سے تعلق نہیں رکھتی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے سے![2]

حدیث بالا کے ذیل میں آنحضرت سے ایک روایت یوں بھی نقل ہوئی ہے کہ:

ایک دن حضرت لقمان دوپہر کے وقت آرام فرما رہے تھے کہ اچانک انہوں نے ایک آواز سنی کہ اے لقمان! کیا آپ چاہتے ہیں کہ خداوند عالم آپ کو زمین میں خلیفہ قرار دے تاکہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں؟ لقمان نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اختیار دے دے تو میں عافیت کی راہ کو قبول کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر اس قسم کی ذمہ داری میرے کندھے پر ڈال دے گا تو یقیناً میری مدد بھی کرے گا اور مجھے لغزشوں سے بھی محفوظ رکھے گا۔

فرشتوں نے اس حالت میں کہ لقمان انہیں دیکھ رہے تھے کہا اے لقمان کیوں (ایسا نہیں کرتے)؟ تو انھوں نے کہا اس لیے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا سخت ترین منزل اور اہم ترین مرحلہ ہے اور ہر طرف سے ظلم و ستم کی موجیں اس کی طرف متوجہ ہیں اگر خدا انسان کی حفاظت کرے تو وہ نجات پا جائے گا لیکن اگر خطا کی راہ پر چلے تو یقیناً جنت کی راہ سے منحرف ہو جائے گا اور جس شخص کا سر دنیا میں جھکا ہوا اور آخرت میں بلند ہو اس سے بہتر ہے کہ جس کا سر دنیا میں بلند اور آخرت میں جھکا ہوا ہو اور جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے تو نہ تو وہ دنیا کو پا سکے گا اور نہ ہی آخرت کو حاصل کر سکے گا۔

---

[1] قصص قرآن، (شرح حالات لقمان)۔ [2] "مجمع البیان" اسی آیت کے ذیل میں۔

فرشتے لقمان کی اس دلچسپ گفتگو اور منطقی باتوں سے متعجب ہوئے۔ لقمان نے یہ بات کہی اور سو گئے اور خدا نے نور حکمت اُن کے دل میں ڈال دیا جس وقت بیدار ہوئے تو اُن کی زبان پر حکمت کی باتیں تھیں.... [1]

۲۔ لقمان کی حکمت کا ایک نمونہ بعض مفسرین نے یہاں لقمان کے پند و نصائح کے سلسلے میں جو سورہ کی آیتوں میں بیان کی گئی ہیں اس مرد خدا کی حکمت آمیز باتوں کا ایک حصہ بیان کیا ہے کہ ہم اس کا خلاصہ یہاں پر پیش کرتے ہیں۔

الف۔ لقمان اپنے بیٹے سے اس طرح کہتے ہیں۔

یا بنی! ان الدنیا بحر عمیق، وقد هلك فيها عالم كثير، فاجعل سفينتك فيها الايمان بالله، واجعل شراعها التوكل على الله، واجعل زادك فيها تقوى الله، فان نجوت فبرحمة الله و ان هلكت فبذنوبك! بیٹا! دنیا ایک گہرا اور عمیق سمندر ہے جس میں بہت سی مخلوقات غرق ہو چکی ہیں لہٰذا اس سمندر میں تمہارا سفینہ خدا پر ایمان ہونا چاہیئے جس کا بادبان خدا پر توکل، جس کا زاد راہ خدا کا تقویٰ اور پرہیزگاری ہو اگر تم نے اس سمندر سے نجات پائی تو سمجھو کہ رحمت خدا کی برکتوں سے ہے اور اگر ہلاک ہو گئے تو جانو کہ اپنے گناہوں کی بدولت ہے [2]

یہی مطلب کتاب کافی میں امام موسیٰ کاظمؑ کے ارشادات کے ضمن ہشام بن حکم سے زیادہ مکمل صورت میں لقمان حکیم سے نقل ہوا ہے فرمایا، یا بنی ان الدنیا بحر عمیق، قد غرق فيها عالم كثير، فلتكن سفينتك فيها تقوى الله، وحشوها الايمان وشراعها التوكل، و قيمها العقل، ودليلها العلم و سكانها الصبر۔ بیٹا! دنیا ایک عمیق اور گہرا سمندر ہے جس میں بہت بڑی دنیا غرق ہو چکی ہے اس سمندر میں تمہاری کشتی خدا کا تقویٰ ہونا چاہیئے اور زاد و توشہ، ایمان، اس کا بادبان توکل، ناخدا عقل اور راہنما علم اور اس کے ساکن صبر و شکیبائی ہیں [3]

ب۔ ایک اور گفتگو میں اپنے بیٹے سے مسافرت کے آداب میں کہتے ہیں:

بیٹا! جب تم سفر کرو تو اپنے ساتھ اسلحہ، لباس، خیمہ اور پانی پینے اور سینے پرونے کے وسائل اور ضروری دوائیاں کہ جس سے تم خود اور تمہارے ساتھی استفادہ کر سکیں لے لیا کرو۔ اور اپنے ہم سفر لوگوں کے ساتھ خدا کی نافرمانی کے سوا باقی تمام امور میں ہاتھ بٹایا کرو۔

بیٹا! جب کسی گروہ کے ساتھ سفر کرو تو اپنے کاموں میں ان سے مشورہ کر لیا کرو، اور ان سے خندہ پیشانی

---

[1] مجمع البیان جلد ۸ ص ۳۱۹ زیر بحث آیہ کے ضمن میں۔ [2] مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔
[3] اصول کافی جلد اول ص ۱۳ (کتاب العقل والجہل)۔

کے ساتھ پیش آیا کرو۔

جو زادِ راہ تمہارے پاس ہے اس میں سے سخاوت کیا کرو۔

تمہارے ساتھی جب بھی تمہیں بلائیں تو فوراً ان کو جواب دیا کرو۔

اگر تمہاری امداد کے طالب ہوں تو ان کی مدد بھی کیا کرو۔

جتنا ہو سکے سکوت اختیار کرو۔

نماز زیادہ سے زیادہ پڑھا کرو۔

سواری اور آب و غذا کہ جو تمہارے پاس ہو اس میں سخاوت سے کام لیا کرو۔

اگر تم سے حق کی گواہی طلب کریں تو گواہی دے دیا کرو۔

اگر مشورہ چاہیں تو صحیح اور صائب نظریہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

اچھی طرح غور و فکر اور سوچ بچار کے بغیر جواب نہ دیا کرو۔ اور اپنی ساری فکری قوتوں کو مشورے کے جواب کے لیے استعمال کیا کرو۔ کیونکہ جو شخص مشورہ طلب کرنے والوں کو اپنے خالص ترین نظریہ سے نہ نوازے تو خدا تشخیص اور سوچ بچار کی نعمت اس سے چھین لیتا ہے۔

جب دیکھو کہ تمہارے ساتھی ایک راستے پر چل رہے ہیں اور سعی و کوشش میں مصروف ہیں تو تم بھی کوشش میں لگ جاؤ۔ اپنے سے بڑوں کا کہنا مانو۔

اگر تم سے کوئی شخص جائز اور شرعی تقاضا کرتا ہے تو ہمیشہ اس کا مثبت جواب دیا کرو اور کبھی بھی "نہ" مت کہو، کیونکہ نہ کہنا عجز و توانائی کی نشانی اور ملامت کا سبب ہے....

کبھی بھی نماز کو اول وقت سے تاخیر کے ساتھ نہ پڑھا کرو، اور اپنے اس قرضے کو فوراً ادا کیا کرو۔

جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو خواہ تم سخت ترین حالات میں ہو۔

جس غذا کو کھانا چاہتے ہو کھانے سے پہلے امکانی صورت میں اس سے کچھ مقدار راہِ خدا میں دیا کرو۔

کتاب خدا کی تلاوت کیا کرو اور یادِ خدا سے غافل نہ ہو جاؤ۔[1]

ج۔ یہ داستان بھی لقمان کے بارے میں مشہور ہے جس زمانے میں وہ غلام تھے اور اپنے آقا کے لیے کام کر رہے تھے ایک دن آقا نے ان سے کہا کہ ایک گوسفند میرے لیے ذبح کرو اس کے اعضاء میں سے دو بہترین عضو میرے لیے لے آؤ چنانچہ انہوں نے گوسفند کو ذبح کیا اور اس کی زبان اور دل اس کے لیے لے آئے چند دن کے بعد ایک اور گوسفند کے ذبح کرنے کا حکم دیا لیکن کہا اس کے بدترین عضو میرے لیے لے آؤ تو لقمان نے پھر گوسفند کو ذبح کیا اور وہی زبان اور دل اس کے لیے لے گئے اس نے تعجب کیا اور اس ماجرے کے بارے میں سوال کیا تو لقمان نے جواب میں کہا دل اور زبان اگر پاک رہیں تو وہ ہر چیز سے بہتر ہیں اور

---

[1] گزشتہ حوالہ

اگر ناپاک ہو جائیں تو ہر چیز سے خبیث تر ہیں۔[1]

آخر میں ہم اس گفتگو کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا:

خدا کی قسم وہ حکمت جو لقمان کو خدا کی طرف سے عنایت ہوئی تھی ان کے نسب، مال و جمال اور جسم کی بنا پر نہ تھی۔ بلکہ وہ ایک ایسے مرد تھے جو حکم خدا کی انجام دہی میں قوی اور طاقتور تھے۔ گناہ اور شبہات سے اجتناب کیا کرتے تھے، ساکت اور خاموش رہتے تھے، خوب غور و خوض کے ساتھ دیکھا کرتے تھے، بہت زیادہ سوچا کرتے تھے۔ تیز بین اور دن (کے اول حصے) میں کبھی نہیں سوتے تھے اور مجالس میں (متکبرین کی طرح) تکیہ نہیں لگاتے تھے۔ اور آداب کو پورے طور پر مدنظر رکھتے تھے۔ لعاب دہن نہیں پھینکتے تھے۔ کسی چیز سے نہیں کھیلتے تھے۔ اور کبھی بھی غیر مناسب حالت میں انہیں نہیں دیکھا گیا..... جب بھی دو آدمیوں کو لڑتا جھگڑتا دیکھتے ان کے درمیان صلح کرا دیتے اگر کسی سے کوئی اچھی بات سنتے تو ضرور اس کا حوالہ، ماخذ اور تفسیر و تشریح اس سے پوچھتے۔ فقہاء اور علماء کے ساتھ زیادہ تر نشست و برخاست رکھتے..... ایسے علوم کی طرف جاتے جن کے ذریعہ ہوائے نفس پر غالب آسکیں، اپنے نفس کا علاج قوت فکر و نظر، سوچ بچار اور عبرت سے کرتے اور صرف ایسے کام کی طرف جاتے جو اس کے (دین یا دنیا کے) لیے سود مند ہوتا۔ جو امور ان سے متعلق نہیں ہوتے تھے ان میں ہرگز دخل اندازی نہ کرتے۔ اس بنا پر خدا نے انہیں حکمت و دانائی عطا فرمائی۔[2]

---

[1] تفسیر "بیضاوی" و "ثعلبی"۔ لیکن تفسیر مجمع البیان نے لقمان کی گفتگو کا صرف پہلا حصہ نقل کیا ہے۔

[2] "مجمع البیان" (خلاصہ کے ساتھ)۔

۱۶۔ یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ۝

۱۷۔ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

۱۸۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝

۱۹۔ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ۝

ترجمہ

۱۶۔ بیٹا! اگر رائی کے دانہ کے برابر (نیک یا بد عمل) ہو اور پتھر کے دل میں یا آسمانوں اور زمین کے گوشہ میں قرار پائے خدا اسے (قیامت میں حساب کے لیے) لے آئے گا اور خدا نہایت ہی باریک بین و آگاہ ہے۔

۱۷۔ بیٹا! نماز کو قائم کرو اور امر بالمعروف اور نہی از منکر کرو اور ان مصائب کے مقابلے میں جو تجھے پہنچیں با استقامت اور صابر بنو کیونکہ یہ ایسے کاموں میں سے ہیں جو اہم اور اساسی ہیں۔

۱۸۔ بیٹا! بے اعتنائی کے ساتھ لوگوں سے روگردانی نہ کرو اور غرور کے ساتھ زمین پر نہ چلو کیونکہ خدا کسی متکبر اور مغرور کو دوست نہیں رکھتا۔

۱۹۔ بیٹا! چلنے میں اعتدال کو پیش نظر رکھو اپنی آواز کو دھیما رکھو اور ہرگز اونچی آواز سے نہ بولو کیونکہ بدترین آواز گدھوں کی آواز ہے۔

تفسیر

پہاڑ کی طرح ڈٹ جاؤ اور لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو:

لقمان کی پہلی نصیحت مسئلہ توحید اور شرک سے نبرد آزمائی کے سلسلہ میں اور دوسری نصیحت حساب و کتاب اعمال و معاد کے بارے میں ہے جو "مبداء و معاد" کے حلقہ کی تکمیل کرتا ہے۔

جناب لقمان کہتے ہیں "بیٹا! اگر نیک و بد اعمال یہاں تک کہ رائی کے دانے کے وزن کے برابر ہوں پتھر کے اندر یا آسمان کے گوشے میں یا زمین کے اندر کسی جگہ بھی خدا ان کو دادگاہ قیامت میں حاضر کرے گا اور اس کا حساب و کتاب کرے گا۔ کیونکہ خدا لطیف، باریک بین اور آگاہ و خبردار ہے (یا بنی انها ان تك مثقال حبة من خردل فتكن فی صخرة او فی السماوات او فی الارض یأت بها الله ان الله لطیف خبیر)۔

"خردل" (رائی) ایک پودا ہے جس کے بہت چھوٹے سیاہ دانے ہوتے ہیں جو چھوٹا ہونے کی وجہ سے کمی اور حقارت میں ضرب المثل ہے۔

اس طرف اشارہ ہے کہ نیک اور بد عمل جس قدر چھوٹے اور کم قیمت اور جس قدر مخفی و پنہاں ہیں مثل رائی کے دانے کے جو پتھر کے اندر زمین کی گہرائیوں میں یا آسمان کے گوشہ میں مخفی ہو خداوند لطیف و خبیر جو عالم ہستی کی تمام چھوٹی بڑی موجودات سے آگاہ ہے اُسے حساب و کتاب اور سزا و جزا کے لیے حاضر کرے گا اور کوئی چیز اُس کے ہاں گم نہیں ہوتی!

ضمیر "انها" کی "حسنات و سیئات" اور نیک و بد اعمال" کی طرف لوٹتی ہے[1]

انسان کے اعمال سے پروردگار کا آگاہ ہونا اور تمام نیکیوں اور بدیوں کا پروردگار عالم کی کتاب علم میں محفوظ ہونا اور اس کائنات میں کسی چیز کے نابود نہ ہونے کی طرف توجہ تمام انفرادی و اجتماعی اصلاحات کی اصل و بنیاد اور اچھائیوں کی طرف لے جانے کا طاقتور محرک ہے اور شر و برائیوں سے روکنے کی بڑی طاقت۔

"سماوات" و "ارض" کا ذکر "صخرہ" کے بعد درحقیقت خاص کے بعد عام کے ذکر کرنے کے قبیل سے ہے۔

"اصول کافی" میں امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے فرماتے ہیں:

اتقوا المحقرات من الذنوب فان لها طالباً، یقول احدکم اذنب واستغفر ان الله

---

[1] بعض نے احتمال دیا ہے کہ اُوپر والی ضمیر یا تو ضمیر شان و قصہ ہے اور یا مفہوم شرک کی طرف لوٹتی ہے اور دونوں احتمال بعید ہیں۔

عزوجل یقول سنکتب ماقدموا و آثارهم وکل شیٔ احصیناه فی امام مبین، وقال عزوجل انها ان تک مثقال حبة من خردل فتکن فی صخرة او فی السمٰوٰت او فی الارض یأت بها الله ان الله لطیف خبیر: چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کرو کیونکہ آخر کار کوئی اس کو بھی دریافت کرے گا۔ تم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں ہم گناہ تو کرتے ہیں لیکن اس کے بعد استغفار کر لیتے ہیں حالانکہ خداوند عزوجل فرماتا ہے ہم تمام اس کو جو انہوں نے آگے بھیجا ہے اور اسی طرح ان کے تمام آثار غرض کہ سب کچھ کو ہم نے لوح محفوظ میں محفوظ کر دیا ہے۔

نیز فرمایا ہے اگر اچھے اور برے اعمال حتیٰ کہ رائی کے دانہ کے برابر ہوں پتھر کے اندر یا آسمان کے کسی گوشہ میں یا زمین کے اندر خدا اُن کو حاضر کرے گا۔ کیونکہ خدا لطیف و خبیر ہے[1]

مبداء و معاد جو تمام مکتبی اعتقادات کی اساس ہے کی بنیادوں کو محکم طور پر بیان کرنے کے بعد اہم ترین عمل یعنی مسئلہ نماز کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں "بیٹا نماز کو قائم کرو" (یا بنی اقم الصلوٰة)۔

کیونکہ نماز تمہارے خالق کے ساتھ تمہارا اہم ترین رابطہ ہے۔ تمہارے دل کو بیدار اور روح کو صاف و شفاف اور زندگی کو منور کرتی ہے۔ تمہاری جان سے گناہوں کے آثار کو دھو ڈالتی ہے تمہارے دل کے خانہ میں نور ایمان کی روشنی ڈالتی ہے اور تمہیں فحشاء و منکرات سے روکتی ہے۔

نماز کے پروگرام کے بعد ایک اہم ترین اجتماعی فریضہ امر بمعروف اور نہی از منکر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "لوگوں کو نیکیوں اور معروف کی دعوت دو اور منکرات اور برائیوں سے روکو" (وأمر بالمعروف وانه عن المنکر)۔

ان تین اہم عملی احکام کے بعد ایک ایسے اہم مسئلے کی طرف متوجہ کیا ہے جسے ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو بدن سے ہوتی ہے، اور وہ ہے صبر و استقامت، فرمایا۔ "مصائب و مشکلات کے مقابلے میں جو تم پر نازل ہوتے ہیں صابر و شکیبا رہو کیونکہ یہ چیز ہر انسان کے حتمی فرائض اور بنیادی کاموں سے ہے" (واصبر علیٰ ما اصابك ان ذالك من عزم الامور)۔

مسلم ہے کہ تمام اجتماعی کاموں میں خصوصاً امر بمعروف اور نہی از منکر کے پروگرام میں بہت زیادہ مشکلات ہوتی ہیں اور مفاد پرست حکام گناہوں سے آلودہ اور منکر و خود پسند لوگ آسانی کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے بلکہ امر بمعروف اور نہی از منکر کرنے والوں کے درپے آزار ہو کر متہم کرنے پر اُتر آتے ہیں لہٰذا صبر و استقامت اور شکیبائی کے بغیر ان مشکلات پر کسی وقت بھی قابو نہیں پایا جا سکتا۔

"عزم" محکم ارادے کے معنی میں ہے اور "عزم الامور" کی تعبیر یہاں پر یا تو ان کاموں کے معنی میں ہے جن کے متعلق پروردگار کی طرف سے تاکیدی حکم دیا گیا ہے اور یا ایسے کام جن کے بارے میں انسان کو عزم صمیم اور آہنی ارادہ رکھنا چاہیئے معنی خواہ کچھ ہو دونوں میں اہمیت کی طرف اشارہ ہے یعنی انسان آہنی عزم اور تصمیم راسخ رکھتا ہو۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۰۴

" ذالك " کی تعبیر صبر و شکیبائی کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام امور کی طرف اشارہ ہو جو اوپر والی آیت میں ذکر ہوئے ہیں، منجملہ ان کے نماز، امر بمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ لیکن قرآن کی بعض دوسری آیات میں یہ تعبیر صبر کے مسئلہ کے بعد بیان ہوئی ہے جو پہلے احتمال کو تقویت پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد لقمان اپنے اور دوسرے لوگوں سے متعلق اخلاقی مسائل کو بیان کرتے ہیں اور سب سے پہلے تواضع، فروتنی اور خندہ پیشانی سے پیش آنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہتے ہیں " بے اعتنائی کے ساتھ لوگوں سے روگردانی نہ کرو" (ولا تصعر خدك للناس) " اور مغرورانہ انداز میں روئے زمین پر نہ چلو" (ولا تمش فی الارض مرحا) " کیونکہ خدا کسی متکبر اور مغرور کو دوست نہیں رکھتا " (ان اللہ لا یحب کل مختال فخور)۔

" تصعر " " صعر " کے مادہ سے ہے جو دراصل ایک قسم کی بیماری ہے جو اونٹ کو لاحق ہوتی ہے جس سے وہ اپنی گردن ٹیڑھی کرتا ہے۔

" مرح " (بروزن فرح) نعمت سے پیدا ہونے والے غرور اور مستی کے معنی میں ہے۔

" مختال " " خیال " اور " خیلاء " کے مادہ سے ہے۔ ایسے شخص کے معنی میں ہے جو دوسروں پر اپنی بڑائی جتائے۔

فخور، فخر کے مادہ سے اس معنی میں ہے کہ جو شخص دوسرے کے مقابل فخر کرتا ہے "اختیال" اور "فخر" میں فرق یہ ہے کہ پہلے کا تعلق ذہن میں پیدا ہونے والے متکبرانہ خیالات سے ہوتا ہے اور دوسرے کا تعلق تکبر آمیز اعمال سے ہے)۔

اور اس طرح سے لقمان حکیم یہاں دو بری اور ناپسندیدہ صفات کی طرف جو معاشرہ کے صمیمانہ روابط کے منقطع ہونے کا سبب ہیں اشارہ کرتے ہیں ایک تو تکبر اور بے اعتنائی اور دوسری غرور اور خود پسندی ہے۔ اور اس سلسلے میں دونوں مشترک ہیں جو انسان کو توہم خیال اور اپنے آپ کو برتر سمجھنے کی دنیا میں غلطاں کر دیتی ہیں اور دوسروں سے اس کے روابط کو منقطع کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

خصوصاً " صعر " کے اصلی اور لغوی مادہ کو مدنظر رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اس طرح کے ناپسندیدہ صفات ایک قسم کی نفسیاتی اور اخلاقی بیماری اور تشخیص و تفکر میں ایک قسم کی بے راہروی ہے۔ ورنہ روح اور نفس کے لحاظ سے ایک صحیح اور سالم انسان کبھی بھی اس قسم کے تصورات اور خیالات میں گرفتار نہیں ہوتا۔

کسے بغیر واضح ہے کہ " لقمان " کی مراد صرف لوگوں سے روگردانی کرنا یا مغرورانہ انداز میں مٹک مٹک کر چلنا ہی نہیں بلکہ تکبر اور غرور کے تمام مصادیق کے ساتھ نبرد آزمائی بھی ہے۔ لیکن چونکہ اس قسم کی صفات سب سے پہلے اپنے آپ کے عادی اور روزانہ کی حرکات کی نشان دہی کرتی ہیں لہٰذا ان مخصوص مظاہر کو ہی بیان فرمایا ہے۔

بعد والی آیت میں دو اور اخلاقی پروگرام بیان کئے ہیں جو مثبت پہلو کے حامل ہیں، گزشتہ پروگراموں کے مقابلہ میں جو منفی پہلو رکھتے ہیں فرماتا ہے: " بیٹا! چلنے پھرنے میں اعتدال کا راستہ اختیار کرو" (واقصد فی مشیك)۔

" اور بات کرنے میں بھی اعتدال کو مدنظر رکھو اور آواز دینے میں بھی آہستگی اختیار کرو، اور شور مچا کر بلند آواز سے نہ پکارو " (واغضض من صوتك)۔

" کیونکہ بدترین آواز گدھوں کی ہے" ——— (ان انکر

الاصوات لصوت الحمیر[1]۔[2]

درحقیقت ان دو آیات میں دو صفات سے نہی اور دو صفات کے بارے میں امر ہوا ہے۔

"نہی" "اپنے آپ کی برتری" اور "خود پسندی" سے کہ جن میں سے ایک تو اس بات کا سبب بنتی ہے کہ انسان خدا کی مخلوق کے ساتھ تکبر کرے اور دوسری سبب بنتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو حد کمال میں تصور کرے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے لیے تدریجی کمال اور ارتقاء کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنا دوسروں سے موازنہ نہ کرے۔

اگرچہ یہ دونوں صفات عام طور پر جڑواں ہوتی ہیں اور ان کی اصل (جڑ) مشترک ہے لیکن کبھی ایک دوسرے سے جدا بھی ہو جاتی ہیں۔

اور "امر" "عمل" اور "گفتگو" میں اعتدال کی رعایت کا، چونکہ چلنے پھرنے اور گفتگو کرنے میں اعتدال درحقیقت مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور جس شخص میں واقعاً یہ چار صفات پائی جاتی ہوں وہ موفق، خوش قسمت اور کامیاب انسان ہوتا ہے جو لوگوں میں محبوب اور بارگاہ خدا میں معزز ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ممکن ہے کہ ہماری زندگی کے ماحول میں گدھے کی آواز سے بھی زیادہ تکلیف دہ آوازیں ہوں (مثلاً جب دھاتوں کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور ان سے ایسی آواز نکلتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ اس کے بدن کا گوشت گر رہا ہے) لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ آوازیں نہ تو عمومی ہوتی ہیں اور نہ ہی ہر موقع و محل پر رونما ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں تکلیف دہ ہونے اور زیادہ قبیح ہونے میں بھی فرق ہے۔ اور سچ مچ عام آوازوں میں سے جنہیں انسان سنتا ہے سب سے زیادہ قبیح اور بری گدھے کی آواز ہی ہوتی ہے۔ اور مغرور اور بے وقوف لوگوں کے نعرے اور شور و غوغا اسی آواز سے مشابہت رکھتے ہیں۔

نہ صرف اونچا اور بے ہنگم ہونے کے لحاظ سے قبیح نہیں بلکہ کبھی بلاوجہ ہونے کے لحاظ سے بھی ہے۔ کیونکہ بعض مفسرین کے بقول دوسرے جانوروں کی آواز عام طور پر بوقت ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ جانور کبھی بلاوجہ، بغیر کسی قسم کی ضرورت اور بغیر کسی تمہید و مقدمہ کے وقت، بے وقت ہینگنا شروع کر دیتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ذکر ہوا ہے کہ جب گدھے کی آواز بلند ہوتی ہے اس وقت وہ شیطان کو دیکھتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ہر جانور کی آواز تسبیح ہوتی ہے سوائے گدھے کی آواز کے۔

بہرحال ان تمام باتوں سے ہٹ کر جو بات مسلّم ہے وہ یہ کہ تمام آوازوں میں اس کی آواز ہی قبیح ہے، اور یہ بات کسی بحث و گفتگو کی محتاج نہیں۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہوا ہے کہ یہ آیت بلند آواز کے ساتھ چیخنے یا بولتے وقت شور مچانے سے تفسیر ہوئی ہے تو درحقیقت اس کے روشن مصداق کا بیان ہے۔[3]

---

[1] "حمیر" "حمار" کی جمع ہے جس کا معنی ہے گدھا۔ [2] "انکر" افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ اگرچہ یہ صیغہ عام طور پر مفعول کے معنی میں نہیں آتا لیکن عیوب کے باب میں یہ صیغہ شاذ و نادر آ ہی جاتا ہے۔ ("انکر" "منکر" کا افعل التفضیل ہے)۔

[3] "مجمع البیان" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

چند اہم نکات

۱۔ **چلنے پھرنے کے آداب:** یہ ٹھیک ہے کہ چلنا پھرنا ایک عام اور سادہ سا مسئلہ ہے لیکن یہی سادہ مسئلہ انسان کے اندرونی حالات اور اخلاق و اطوار اور بسا اوقات اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے کیونکہ پہلے بھی ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کے عادات و اطوار اس کے اعمال کے اندر منعکس ہوتے ہیں اور کبھی ایک چھوٹا سا معمولی عمل بھی اس کی گہری عادات کی غمازی کرتا ہے۔

اور چونکہ اسلام زندگی کی تمام جہات کو توجہ کا مرکز قرار دیتا ہے لہٰذا اس سلسلہ میں اس نے کسی بھی چیز کو فروگزاشت نہیں کیا۔

ایک حدیث میں رسول خدا سے مروی ہے:

"من مشی علی الارض اختیالا لعنته الارض ومن تحتها، و من فوقها!"

جو شخص غرور و تکبر کے ساتھ زمین پر چلتا ہے تو زمین اور زمین کے اندر کی اور اس کے اوپر کی چیزیں سب اس پر لعنت کرتی ہیں۔[1]

پھر ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے:

نهی ان یختال الرجل فی مشیه و قال من لبس ثوبا فاختال فیه خسف الله به من شفیر جهنم و کان قرین قارون لانه اول من اختال۔

پیغمبرؐ نے مغرورانہ اور متکبرانہ انداز میں چلنے سے روکا ہے اور فرمایا جو شخص لباس پہنے اور اس کے ساتھ تکبر دکھائے تو خداوند عالم اسے جہنم کے کنارے سے زمین کی تہہ میں بھیجے گا اور وہ قارون کا مقرب اور ساتھی ہوگا۔ کیونکہ قارون پہلا شخص تھا جس نے کبر و غرور کی بنیاد رکھی۔[2]

نیز امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

خدا نے ایمان کو انسان کے اعضاء و جوارح پر واجب کیا اور ان کے درمیان اسے تقسیم کیا، منجملہ ان کے انسان کے پاؤں پر واجب کیا ہے کہ گناہ اور معصیت کی طرف نہ جائیں بلکہ رضائے خدا کی راہ میں اٹھیں، اسی لیے قرآن فرماتا ہے "زمین میں تکبر سے نہ چلو" نیز فرمایا ہے "چلنے میں اعتدال کی راہ کو پیش نظر رکھو"۔[3]

ایک دوسری روایت میں یہ ماجرا پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ ایک کوچہ سے گزر فرما رہے تھے لوگوں کو دیکھا کہ ایک دیوانے کے گرد جمع ہیں اور اس کی طرف دیکھ رہے ہیں فرمایا:

علی ما اجتمع هؤلاء "یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟"

---

[1] ثواب الاعمال اور امالی صدوق (بحوالہ نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۰۰) [2] ثواب الاعمال و امالی صدوق (بحوالہ تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۴۰۰) [3] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۲۸ (باب الایمان مبثوث لجوارح البدن کلها)۔

عرض کیا گیا کہ علی المجنون یصرع "ایک دیوانے کے لیے جو اعصابی حملہ کا شکار ہے!"

پیغمبرؐ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا:

ماھذا بمجنون الا اخبرکم بمجنون حق المجنون یہ تو دیوانہ نہیں ہے! تم چاہتے ہو کہ واقعی مجنوں کا تم سے تعارف کراؤں؟

انہوں نے عرض کیا جی ہاں یارسول اللہ!! تو آپ نے فرمایا:

ان المجنون: المتبختر فی مشیہ، الناظر فی عطفیہ، المحرک جنبیہ بمنکبیہ فذالک المجنون وھذا المبتلی حقیقی مجنون تو وہ ہے جو غرور سے شانے جھٹک کر چلتا ہے، ہمیشہ اپنے پہلوؤں کی طرف دیکھتا ہے، اپنے بازوؤں کو اپنے کندھوں کے ساتھ ہلاتا ہے، اور کبر و غرور اس کے سارے وجود سے ٹپکتا ہے، ایسا شخص واقعی دیوانہ ہے۔ جسے تم دیکھ رہے ہو، یہ تو بیمار ہے۔[1]

۲۔ گفتگو کے آداب: لقمان کے پند و نصائح میں بات کرنے کے آداب کے ضمن میں اشارہ کیا گیا تھا، اور اسلام میں اس مسئلہ کے لیے ایک وسیع باب کھولا گیا ہے۔ منجملہ اس کے یہ ہے کہ جب تک بات کرنا ضروری نہ ہو تو سکوت بہتر ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

السکوت راحۃ للعقل "سکوت، فکر کے آرام و راحت کا باعث ہے۔"[2]

ایک اور حدیث میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے مروی ہے کہ:

من علامات الفقہ العلم والحلم والصمت، ان الصمت باب من ابواب الحکمۃ۔

"عقل و فہم کی نشانیوں میں سے آگاہی، بردباری اور خاموشی ہے۔ سکوت اور خاموشی حکمت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔"[3]

لیکن دوسری روایات میں یہ بات بھی زور دے کر کہی گئی ہے کہ:

"جن موقعوں پر گفتگو کرنا ضروری ہے مؤمن کو کبھی بھی خاموشی اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔"

"پیغمبروں کو بات کرنے کی دعوت دی گئی ہے نا کہ سکوت کی۔"

"جنت میں پہنچنے اور دوزخ سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ برمحل بات کرنا ہے۔"[4]

۳۔ معاشرتی آداب: پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام کے ذریعہ اسلامی روایات میں جس قدر تواضع، حسن خلق اور بوقت ملاقات نرمی کا مظاہرہ اور رہن سہن میں سختی نہ برتنے کے مسئلے کو اہمیت دی گئی ہے

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۰، صفحہ ۵۰۔ [2] و [3] وسائل الشیعہ جلد ۸ صفحہ ۵۳۲۔ [3] و [4] وسائل الشیعہ جلد ۸ صفحہ ۵۳۲۔

اتنی بہت کم چیزوں کو اہمیت دی گئی ہے۔

بہترین اور ناطق دلیل اس سلسلے میں خود اسلامی روایات ہیں جن کا ایک نمونہ ہم یہاں پر نظر نواز کرتے ہیں:

ایک شخص پیغمبر اکرم (ص) کی خدمت میں آیا اور عرض کیا یارسول اللہ اوصنی فکان فیما اوصاہ ان قال الق اخاک بوجہ منبسط۔ "مجھے نصیحت کیجئے! تو آپ نے فرمایا اپنے مسلمان بھائی سے کشادہ روئی کے ساتھ ملاقات کرو"[1]

ایک دوسری حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے:

ما یوضع فی میزان امرء یوم القیامۃ افضل من حسن الخلق۔ قیامت کے دن کوئی چیز کسی کے ترازوئے عمل میں حسن خلق سے برتر و بالاتر نہیں رکھی جائے گی[2]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مذکور ہے:

البر وحسن الخلق یعمران الدیار ویزیدان فی الاعمار۔ نیکوکاری اور حسن خلق گھروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتے ہیں[3]

نیز رسول خدا سے منقول ہے:

اکثر ما تلج بہ امتی الجنۃ تقوی اللہ وحسن الخلق۔ جو چیز میری امت کے زیادہ سے زیادہ بہشت میں داخل ہونے کا سبب بنے گی وہ خدا کا تقوی اور حسن خلق ہے[4]

تواضع اور فروتنی کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

زینۃ الشریف التواضع۔ شرافت مآب انسانوں کی زینت فروتنی اور تواضع ہے[5]

آخر میں ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام بیان فرماتے ہیں:

التواضع اصل کل خیر نفیس۔ ومن رتبۃ رفیعۃ، ولو کان للتواضع لغۃ یعبر بہا الخلق لنطق عن حقائق ما فی مخفیات العواقب۔ ومن تواضع للہ شرفہ اللہ فی کثیر من عبادہ۔۔۔ ولیس للہ عز وجل عبادۃ یقبلہا ویرضاہا الا وبابہا التواضع۔

فروتنی اور تواضع ہر خیر و سعادت کی جڑ ہے، تواضع ایک بلند مقام و مرتبہ ہے اور اگر تواضع کی کوئی زبان ہوتی کہ جسے لوگ سمجھتے تو بہت سے اسرار نہانی اور کاموں کی عاقبت کو بیان کرتی۔۔۔۔

جو شخص خدا کے لیے فروتنی کرے خدا اس کو اپنے بہت سے بندوں پر برتری بخشے گا۔۔۔

کوئی ایسی عبادت نہیں جو مقبول بارگاہ خدا اور اس کی رضا کا موجب ہو مگر یہ کہ وہ فروتنی کی راہ ہی سے داخل ہوتی ہے[6]

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۳ ص ۱۷۱۔ [2] و [3] اصول کافی جلد ۲ باب حسن الخلق ۱۸ و ۲۰۔ [4] بحار الانوار جلد ۷۵، صفحہ ۱۲۰۔ [5] بحار الانوار جلد ۷۵، صفحہ ۱۲۰۔

۲۰۔ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ○

۲۱۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ○

۲۲۔ وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○

۲۳۔ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

۲۴۔ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ○

ترجمہ

۲۰۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے ان چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور اپنی نعمتوں کو جو ہے وہ ظاہری ہوں یا باطنی تم پر بچھا دیا ہے اور زیادہ کر دیا ہے، لیکن بعض لوگ بغیر کسی علم و دانش اور ہدایت اور واضح کتاب کے خدا کے بارے میں لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔

۲۱۔ جس وقت ان سے کہا جائے جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں نہیں! ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے کہ جس پر اپنے آباء (و اجداد) کو پایا ہے، کیا اگر شیطان انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف بھی دعوت دے (پھر بھی پیروی کریں گے؟)۔

۲۲۔ جو شخص اپنی روح کو خدا کے سپرد کردے جبکہ وہ نیکو کار ہو اس نے محکم دستہ (اور وسیلہ) کو پکڑا ہے (اور قابل اطمینان سہارے کا سہارا لیا ہے) اور تمام کاموں کی عاقبت خدا کی طرف ہے۔

۲۳۔ اور جو شخص کافر ہو جائے تو اس کا کفر تجھے غمگین نہ کردے، ان سب کی بازگشت ہماری طرف ہے۔ اور ہم انہیں ان اعمال سے جو انہوں نے انجام دیئے ہیں (اور ان کے برے نتائج سے) آگاہ کریں گے۔

۲۴۔ ہم تھوڑے سے دنیاوی فائدے کو ان کے اختیار میں دے دیں گے پھر انہیں عذاب شدید کے برداشت کرنے پر مجبور کریں گے۔

تفسیر

قابلِ اطمینان سہارا:

حضرت لقمان کے مبدأ و معاد اور راہ و رسم زندگی اور اجتماعی و اخلاقی پروگراموں کے سلسلہ میں دس نکاتی پند و نصائح کے اختتام پر قرآن ان کی تکمیل کے لیے خدائی نعمتوں کے بیان کی طرف جاتا ہے، تاکہ لوگوں کے احساس شکر گزاری کو اجاگر کرے وہ شکر جو "معرفۃ اللہ" کا منبع اور اس کے فرمان کی اطاعت کا سبب ہے[1]

روئے سخن تمام انسانوں کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین میں موجود چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کردیا تاکہ وہ تمہارے مفادات کے لیے سرگرم عمل رہیں" (الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض)۔

انسان کے لیے آسمانی اور زمینی موجودات کی تسخیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو اُن امور کو بھی شامل ہے جو اس کے قبضہ و اختیار میں ہیں، اور وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے انہیں اپنے مفادات کی راہ میں استعمال کرتا ہے، جیسے زمین کے بہت سے موجودات۔ یا وہ امور جو انسان کے اختیار میں نہیں ہیں لیکن خدا نے انہیں مامور کیا ہے کہ وہ انسان کی خدمت کریں، جیسے سورج اور چاند وغیرہ۔ اس بناء پر تمام موجودات انسانوں کی منفعت کی راہ میں فرمان خدا کے مطابق مسخر ہیں، چاہے وہ حکم انسان کے مسخر ہوں

---

[1] بعض مفسرین مثلاً "آلوسی" "روح المعانی" اور فخر رازی "تفسیر کبیر" میں زیر بحث آیات کو لقمان کی وصیتوں سے پہلے ذکر شدہ آیات سے مربوط جانتے ہیں جن میں مشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ خدا کی مخلوق ہے تم نشاندہی کرو کہ تمہوں نے کیا کچھ بنایا ہے" اور زیر بحث آیات میں کہتا ہے "کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے لیکن اس آیت کا ذیل اور اس کے بعد والی آیات اور روایات جو اس کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں، وہ آیت کے مفہوم کی عمومیت کے ساتھ زیادہ سازگار ہیں۔

یا نہ ہوں۔ اور اس طرح سے "لکم" میں "لام" اصطلاح کے مطابق "لام منفعت" ہے۔ [1]

آگے چل کر مزید کہتا ہے: خدا نے اپنی نعمتوں کو خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، وسیع اور زیادہ کیا ہے "واسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃ وباطنۃ"۔

"اسبغ" مادہ "سبغ" (بروزن صبر) اصل میں کھلی اور کشادہ پیراہن یا زرہ اور وسیع و کامل کے معنی میں ہے اور پھر وسیع و فراوان نعمت پر بھی بولا جانے لگا ہے۔

یہ کہ یہاں "ظاہری" و "باطنی" نعمتوں سے مراد اس آیت میں کیا ہے؟ اس پر مفسرین نے بہت کچھ گفتگو کی ہے۔ بعض "ظاہری نعمت" اس چیز کو سمجھتے ہیں جو کسی بھی شخص کے لیے قابل انکار نہیں ہے۔ جیسے خلق، حیات اور انواع و اقسام کے رزق وغیرہ اور "باطنی" نعمتیں ان امور کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو غور و فکر اور سوچ بچار اور مطالعہ کے بغیر قابل ادراک نہیں ہیں۔ (جیسے بہت سی روحانی طاقتیں اور تعمیری غریزے۔

بعض نے نعمت "ظاہر" اعضاء ظاہر کو اور نعمت "باطن" دل کو شمار کیا ہے۔

بعض دوسروں نے "نعمت ظاہر" چہرہ کی زیبائی اور خوبصورتی، قد و قامت کی راستی اور اعضاء کی سلامتی اور نعمت "باطن" "معرفۃ اللہ" کو تسلیم کیا ہے۔

ہم پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں، جبکہ ابن عباس نے آنحضرتؐ سے اس سلسلے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا:

> اے ابن عباس! نعمت ظاہر، اسلام اور پروردگار کی طرف سے کامل اور منظم خلقت اور وہ رزق و روزی ہے، جو اس نے تم پر ارزانی کی ہیں۔ اور نعمت باطن تمہارے بُرے اعمال پر پردہ پوشی اور لوگوں کے سامنے تمہیں رسوا نہ کرنا ہے۔ [2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

> نعمت ظاہر پیغمبرؐ، معرفۃ اللہ اور توحید ہے، جسے پیغمبرؐ لائے ہیں۔ اور نعمت باطن وہ پوشیدہ ہم اہل بیت کی ولایت اور ہماری دوستی کا عہد و پیمان ہے۔ [3]

حقیقت یہ ہے کہ ان تفاسیر کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ آیت کے مفہوم کو محدود کیے بغیر ان میں سے ہر ایک ظاہری اور باطنی نعمت کے ہر مصداق کو بیان کرتی ہے۔

اور آیت کے آخر میں قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، جو خدا کی ان عظیم نعمتوں کا انکار کرتے ہیں جو انسان کا اندر اور باہر سے احاطہ کیے ہوئے ہیں اور حق کے ساتھ لڑنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ فرماتا ہے "بعض ایسے لوگ

---

[1] انسان کے لیے تسخیر موجودات کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۰ سورۂ رعد کی آیت ۲ کے ذیل میں بھی ہم نے بحث کی ہے۔

[2] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ہیں جو خدا کے بارے میں بغیر علم و دانش اور ہدایت و واضح کتاب کے، مجادلہ کرتے ہیں": (ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر)۔

اور بجائے اس کے کہ ان تمام ظاہری اور باطنی نعمتیں بخشنے والے کو پہچانے، جہالت و سرکشی کی بناء پر شرک اور کفر کا رُخ کرتے ہیں۔

"علم" و "ھدایت" اور "کتاب منیر" کے درمیان کیا فرق ہے؟ شاید بہترین بیان یہ ہو کہ علم ایسے ادراکات کی طرف اشارہ ہے، جنہیں انسان اپنی عقل و خرد کے ذریعہ سے درک کرتا ہے اور "ھدی" ایسے خدائی اور آسمانی معلمین و رہبران اور علماء کی طرف اشارہ ہے جو اس کی راہ میں انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ اور "کتاب منیر" سے وہ آسمانی کتابیں مراد ہیں جو وحی کے ذریعہ انسان کے دل و جان کو منور کرتی ہیں۔

حقیقت میں یہ ضدی اور ہٹ دھرم گروہ نہ خود علم و دانش رکھتا ہے، نہ کسی راہبر و رہنما کا اتباع کرتا ہے اور نہ ہی وحی الٰہی سے مدد لیتا ہے، چونکہ راہ ہدایت ان تینوں چیزوں میں منحصر ہے، لہٰذا ان کے ترک کرنے سے انسان گمراہی اور شیاطین کی وادی میں کھینچ کر چلا جاتا ہے۔

بعد والی آیت میں اس گمراہ گروہ کی بودی اور کمزور منطق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اور جس وقت اُن سے کہا جائے جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں، نہیں ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے: (واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ اٰباءنا)۔

اور چونکہ ان کے جاہل و منحرف بزرگوں کی پیروی اور پروائے ہدایت آفریں تین طریقوں میں سے کسی کی بھی حیثیت نہیں، لہٰذا قرآن اسے راہ شیطان کے عنوان سے ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے "کیا حتی اگر شیطان انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کی طرف دعوت دے تو پھر بھی انہیں اس کا اتباع کرنا چاہیئے؟ (اولو کان الشیطان یدعوھم الی عذاب السعیر)[1]

حقیقت میں قرآن نے یہاں بڑوں کی سُنّت اور اُن کے طور و اطوار کی پیروی کے نقاب کو اُلٹ دیا ہے۔ جو ظاہر بظاہر فریب پر مبنی ہے اور ان کے عمل کے واقعی چہرہ کو نمایاں کر دیا، یعنی وہی جہنم کی راہ اختیار کرنے میں ہی شیطان کی پیروی ہے۔

جی ہاں! شیطان کی راہبری ہی اس بات کے لیے تنہا کافی ہے کہ انسان اس کی مخالفت کرے، اگرچہ وہ حق کی طرف دعوت کے پردوں میں کیوں نہ لپٹی ہوئی ہو۔ کیونکہ وہ یقیناً ایک گمراہ کُن نقاب ہے جس کے اندر سے جہنم کی آگ کے لیے دعوت دی جا رہی ہے اور جہنم کی آگ کی طرف دعوت دینا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے۔ اگرچہ دعوت دینے والا محبوب الحال ہو۔ لیکن اگر دعوت دینے والا شیطان ہو اور اس کی دعوت بھی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف ہو تو بات صاف ظاہر ہے۔ کیا کوئی عقلمند انسان اللہ کے پیغمبروں کی بہشت کی طرف دعوت کو چھوڑ کر شیطانی دعوت کے پیچھے جہنم کی طرف جا سکتا ہے؟

---

[1] مفسرین عام طور پر "لو" کو یہاں "لو شرطیہ" کے معنی لیتے ہیں، جس کی جزاء محذوف ہے اور جملہ کی تقدیر یوں ہے: (لو کان الشیطان یدعوھم الی عذاب السعیر اینبعونہ)۔

اس کے بعد دو گروہوں یعنی خالص مومن اور گناہوں سے آلودہ کفار کے حالات کو بیان کر کے اُن کا آپس میں تقابل کرتا ہے اور اس بارے میں بھی تقابل کرتا ہے کہ جو لوگ شیطان کے پیرو کار اور اپنے بزرگوں کی اندھی تقلید کرتے ہیں، محل توجہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے: "جس شخص نے اپنے دل و جان کو خدا کے سپرد کر دیا اور پروردگار عالم کے آستان پر سر تسلیم خم کر دیا۔ جبکہ وہ محسن اور نیکوکار بھی ہے تو اس نے محکم دستے کو پکڑ لیا ہے" (ومن یسلم وجهه الی الله وهو محسن فقد استمسك بالعروة الوثقی)۔

"خدا کے لیے اپنے چہرے کو تسلیم اور خم کرنے" سے مراد حقیقت میں پروردگار کی ذات پاک کی طرف اپنے تمام وجود کے ساتھ مکمل توجہ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ "وجهه" (جس کا معنی چہرہ ہے) چونکہ بدن کا شریف ترین عضو اور حواس انسانی کا اہم ترین مرکز ہے۔ لہٰذا انسان کی ذات سے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

"هو محسن" کی تعبیر ایمان کے بعد عمل صالح کے ذکر کی قسم سے ہے۔

محکم عروہ اور دستہ کو پکڑنا اس حقیقت کے متعلق ایسی لطیف تشبیہ ہے کہ انسان مادیت کے گہرے کھڈے سے نکلنے اور معرفت، معنویت اور روحانیت کی بلند ترین چوٹی تک پہنچنے کے لیے ایک محکم اور قابل اطمینان وسیلہ کا محتاج ہے اور یہ وسیلہ ایمان اور عمل صالح کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی، ان کے علاوہ باقی سب کچھ فرسودہ، پارہ پارہ ہونے والا، سقوط اور موت کا سبب ہیں۔ علاوہ ازیں صرف وسیلہ ہی کو بقا حاصل ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ فانی اور نابود ہونے والا ہے۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: تمام کاموں کی عاقبت خدا کی طرف ہے: (والی الله عاقبة الامور)۔

اس حدیث میں جو تفسیر برہان میں اہل سنت کے طریقوں سے امام علی بن موسیٰ رضاؑ کے ذریعہ پیغمبر اسلام سے نقل ہوئی ہے، اس طرح آیا ہے:

"سیکون بعدی فتنة مظلمة، النجا منها من تمسك بالعروة الوثقی، فقیل یارسول الله وما العروة الوثقی؟ قال ولایة سید الوصیین، قیل یا رسول الله ومن سید الوصیین؟ قال امیر المؤمنین، قیل یارسول الله ومن امیر المؤمنین؟ قال مولی المسلمین وامامهم بعدی، قیل یارسول الله ومن مولی المسلمین وامامهم بعدك؟ قال اخی علی بن ابی طالب" (ع)

"میرے بعد تاریک اور ظلمانی فتنہ رونما ہوگا، صرف وہ لوگ اس سے نجات حاصل کریں گے۔ جو عروۃ الوثقیٰ اور مضبوط دستہ کو پکڑ لیں گے۔ عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! عروۃ الوثقیٰ کیا ہے؟ فرمایا سید اوصیاء کی ولایت! لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! سید اوصیاء کون ہے؟ فرمایا امیر المومنین! عرض کیا امیر المومنین کون ہے؟ فرمایا مسلمانوں کا مولیٰ اور میرے بعد ان کا امام و پیشوا! پھر انھوں نے اس بنا پر کہ زیادہ صریح جواب حاصل کریں، عرض کیا وہ کون ہے؟ فرمایا میرا بھائی علی بن ابی طالب (ع)۔[1]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۲۰۹، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اور روایات بھی اس سلسلے میں کہ "عروۃ الوثقیٰ" سے مراد اہل بیتؑ یا آل محمدؐ یا اولاد حسینؑ میں سے آئمہ کی محبت ہے، نقل ہوئی ہیں۔ [1]

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی تفسیریں اپنے واضح مصداق کا بیان ہوتی ہیں اور توحید و تقویٰ وغیرہ جیسے دوسرے مصادیق کی منافی نہیں ہیں۔

اس کے بعد دوسرے گروہ کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "جو شخص کافر ہو جائے اور ان واضح حقائق کا انکار کرے، اس کا کفر آپ کو غمگین نہ کردے: (ومن کفر فلا یحزنک کفرہ)۔

کیونکہ آپ نے اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح انجام دے دیا ہے۔ اب وہ ہے کہ جو اپنے اوپر ظلم و ستم کرتا ہے۔

اس قسم کی تعبیریں جو قرآن مجید میں بارہا آئی ہیں نشان دہی کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ جو مشاہدہ کرتے تھے کہ ایک جاہل، ضدی، ہٹ دھرم اور اکھڑ مزاج گروہ ان واضح و روشن دلائل اور نشانیوں کے باوجود خدا کی راہ کو ترک کر کے بے راہ روی اختیار کرتا ہے تو پیغمبر اسلامؐ کو اس سے سخت رنج پہنچتا۔ اور وہ اس قدر غمگین ہوتے کہ بارہا خدا ان کی دل داری کرتا اور تسلی دیتا ہے، اور دل سوز رہبر کی یہی راہ و رسم تو ہوتی ہے۔

نیز (اے پیغمبر!) آپ اس سے بھی پریشان نہ ہوں کہ اگر ایک گروہ دنیا میں باوجود یکہ کفر اختیار کرتا اور ظلم ڈھاتا ہے پھر بھی خدائی نعمتوں سے بہرہ ور ہے اور سزا اور عذاب میں مبتلا نہیں، کیونکہ ابھی دیر نہیں ہوئی۔

"ان سب کی بازگشت ہماری طرف ہے اور ہم انھیں ان کے اعمال اور ان کے تلخ اور منحوس نتائج سے آگاہ کریں گے": (الینا مرجعھم فننبئھم بما عملوا)۔

ہم نہ صرف ان کے اعمال سے آگاہ ہیں بلکہ ان کی نیتوں اور دل کے اندرونی اسرار سے بھی باخبر ہیں۔ "کیونکہ خدا اس سے جو سینوں کے اندر ہے آگاہ ہے: (ان اللہ علیم بذات الصدور)۔

یہ تعبیر کہ خدا لوگوں کو قیامت میں ان کے اعمال سے باخبر کرے گا یا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے اس سے باخبر کرے گا، قرآن مجید کی بہت سی آیات میں نازل ہوا ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "ننبئکم" "نبأ" کے مادے سے ہے۔ مفردات راغب کی تصریحات کے مطابق "نبأ" اس خبر کو کہتے ہیں جو اہم مضمون اور فائدہ کی حامل ہو اور صریح و آشکار ہو اور ہر قسم کے جھوٹ سے خالی ہو۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تعبیرات اس طرف اشارہ ہیں کہ خداوند عالم قیامت میں انسانوں کے اعمال کو اس طرح فاش کرے گا کہ کسی کے لیے بھی کسی قسم کے اعتراض و انکار کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ لوگ جو کچھ اس دنیا میں انجام دیتے ہیں اور عام طور پر اسے فراموش کر دیتے ہیں، سب کو بعینہٖ اہو بہو ظاہر کرے گا اور حساب و جزا کے لیے حاضر کرے گا۔

یہاں تک کہ جو کچھ انسان کے دل میں گزرتا ہے اور خدا کے علاوہ کوئی شخص بھی اس سے آگاہ نہیں ہوتا وہ سب کچھ ان کے

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر برہان صفحہ ۲۰۸ اور ۲۰۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

گوش گزار کرے گا۔

پھر مزید کہتا ہے کہ ان کا دنیاوی زندگی سے بہرہ ور ہونا آپ کو تعجب اور حیرت میں نہ ڈال دے "ہم تھوڑی سی متاع دنیا ان کے اختیار میں دے دیتے ہیں۔ اور متاع دنیا جتنا بھی زیادہ ہو، پھر بھی کم اور ناچیز ہے۔ پھر انہیں جبری طور پر عذاب شدید کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے، مسلسل اور دردناک عذاب کی طرف" (نمتعھم قلیلا ثم نضطرھم الی عذاب غلیظ)۔

ہوسکتا ہے کہ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ وہ یہ تصور نہ کریں کہ وہ اس جہان میں خدا کے قبضۂ قدرت سے خارج ہیں۔ بلکہ وہ خود چاہتا ہے کہ انہیں آزمائش، اتمام حجت اور دوسرے مقاصد کے لیے آزاد رکھے اور ان کی یہ متاع قلیل بھی اس کی طرف سے ہے۔ اس گروہ کی حالت جو ذلت و خواری اور جبر و اکراہ کے ساتھ خدا کے شدید اور سخت عذاب کی طرف کھینچا جائے گا، ان لوگوں کی حالت سے کتنی مختلف ہے، جن کا سارا وجود خدا کے اختیار میں ہے اور انہوں نے عروۃ الوثقیٰ کو پکڑ رکھا ہے اور دنیا میں پاک پاکیزہ اور نیکی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور آخرت میں رحمت خدا کے جوار میں نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

۲۵۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

۲۶۔ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝

۲۷۔ وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

۲۸۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۚ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۝

۲۹۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

۳۰۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝

ترجمہ

۲۵۔ اگر تم ان سے سوال کرو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے؟ تو یقیناً

وہ کہیں گے اللہ نے ۔ کہہ دو ۔ الحمد للہ ! (کہ تم خود معترف ہوئے) لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ۔

۲۶۔ اللہ کے لیے وہ کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے ، کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق حمد و ستائش ہے ۔

۲۷۔ جو کچھ روئے زمین پر درخت ہیں ، اگر وہ قلم بن جائیں اور سمندر ان کے لیے سیاہی بن جائے ۔ اور سات دیگر سمندروں کا اضافہ کیا جائے ۔ یہ سارے ختم ہو جائیں گے لیکن خدا کی باتیں ختم نہیں ہوں گی ۔ خدا عزیز و حکیم ہے ۔

۲۸۔ تم سب کی دوبارہ خلقت و زندگی ایک فرد کی زندگی سے زیادہ نہیں ہے ، خدا سننے اور دیکھنے والا ہے ۔

۲۹۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے ، اور اس نے سورج اور چاند کو تمھارے لیے مسخر کیا ہے اور ہر ایک معین اور مقررہ (وقت تک اپنی) حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہے ، جسے تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے ۔

۳۰۔ یہ سب کچھ اس امر کی دلیل ہے کہ خدا حق ہے ، اور اس کے علاوہ جس کو وہ پکارتے ہیں باطل ہے اور خدا بلند مقام اور عظیم مرتبے والا ہے ۔

تفسیر

پروردگار کی دس صفات:

اوپر والی چھ آیات میں خدا کی صفات کا ایک مجموعہ بیان ہوا ہے جو حقیقت میں دس اچھے صفات یا اسماء حسنیٰ میں سے دس اسماء کو بیان کرتا ہے، غنی، حمید، عزیز، حکیم، سمیع، بصیر، خبیر، حق، علی اور کبیر۔

یہ تو ہوا ایک لحاظ سے، بار دوسرا پہلو تو پہلی آیت میں خدا کی "خالقیت" کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے اور دوسری آیت میں اس کی "مالکیت عامہ" سے، تیسری آیت میں اس کے بے انتہا "علم" سے اور چوتھی و پانچویں آیت میں اس کی غیر متناہی قدرت سے اور آخری آیت میں نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ جو ذات ان صفات کی حامل ہے، وہ "حق" ہے اور جو اس کے علاوہ ہے، وہ باطل ناچیز اور حقیر ہے۔

اس اجمالی بحث کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم آیت کی تشریح کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے۔ "اگر ان سے سوال کرو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے تو یقیناً وہ جواب دیں گے کہ "اللہ" نے: (ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض ليقولن الله)۔

یہ تعبیر جو دوسری قرآنی آیات میں بھی نظر آتی ہے (جیسے سورۂ عنکبوت آیت ۶۱ تا ۶۳۔ سورۂ زمر آیہ ۳۸۔ سورۂ زخرف آیت ۹) جہاں ایک طرف اس امر کی دلیل ہے کہ مشرک لوگ خالق کی توحید کے ہرگز منکر نہیں تھے۔ اور بتوں کی خالقیت کے قائل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ صرف عبادت میں شرک اور بتوں کی شفاعت کا عقیدہ رکھتے تھے۔

وہاں دوسری طرف توحید کے فطری ہونے اور تمام انسانوں کی فطرت میں نور الٰہی کی تجلی کی دلیل بھی ہے۔

اس کے بعد کہتا ہے۔ اب جبکہ وہ خالق کی توحید کے معترف ہیں" تو کہہ دے کہ حمد و ستائش اللہ کے ساتھ مخصوص ہے، جو ہر چیز کا خالق ہے نہ کہ بتوں کے ساتھ جو خود مخلوق ہیں، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے اور وہ نہیں سمجھتے کہ عبادت کو خالق عالم کے لیے مخصر ہونا چاہیئے: (قل الحمد لله بل اكثرهم لا يعلمون)۔

اس کے بعد حق تعالیٰ کی "مالکیت" کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ فرماتا ہے" خدا کے لیے ہے تمام وہ کچھ جو آسمانوں اور زمین میں ہے:" (لله ما في السماوات والارض)۔

واضح رہے کہ وہ ذات جو" خالق" اور" مالک" ہے، وہی امور جہاں کی مدبر بھی ہے اور اس طرح سے توحید اپنی تینوں قسموں (توحید خالقیت، توحید مالکیت اور توحید ربوبیت) سمیت ثابت ہو جائے گی۔

اور جو ذات ان صفات کی حامل ہے، وہ ہر چیز سے بے نیاز اور ہر قسم کی ستائش کے لائق ہو گی اسی بنا پر آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے۔" خدا غنی و حمید ہے:" (ان الله هو الغني الحميد)۔

وہ غنی مطلق اور ہر لحاظ سے حمید ہے۔ کیونکہ جو نعمت و عطا و بخشش جہان میں ہے، اسی کی طرف لوٹتی ہے اور ہر شخص جو کچھ رکھتا ہے اس کی طرف سے ہے اور تمام اچھائیوں کے خزانے اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اور یہی اس کے غنا اور تونگری کی زندہ دلیل ہے۔

اور چونکہ "حمد" کا معنی کسی اچھے کام کی تعریف و ستائش ہے۔ جو ارادہ و اختیار کے ساتھ کسی سے انجام پاتا ہے اور اس عالم میں جو اچھائی اور نیکی ہمیں نظر آتی ہے وہ چونکہ پروردگار عالم کی طرف سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی تعریف اور ستائش بھی اسی کے لیے ہی ہوگی۔ یہاں تک کہ اگر ہم پھول کی زیبائی اور خوبصورتی کی تعریف کرتے ہیں یا ملکوتی عشق کی کشش کی توصیف کرتے ہیں یا کسی ایثار و قربانی کرنے والے شخص کے کام کن عظمت کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو درحقیقت اسی کی ہی ستائش و تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ زیبائی ہو یا وہ قوت جاذبہ اور عظمت سب کچھ اُسی کی طرف سے ہے۔ پس وہی "حمید علی الاطلاق" ہے۔

بعد والی آیت خدا کے غیر متناہی اور بے پایاں علم کی تصویر کشی کرتی ہے۔ جو ایک بہت ہی واضح اور روشن مثال کے ساتھ مجسم ہوتی ہے۔ لیکن پہلے اس نکتے کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیسے علی بن ابراہیم کی تفسیر کے مطابق "یہودیوں کے ایک گروہ نے جس وقت مسئلہ روح کے بارے میں پیغمبرؐ سے سوال کیا اور قرآن نے ان کے جواب میں کہا (قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا) "روح میرے پروردگار کا امر اور حکم ہے اور علم سے تمہارا حصہ بہت ہی تھوڑا ہے" تو یہ گفتگو ان پر گراں گزری اور پیغمبر سے پوچھا کہ یہ حکم صرف ہمارے بارے میں ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ سب کو شامل ہے (یہاں تک کہ ہمیں بھی)۔

لیکن انھوں نے مزید کہا: اے محمدؐ! آپ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ بھی علم کا تھوڑا سا حصہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو قرآن عطا ہوا ہے اور ہمیں بھی تورات دی گئی ہے۔ آپ کے قرآن میں آیا ہے "جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی ہے"۔ یہ باتیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتیں تو اس مقام پر ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام (زیر بحث) آیت نازل ہوئی اور واضح کیا کہ انسان کا علم جتنا بھی وسیع ہو، خدا کے علم کے مقابلہ میں ایک بے مقدار ذرہ سے زیادہ نہیں جو کچھ تمہارے نزدیک بہت زیادہ ہے، وہ خدا کے ہاں بہت ہی کم ہے۔[1]

اس طرح کی ایک اور روایت ایک دوسرے طریق سے ہم نے سورۂ کہف کی آیت ۱۰۹ کے ذیل میں بیان کی ہے۔

بہر حال قرآن مجید خدا کے غیر متناہی علم کی تصویر کشی کرتے ہوئے، اس طرح کہتا ہے: "جتنے کچھ روئے زمین پر درخت ہیں، قلم ہو جائیں اور سمندر اس کے لیے سیاہی بن جائیں اور سات سمندروں کا اس پر اضافہ ہو جائے تاکہ وہ علم خدا کو لکھیں۔ یہ سب ختم ہو جائیں گے لیکن کلمات خدا ختم نہیں ہوں گے۔ خداوند عالم عزیز و حکیم ہے" (ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ ان اللہ عزیز حکیم)۔

"یمدہ" "مداد" کے مادہ سے سیاہی یا کوئی دوسرا رنگین مادہ ہوتا ہے، جس کے ساتھ لکھتے ہیں اور اصل "مد"

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ ص ۲۰۹۔

سے جو کشش کے معنی میں ہے لیا گیا ہے۔ کیونکہ خطوط قلم کی کشش کے ذریعہ کاغذ کے صفحہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس کے لیے ایک اور معنی بھی نقل کیا ہے اور وہ تیل ہے جو چراغ میں ڈالتے ہیں، اور وہ چراغ کی روشنی کا سبب بنتا ہے اور دونوں معنی حقیقت میں ایک ہی اصل کی طرف لوٹتے ہیں۔ "کلمات" جمع ہے "کلمہ" کی اور اصل میں ان الفاظ کے معنی میں ہے، جن کے ساتھ انسان بات کرتا ہے اور پھر وہ اس سے زیادہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے اور وہ ہر وہ چیز ہے، جو کسی مطلب کو بیان کر سکے اور چونکہ اس جہان کی گوناگوں مخلوقات میں سے ہر چیز خدا کی پاک ذات اور اس کے علم و قدرت کو بیان کرتی ہے۔ لہٰذا ہر موجود کو "کلمۃ اللہ" کہا جاتا ہے، خصوصاً صاحبان شرافت و عظمت موجودات کے بارے میں یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں سورۂ نساء کی آیت ۱۷۱ میں ہم پڑھتے ہیں: انما المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ (اور اس جیسا معنی سورہ آل عمران کی آیت ۴۵ میں آیا ہے)۔

اس کے بعد اسی مناسبت سے "کلمۃ اللہ" پروردگار عالم کے علم و دانش کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اب ہمیں ٹھیک طرح سے غور و فکر کرنا چاہیئے کہ ایک انسان کی تمام معلومات کو معرض تحریر میں لانے کے لیے کبھی تو ایک قلم سیاہی کی کچھ مقدار کے ساتھ کافی ہو رہتا ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اسی ایک قلم سے دوسرے انسان بھی اپنی معلومات کے مجموعہ کو کاغذ کے صفحہ پر لے آئیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ بسا اوقات ایک تنومند درخت کے تنوں اور شاخوں سے ہزاروں بلکہ لاکھوں قلم وجود میں آسکتے ہیں، روئے زمین کے تمام عظیم درختوں اور جنگلوں کی تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جن سے کائنات کے پہاڑ، دشت اور صحرا اٹے پڑے ہیں۔ پھر ان سے تیار ہونے والے قلم اور اسی طرح اگر روئے زمین کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں، جو تقریباً کرہ ارض کے تین چوتھائی حصہ پر محیط عمیق اور گہرے ہیں۔ تو لکھنے کے لیے اس وقت کس قدر عجیب و غریب کیفیت رونما ہو گی اور علم و دانش کی کتنی مقدار کو لکھا جا سکے گا؟ خصوصاً اس وقت ان کے ساتھ سات دوسرے سمندروں کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ جن میں سے ہر ایک سمندر روئے زمین کے تمام سمندروں کے برابر ہو اور خاص کر جب اس امر کو مدنظر رکھا جائے کہ یہاں پر سات کا عدد شمار کے معنی میں نہیں، بلکہ کثرت اور زیادتی کے معنی میں ہے اور بے شمار سمندروں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تو ایسی صورت میں واضح ہو جاتا ہے کہ علم الٰہی کی وسعت کس قدر عظیم اور ناپید کنارہ ہے اور پھر یہ کہ یہ سب تو ختم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے علوم کبھی ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔

کیا کسی لامتناہی کے لیے اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی جا سکتی ہے؟ بہرحال اس قدر واضح اور ناطق ہے کہ اس کے ساتھ انسانی فکر کی لہریں بے کراں اور لامحدود آفاق کی طرف پرواز کر جاتی ہیں اور خود انسان کو حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈبو دیتی ہیں۔

اس واضح ترین بیان کی طرف توجہ کرنے سے انسان محسوس کرتا ہے کہ خدائی علم کے سامنے تو اس کی معلومات ایسی ہیں جیسے کسی لامتناہی کے سامنے ایک صفر کی ہوتی ہے اور اس مقام پر پہنچ کر اسے زیب دیتا ہے کہ کہے "میرا علم و دانش وہاں تک جا پہنچا ہے کہ میں نے اپنی نادانی کو پا لیا ہے"۔ یہاں تک کہ اس واقعیت کو بیان کرنے کے لیے قطرہ اور سمندر کی تشبیہ بھی ناکافی نظر آتی ہے۔

منجملہ لطیف نکات کے جو آیت میں نظر آتے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ لفظ "شجرۃ" مفرد کی شکل میں اور "اقلام" جمع کی صورت میں آیا ہے تاکہ قلموں کی تعداد کی فراوانی کو بیان کرے۔ جو ایک درخت کے تنوں اور شاخوں سے وجود میں آتے ہیں۔

اور نیز "البحر" کی تعبیر مفرد کی صورت میں اور اس پر "الف لام جنس" اس لیے ہے کہ یہ روئے زمین کے تمام سمندروں کو شامل ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ تمام دُنیا کے سمندر آپس میں مربوط و متصل ہیں اور واقع ہیں۔ ایک ہی وسیع و عریض سمندر کے حکم میں ہیں۔

اور مزید بات یہ ہے کہ "قلموں" کے بارے میں اضافی اور کمک کرنے اور مدد کرنے والے قلموں کی بات نہیں کی۔ بلکہ سمندروں کے بارے میں سات دوسرے سمندروں کی گفتگو درمیان میں آئی ہے۔ وہ اس لیے کہ لکھتے وقت قلم کا مصرف کم اور سیاہی کا مصرف زیادہ ہوتا ہے۔

لفظ "سبع" (سات) کا انتخاب لغت عرب میں تعداد کی کثرت اور زیادتی بیان کرنے کے لیے ہے اور یہ شاید اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ زمانہ میں لوگ منظومۂ شمسی کے کروں کی تعداد کا عدد سات سمجھتے تھے۔ (اور حقیقت میں موجودہ زمانہ میں بھی آلات لگائے بغیر منظومۂ شمسی میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ سات کروں سے زیادہ نہیں) اور پھر یہ کہ "ہفتہ" سات دنوں کی ایک کامل سیٹ سے زیادہ نہیں ہے اور تمام کرۂ ارض کو بھی سات حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اور اس کا نام سات "اقلیم" رکھا ہوا تھا۔ ان باتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اکائیوں میں سے سات کا عدد ایک کامل عدد کے عنوان سے اور تعداد کی کثرت بیان کرنے کے لیے کیوں استعمال ہوا ہے[1]۔

پروردگار کے غیر متناہی علم کے ذکر کے بعد اس کی بے انتہا قدرت کی بات درمیان میں لاتے ہوئے فرماتا ہے: تم سب کی خلقت و آفرینش نیز موت کے بعد تم سب کا اُٹھنا ایک فرد کی مثال سے زیادہ نہیں ہے۔ "خدا سننے اور دیکھنے والا ہے"۔ ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ ان اللہ سمیع بصیر۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کفار قریش کی ایک جماعت مسئلہ معاد پر تعجب کرتی اور اسے بعید سمجھتی تھی اور کہتی تھی کہ خدا نے ہمیں مختلف شکلوں میں پیدا کیا ہے اور گوناگوں مراحل کے اندر ایک دن ہم نطفہ تھے، پھر علقہ ہوئے۔ اس کے بعد لوتھڑا بنے اور پھر تدریجی طور پر مختلف صورتوں میں اس دُنیا میں آئے تو کس طرح ہم سب کو خدا ایک ہی لمحہ میں نئی خلقت دے گا؟ تو زیر بحث آیت نازل ہوئی اور اس کا جواب دیا۔

درحقیقت وہ اس نکتہ سے غافل تھے کہ "سخت" و "آسان" اور "چھوٹے" اور "بڑے" جیسے لفظوں کے مفہوم ہمارے جیسی موجودات کے لیے ہیں جو محدود قدرت رکھتی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی غیر متناہی قدرت کے سامنے میں برابر ہیں۔ خلقت خواہ ایک شخص کی ہو یا کئی اشخاص کی، ایک موجود کی خلقت ایک لمحہ میں ہو یا سالہا سال کے دوران میں اس کی بارگاہ قدرت میں سب ایک جیسا ہے۔

اگر کفار کا تعجب اس بنا پر ہے کہ یہ مختلف طبیعتیں، گوناگوں شکلیں اور انواع و اقسام کی شخصیتیں اور وہ بھی انسان کے خاک اور مٹی ہو جانے اور خاک کے منتشر ہو جانے اور ایک دوسرے سے مل جانے کے بعد کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے

---

[1] "پروردگار کے لامتناہی علم" کے سلسلہ میں جلد ۱۲ سورہ کہف کی آیت ۱۰۹ میں ہم نے گفتگو کی ہے۔

سے جدا ہوں اور ہر چیز اپنی جگہ کی طرف لوٹ آئے ؟ تو اس کا جواب خدا کا غیر متناہی علم اور لازوال قدرت دیتی ہے۔

اس نے موجودات عالم کے درمیان روابط کچھ اس طرح برقرار کیے ہیں کہ ایک اکائی مثل ایک مجموعہ کے، اور ایک مجموعہ مثل ایک اکائی کے ہے۔

اصولی طور پر اس جہان کا باہمی اتصال وارتباط کچھ اس طرح ہے کہ ہر کثرت ایک آن میں وحدت کی صورت اختیار کر سکتی ہے اور تمام انسانوں کی خلقت بھی اسی طرح اس اصول اور فارمولے کے تابع ہے، جس طرح ایک انسان کی خلقت۔

اور اگر ان کا تعجب زمانہ کے اختصار کے لحاظ سے ہے کہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ سارا عمل جو انسان حالتِ نطفہ سے لے کر جوانی کے دور تک کئی برسوں میں طے کرتا ہے مختصر سے لمحات میں طے کرے ؟ تو اس کا جواب بھی پروردگار کی قدرت دیتی ہے۔ جہاں تک ہم جاندار کی دنیا میں انسانی بچوں کو دیکھتے ہیں کہ انھیں ایک طویل مدت گزارنا چاہیئے تاکہ وہ چلنا پھرنا اچھی طرح سیکھ سکیں یا ہر نوع غذا سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے برعکس جب پرندوں کے بچوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنا سر انڈے سے باہر نکالتے ہی اور پیدا ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں اور چلنے پھرنے لگتے ہیں بلکہ غذا کھانے میں وہ اپنی ماں کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ یہ امور نشان دہی کرتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل کی خدا کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔

اس آیت کے آخر میں خدا کے "سمیع وبصیر" ہونے کا ذکر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مشرکین کی طرف سے ہونے والے ایک اور اعتراض کا جواب ہو اور وہ اس طرح، کہ چلو مان لیا کہ تمام انسان اپنی گوناگوں اور مختلف تخلیقی خصوصیات کے باوجود ایک وقت مقررہ پر اپنی قبروں سے باہر آجائیں گے، لیکن اُن کے اعمال اور اقوال کا کس طرح محاسبہ کیا جائے گا جو وجود میں آنے کے بعد فوراً نیست و نابود ہو جاتے ہیں؟

تو قرآن جواب دیتا ہے کہ خدا سننے اور دیکھنے والا ہے۔ اُس نے ان کی تمام باتیں سُنی ہیں اور اُن کے تمام اعمال دیکھے ہیں۔ علاوہ ازیں اس جہان میں مطلق فنا اور نابودی نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال واقوال ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔

اس سے قطع نظر اُوپر والا جملہ ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو حیلوں بہانوں سے کام لیتے ہیں کہ یاد رکھو یہ جو تم تمام لوگوں کے افکار کو مسموم کر رہے ہو، خدا تمھاری اس زہریلی گفتگو سے بے خبر نہیں ہے۔ حتی کہ جو کچھ تم دل میں رکھے ہوئے ہو اور زبان پر نہیں لاتے، خدا اس سے بھی آگاہ ہے۔

بعد والی آیت تاکید اور خدا کی وسیع قدرت کے لیے ایک اور بیان ہے۔ روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ خدا رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے" (الم تر ان اللہ یولج اللیل فی النہار ویولج النہار فی اللیل)۔

نیز کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ "خدا نے سُورج اور چاند کو انسانوں کے مفادات کے لیے مسخر کیا ہے" (وسخر الشمس والقمر)۔

"اور ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت تک اپنی حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہے" (کل یجری لاجل مسمی)۔

" اور یہ کہ خدا اس سے کہ جو تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے " (وان اللہ بما تعملون خبیر)۔

" ولوج " اصل " دخول " کے معنی میں ہے۔ اور رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں ہو سکتا ہے کہ تدریجی اضافہ اور سال بھر میں رات دن کے کم اور زیادہ ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ کہ تدریجاً ایک میں کمی اور دوسرے میں غیر محسوس شکل میں اضافہ ہوتا ہے تاکہ چاروں موسم اپنی خصوصیات اور بابرکت آثار کے ساتھ ظاہر ہوں۔ صرف رُوئے زمین کے دو خطے ایسے ہیں کہ جن میں نہ تو یہ تدریجی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی چار موسم، ایک تو قطب شمالی ہے اور دوسرا قطب جنوبی، جہاں سارے سال میں چھ ماہ رات اور چھ ماہ دن ہوتا ہے اور دوسرا بالکل ہی باریک خطِ استوا ہے، جہاں سال بھر میں رات دن یکساں ہوتے ہیں اور یا اس طرف اشارہ ہے کہ زمینی فضا میں رات کا دن میں اور دن کا رات میں تبدیل ہونا ناگہانی شکل میں صورت پذیر نہیں ہوتا تاکہ انسان اور زندہ موجودات کو مختلف خطرات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بلکہ سُورج کی شعاعیں طولِ فجر کے وقت پہلے تاریکی کی گہرائیوں میں داخل ہوتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں یہاں تک کہ تمام آسمان کو گھیر لیتی ہیں۔ دن کے اختتام اور رات کے آغاز کے بالکل برعکس۔

یہ تدریجی اور مکمل منظم سوچا سمجھا انتقال قدرتِ خدا کے مظاہر میں سے ہے۔

البتہ ان دونوں تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ دونوں مل کر ہی آیت کا معنی دے رہی ہوں۔

انسانوں کے لیے "شمس" و "قمر" اور باقی آسمانی کرات کی تسخیر کے بارے میں، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، مراد انسان کی خدمت کی راہ میں تسخیر ہو اور دوسرے لفظوں میں "سخر لکم" میں "لام" "لام منفع" ہے، نہ کہ "لام اختصاص" اور یہ تعبیر قرآن میں سُورج، چاند، رات، دن، نہروں اور دریاؤں اور کشتیوں کے بارے میں آئی ہے اور یہ سب انسانی شخصیت کی عظمت اور خدا کی نعمتوں کی وسعت کو بیان کرتی ہیں کہ زمین و آسمان کے تمام موجودات حکم خدا کے آگے سر جھکائے فرمانبرداری میں مصروف ہیں۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر انصاف سے بعید ہوگا کہ انسان خدا کا فرمانبردار نہ ہو۔[1]

" کل یجری لاجل مسمّی "، کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ بجا تُلا حساب شدہ اور منظم نظام ابد تک جاری و ساری نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی دن اسے ختم ہونا چاہیئے اور اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی دُنیا بھی ختم ہو جائے گی۔ وہی کچھ ہوگا جو "سورۂ تکویر" میں کہا گیا ہے:

" اذا الشمس کورت و اذا النجوم انکدرت "

" جس وقت سُورج بے نور ہو جائے گا اور ستارے سیاہ اور تاریک ہو جائیں گے "۔

(ان اللہ بما تعملون خبیر) ہماری مندرجہ بالا گفتار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس جملہ پر غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ اس کا اسی بحث کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ کیونکہ وہ خدا جس نے باعظمت سُورج اور چاند کو اس منظم حساب و کتاب کے ساتھ چلایا ہوا ہے اور رات دن کو مخصوص نظم و ضبط کے ساتھ لاکھوں کروڑوں سال سے ایک دوسرے میں وارد کرتا

---

[1] " انسان کے لیے سُورج چاند اور دوسرے موجودات کی تسخیر کے بارے میں جلد نمبر ۷ سورۂ رعد کی آیہ ۲ کے ذیل میں (ص ۱۱۴) اور سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۳ (ص ۲۵۳) میں ہم نے تفصیلی بحث کی ہے۔ (اردو مترجم)

آرہا ہے، اس سے کس طرح ممکن ہے کہ وہ انسانوں کے اعمال سے بے خبر رہ جائے؟ جی ہاں! وہ ان کے اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان کی نیات وافکار اور تصورات کو بھی۔

آیت کے آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے نتیجے کے طور پر فرماتا ہے "یہ امور اس چیز کی دلیل ہیں کہ خدا حق ہے اور اس کے علاوہ جنہیں وہ لوگ پکارتے ہیں وہ باطل ہیں اور خدا بلند مقام اور بزرگ مرتبہ والا ہے" ذالک بان اللہ ھو الحق وان ما یدعون من دونہ الباطل وان اللہ ھو العلی الکبیر[1]

گذشتہ آیات میں خداوند عالم کی خالقیت، مالکیت اور غیر متناہی علم وقدرت کے بارے میں بحث سے ثابت ہوگیا ہے کہ "حق" صرف وہی ہے اور اس کے علاوہ سب زائل، باطل، محدود اور حاجت مند ونیازمند ہے۔ اور "علی وکبیر" کہ جو ہر چیز سے برتر اور توصیف وتعریف سے بالاتر ہے وہ اسی کی پاک ذات ہے۔ شاعر کے بقول ؎

الا کل شیء ما خلا اللہ باطل وکل نعیم لا محالۃ زائل

"آگاہ رہو کہ خدا کے علاوہ جو کچھ ہے وہ باطل ہے اور ہر نعمت آخرکار زوال پذیر ہے"

اس بات کو فلسفی تعبیر میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

حق اصلی اور پائیدار وجود کی طرف اشارہ ہے اور اس جہان میں وہ وجود حقیقی جو قائم بالذات اور ثابت برقرار اور جاودانی ہو وہ صرف وہی ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے بالذات کوئی وجود نہیں رکھتا اور عین بطلان ہے کہ جو اپنی ہستی کو اس وجود حق سے وابستگی کی بنا پر ظاہر کرتا ہے اور جس لمحہ وہ اپنی نظر لطف ان سے اٹھالے تو وہ فنا ونیستی کی تاریکیوں میں مٹ کر ناپید ہوجائیں۔

تو اس طرح دوسرے موجودات کا ارتباط حق تعالیٰ کے وجود کے ساتھ جس قدر زیادہ ہوگا اسی نسبت سے وہ زیادہ حقانیت کسب کریں گے۔

بہرحال جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیات خدا کی برجستہ صفات میں سے دس صفات کا مجموعہ اور اس کے اسماء حسنیٰ میں سے دس نام ہیں اور ہر قسم کے شرک کی نفی اور تمام مراحل عبودیت میں توحید کے لزوم پر قوی دلائل پر مشتمل ہیں۔

---

[1] "با" "ان اللہ ھو الحق" میں اگرچہ بادی النظر میں "باء سببیت" نظر آتی ہے اور شاید اسی بنا پر بعض مفسرین نے جیسے آلوسی نے روح المعانی میں، اس آیت کے مضمون کو گذشتہ مطلب کا سبب قرار دیا ہے۔ لیکن آیات کا سیاق اور گذشتہ صفات کا ذکر یعنی خالقیت و مالکیت وعلم و قدرت اور عالم خلقت میں اس کی نشانیاں بظاہر یہ ہے کہ وہ سب اس نتیجہ کے گواہ تھے۔ اس بنا پر اس آیت کا مضمون گذشتہ آیات کا نتیجہ ہے نہ کہ سبب۔

۳۱۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

۳۲۔ وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝

ترجمہ

۳۱۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں سمندر کے سینے پر حکم خدا اور اس کی نعمت کی برکت سے چلتی ہیں، وہ تمھیں اپنی آیات کا ایک حصہ دکھانا چاہتا ہے۔

۳۲۔ اور جس وقت (دریائی سفر میں) بادلوں کی طرح کوئی موج انھیں چھپا دے (اور ان کے سر کے اوپر آجائے) تو وہ خدا کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، لیکن جس وقت اس نے انھیں خشکی کی طرف نجات دی تو اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں (اور اپنے ایمان کے وفادار رہتے ہیں، جب کہ دوسرے بعض بھول جاتے ہیں اور کفر کی راہ اختیار کر لیتے ہیں) اور ہماری آیات کا کوئی شخص سوائے عہد شکن کفر کرنے والے کے اور کوئی انکار نہیں کرتا۔

پیدا کرتے ہیں اور کبھی کبھار تو اس طرح انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں کہ اپنے ماسوا باقی ہر ایک چیز سے غافل کر دیتے ہیں۔

اسی بنا پر بعض اسلامی روایات میں حضرت امیر المومنین علیؑ سے منقول ہے کہ جس وقت آپ سے لوگوں نے سوال کیا "ای الناس اثبت رأیاً" کون شخص تمام لوگوں میں سے صاحب فکر و رائے اور تدبیر کے لحاظ سے زیادہ ثابت قدم ہے تو آپ نے فرمایا "من لم یغره الناس من نفسه ولم تغره الدنیا بتشویقها" وہ شخص کہ جسے فریب کار لوگ فریب نہ دے سکیں اور دُنیا کی رغبت اسے دھوکہ نہ دے سکے۔[1]

لیکن اس کے باوجود اسی فریب کار دُنیا کے مختلف مناظر کے اندر زبان حال سے بولنے والے کچھ ایسے مناظر بھی ہیں جو اس جہاں کی ناپائیداری اور اس کے کھوکھلے زرق و برق کو واضح ترین انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ حوادث جو ہر ہوش مند انسان کو بیدار کر سکتے ہیں بلکہ جو ہوش مند نہیں انھیں بھی ہوشیار کر دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے۔ حضرت امیر المومنین علیؑ نے کسی سے سُنا کہ وہ دنیا کی خدمت کر رہا تھا اور اسے فریب کار بتا رہا تھا تو آپ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا،

ایها الذام للدنیا المغتر بغرورها، المخدوع بابا طیلها، اتغتر بالدنیا ثم تذمها؟ انت المتجرم علیها ام هی المتجرمة علیك؟ متی استهوتك؟ امتی غرتك؟ ابمصارع آبائك من البلی ام بمضاجع امهاتك تحت الثری؟ ...

ان الدنیا دار صدق لمن صدقها، ودار عافیة لمن فهم عنها، ودار غنی لمن تزود منها، ودار موعظة لمن اتعظ بها، مسجد احباء الله، ومصلی ملائکة الله، ومهبط وحی الله، ومتجر اولیاء الله ...

اے دنیا کی خدمت کرنے والے! اس کی دل فریبیوں کے فریب خوردہ، اس کی رام کہانیوں کا دھوکہ کھائے ہوئے! کیا بات ہے کہ دُنیا پر فریفتہ بھی ہو اور اس کی خدمت بھی کر رہے ہو؟ کیا تم اس گناہ کی تہمت لگا رہے ہو، یا وہ تمھیں مجرم ٹھہرا رہی ہے؟ اس نے تمھیں کب متوالا کیا؟ یا کب تمھارا دل لبھایا؟ کیا اس وقت جب تمھارے آبا رسال خوردہ ہو کر ڈھیر ہوئے یا اس وقت جب تمھاری مائیں منوں مٹی کے نیچے ہمیشہ کو سو گئیں؟ کتنے ہی بیماروں کی تم نے (روپے سے) خدمت کی۔ اور کتنے ہی مریضوں کی ہاتھوں سے تیمارداری کی؟ تم چاہتے تھے کہ وہ شفایاب ہو جائیں اور ان کے علاج کے لیے اطبا سے مشورے طلب کرتے پھرتے تھے۔ وہ بھی اس دن جب سے تمھاری دوا ان کے کسی کام نہ آئی۔ نہ ان پر تمھارا رونا دھونا ہی مفید ہوا۔ ان میں سے کسی کو بھی تمھاری مہربانی کا فائدہ نہ پہنچا اور نہ تمھاری مراد ہی بر آئی اور تم اپنا زور لگا بیٹھے، مگر کسی کو (موت سے) نہ بچا سکے۔ اور دنیا نے اس (مرنے والے) کو تمھارے لیے مثال بنا دیا اور اس کی موت کو تمھاری موت کا نقشہ بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا تباہ کا گھر ہے۔ مگر اس کے لیے جو اس سے تباہ کرے اور دار

---

[1] من لا یحضره الفقیه (بحوالہ نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۱۷)

عافیت ہے اس کے لیے جو اس کی حقیقت کو سمجھ لے اور دولت کدہ ہے اس کا جو اس سے زادِ آخرت حاصل کر سکے۔
اور عبرت کا گھر ہے اس کے لیے جو اس سے سبق سیکھ لے۔ (دنیا) خدا کے دوستوں کی مسجد ہے، اللہ کے ملائکہ کی جائے نماز ہے، وحی خدا کے اترنے کی جگہ ہے اور خدا کے اولیاء کی تجارت گاہ ہے۔

۳۔ **یہ پانچ علوم خدا کے ساتھ مخصوص ہیں:** اس سے قطع نظر کہ اوپر والی آیت کا لب و لہجہ حکایت کرتا ہے کہ قیامت، بارش کے نزول، رحم مادر میں جنین کی کیفیت، وہ امور کہ جنہیں انسان آئندہ انجام دے گا اور اس کی موت کی جگہ سے آگاہی اور اس کا علم خدا کے اختیار میں ہے اور خدا کے علاوہ کسی اور کو ان تک کوئی رسائی نہیں، وہ روایات بھی جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں نیز اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں۔

منجملہ ان کے ایک حدیث میں ہے: ان مفاتیح الغیب خمس لا یعلمھن الا اللہ وقرأ ھذہ الآیۃ، غیب کی چابیاں پانچ ہیں کہ جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے اوپر والی آیت کی تلاوت فرمائی۔[1]

نہج البلاغہ کی ایک اور روایت میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت حضرت علیؑ آئندہ کے واقعات کے بارے میں خبر دے رہے تھے۔ تو ایک صحابی نے عرض کیا یا امیر المومنین آپ غیب کی خبر دے رہے ہیں؟ اور آپ علم غیب سے آشنا ہیں؟
امام نے "بنی کلب" کے اس شخص سے مسکرا کر فرمایا:

یا اخا کلب! لیس ھو بعلم غیب، وانما ھو تعلم من ذی علم، وانما علم الغیب علم الساعۃ وما عددہ اللہ سبحانہ بقولہ ان اللہ عندہ علم الساعۃ ..... فیعلم اللہ سبحانہ ما فی الارحام من ذکر او انثی، وقبیح او جمیل، وسخی او بخیل، وشقی او سعید، ومن یکون فی النار حطبا وفی الجنان للنبیین مرافقا، فھذا علم الغیب الذی لا یعلمہ احد الا اللہ، وما سوی ذلک فعلم علمہ اللہ نبیہ فعلمنیہ ودعا لی بان یعیہ صدری وتضطم علیہ جوانحی۔!

اے بھائی کلبی! یہ علم غیب نہیں ہے، بلکہ یہ اس (رسول) سے حاصل کی ہوئی باتیں ہیں جو خزانہ علم (الٰہی) تھے۔ علم غیب تو قیامت کا وقت اور ان چیزوں کے جاننے کا نام ہے، جنہیں خداوند عالم نے اپنے ارشاد "ان اللہ عندہ علم الساعۃ ..... الخ" میں شمار کیا ہے۔

پس خدا ہی جانتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے؟ نر ہے یا مادہ؟ بدصورت ہے یا خوبصورت؟ سخی ہے یا بخیل؟ شقی ہے یا نیک اور کون جہنم کا ایندھن بنے گا؟ اور کون جنت میں نبیوں کے ساتھ ہوگا؟ پس یہ ہے وہ علم غیب جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، رہا دوسری چیزوں کا علم تو وہ ہم جانتے ہیں، خدا نے اپنے نبی کو عطا فرمایا اور نبی نے مجھے تبلا دیا اور میرے لیے دعا فرمائی کہ میرا سینہ انھیں اس طرح محفوظ رکھے، جیسے ترکش تیروں کو محفوظ رکھتا ہے اور میری پسلیاں

---

[1] "مجمع البیان" ذیل آیت زیر بحث۔

انہیں سمیٹے رہیں۔[1]

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ لوگوں کی ان پانچ امور سے عدم آگاہی سے مراد ان کی تمام خصوصیات ہیں مثلاً اگر کسی دن ایسے وسائل و ذرائع انسان کے اختیار میں آجائیں (جب کہ ابھی تک وہ دن نہیں آیا) اور جنین کے لڑکے یا لڑکی ہونے سے قطعی طور پر آگاہ ہو جائیں تو کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ کیونکہ جنین سے آگاہی یہ ہے کہ اس کے تمام جسمانی خصوصیات بدصورتی اور خوبصورتی سلامتی و بیماری اندرونی استعدادیں علمی و فلسفی و ادبی ذوق اور دوسرے روحانی اوصاف اور کیفیات جان لیں اور یہ امر خدا کے علاوہ کسی اور کے بس میں نہیں ہے۔

اسی طرح یہ کہ بارش کب ہوگی؟ اور کون سے علاقہ پر برسے گی؟ اور ٹھیک کتنی مقدار دریا، صحرا، درہ، کوہ و بیاباں میں برسے گی؛ خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا!

اور کل اور آئندہ دنوں کے حوادث اور ان کی خصوصیات و جزئیات بھی اسی طرح ہیں۔

اور یہاں سے اس سوال کا جواب جو عام طور پر یہاں پیش آتا ہے، اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ ہم تاریخوں اور متعدد روایات میں پڑھتے ہیں کہ صرف ائمہ اہل بیت ہی نہیں بلکہ ائمہ کے علاوہ دوسرے اولیاء اللہ نے اپنی موت کے متعلق خبر دی یا اپنے مومن کو بیان کیا، جن میں سے کربلا سے تعلق رکھنے والے واقعات بھی ہیں؛ چنانچہ ہم نے کئی روایات میں پڑھا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ، امیرالمومنینؑ اور انبیاء ماسلف نے امام حسینؑ اور ان کے یارو انصار کی اس سرزمین میں شہادت کی خبر دی ہے۔

اور کتاب اصول کافی میں ایک باب ائمہ کی اپنی وفات کے وقت سے آگاہی کے سلسلہ میں نظر آتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان بعض امور سے آگاہی علم اجمالی کی صورت میں ہوتی ہے اور وہ بھی تعلم الٰہی کے طریق سے، تو اس کا خدا کی ذات پاک سے مخصوص تفصیلی علم کے ساتھ کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں ہے۔

اور پھر یہ کہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں کہ ان کا یہ اجمالی علم بھی ذاتی اور استقلالی نہیں۔ بلکہ بالفرض اور خدا کی طرف سے تعلیم کی وجہ سے ہوتا ہے کہ جتنا خدا چاہتا اور مصلحت سمجھتا ہے۔[2]

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آپ کے صحابی نے سوال کیا کہ کیا امام علم غیب جانتا ہے؟

"قال لا، ولکن اذا اراد ان یعلم الشیٔ اعلمه الله ذلك"

"فرمایا نہیں، امام علم غیب" ذاتی طور پر" نہیں جانتا۔ لیکن جب بھی کسی چیز کو جاننا ہے تو خدا اسے آگاہ کر دیتا ہے۔[3]

علم غیب اور انبیاءؑ و ائمہؑ کے علم کی کیفیت کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں، جن کے متعلق متعلقہ آیات کے ذیل میں ہم بحث کریں گے۔ لیکن مسلم ہے کہ ان کے درمیان کچھ ایسے علوم ہیں کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۸۔

[2] اصول کافی جلد اول ص ۲۰۲ باب ان الائمۃ یعلمون متی یموتون۔

[3] اصول کافی جلد اول ص ۲۰۱ باب نادر فیہ ذکر الغیب۔

بھی آگاہ نہیں ہے۔[1]

پروردگارا! ہمارے دل کی آنکھ علم و دانش کے نور سے منور فرما اور اپنے بے پایاں علم کا ایک گوشہ مرحمت فرما۔

خداوندا! ایسا کر کہ اس دُنیا کا زرق و برق ہمیں فریب نہ دے اور دھوکہ باز شیطان اور ہوائے نفس ہمیں مغرور نہ کرے۔

بارالٰہا! ایسا کر دے کہ ہم ہمیشہ تیرے احاطہ علمی سے آگاہ رہیں اور تیرے حضور تیری رضا کے خلاف کوئی کام انجام نہ دیں۔

سورۂ لقمان کا اختتام

۱۵ ذی الحجہ ۱۴۰۳ ہجری

---

[1] کتاب "اصول کافی" میں ہمیں متعدد روایات ملتی ہیں کہ خدا ایسا علم بھی رکھتا ہے، جس سے اس کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں اور کچھ علم ایسا ہے، جس کی ملائکہ انبیاءؑ اور ائمہ کو اس نے تعلیم دی ہے۔ جلد اول ص ۱۹۹ باب ان الائمۃ یعلمون جمیع العلوم التی خرجت الی الملائکۃ۔

سورۂ

الٓمٓ سجدۃ

اس سورت کی ۳۰ آیات ہیں

اور

مکہ میں نازل ہوئی

اس سُورۃ کے نام

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ بعض مفسرین نے تو اس کی کسی آیت کا استثناء بھی نہیں کیا ہے۔ لیکن بعض نے آیہ ۱۸ تا ۲۰ کو مدنی سمجھا ہے اور ان کا نظریہ ہے کہ یہ تین آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ حالانکہ ان آیات میں ان کے مدنی ہونے کا کوئی قرینہ اور نشانی نظر نہیں آتی۔

اس سورہ کا نام بعض روایات میں اور مشہور مفسرین کی زبان میں "سورۂ سجدہ" یا "الم سجدہ" ہے۔ اور کبھی اسے "حم سجدہ" سے جدا بیان کرنے کے لیے اور "سجدۂ لقمان" کے نام سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ یہ سورۂ لقمان کے بعد قرار پایا ہے۔

بعض روایات میں اسے الم تنزیل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

"فخر رازی" اور "آلوسی" نے تو اس کے ناموں میں سورۂ "مضاجع" کا نام ذکر کیا ہے (اس سورہ کی آیت نمبر ۱۶ تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع ..... کی مناسبت سے)۔

سورۂ سجدہ کی تلاوت کی فضیلت:

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے یوں مذکور ہے:

"من قرأ الم تنزیل وتبارک الذی بیدہ الملک، فکانما احیا لیلۃ القدر"

"جو شخص سورۂ الم تنزیل اور "تبارک الذی" کو پڑھے تو گویا اس نے شب قدر جاگ کر گزاری"۔[1]

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر بن محمد صادقؑ سے اس طرح نقل ہوا ہے:

"من قرأ سورۃ السجدۃ فی کل لیلۃ جمعۃ اعطاہ اللہ کتابہ بیمینہ"

---

[1] مجمع البیان جلد ۸ ص ۳۲۴۔

ولم یحاسبہ بما کان منہ. وکان من رفقاء محمد واھل بیتہ"[1]

"جو شخص سورہ سجدہ ہر شب جمعہ پڑھے خدا اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا اور اس کے گزشتہ گناہوں کو بخش دے گا اور محمد و اہل بیت محمد علیہم السلام کے دوستوں میں ہوگا۔"

چونکہ اس سورہ میں مبدء و معاد اور قیامت کے دن مجرمین کے عذاب و سزا اور ہوشیار و بیدار کرنے والے دروس مومنین اور کافرین سے متعلق وسیع اور تفصیلی مباحث آئی ہیں، یقیناً اس کی تلاوت انسان کی اس حد تک اصلاح کر سکتی ہیں کہ ان تمام فضائل اور اعزازات کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اور اس کا بیدار کرنے والا اگر شب قدر کی بیداری کے مانند ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اصحاب یمین کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے اور پیغمبر اور ان کی آل کی دوستی اور رفاقت کے اعزاز و افتخار کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن تلاوت ایسی جو سوچ و بچار کا سرچشمہ ہو اور سوچ و بچار ایسی جو پختہ ارادے اور تحرک کا منبع ہو۔

سورہ سجدہ کے مندرجات:

یہ سورہ چونکہ "مکی" سورتوں میں سے ہے۔ لہٰذا دوسری مکی سورتوں کی طرح اپنے اصلی خطوط یعنی "مبدء و معاد" اور "بشارت و انذار" کے مباحث پر مشتمل ہے اور بطور مجموعی اس میں چند مباحث توجہ طلب ہیں:

۱۔ سب سے پہلے عظمت قرآن کے بارے میں گفتگو ہے اور اس کا پروردگار عالمین کی طرف سے نازل ہونے اور دشمنی کے الزامات کی نفی ہے۔

۲۔ اس کے بعد آسمان و زمین میں خدا کی نشانیوں اور اس کائنات کے چلانے کے سلسلہ میں بحث ہے۔

۳۔ ایک اور بحث انسان کی "مٹی" اور "نطفہ کے پانی" اور "خدا کی روح" سے خلقت اور علم و دانش کو حاصل کرنے کے ذرائع یعنی آنکھ، کان اور عقل کا خدا کی طرف سے عطیہ ہونا ہے۔

۴۔ اس کے بعد قیامت اور اس کے پہلے کے حوادث یعنی موت اور اس کے بعد یعنی سوال و جواب حساب کے بارے میں گفتگو ہے۔

۵ اور ۶۔ مؤثر اور ہلا دینے والی بشارت و انذار کی مباحث ہیں۔ جن میں مومنین کو جنت المادی کی نوید دیتا ہے اور فاسقین کو جہنم کی آگ سے ڈراتا ہے۔

۷۔ اسی مناسبت سے بنی اسرائیل کی تاریخ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت اور اسی امت کی کامیابیوں کی طرف مختصر سا اشارہ بھی ہے۔

۸۔ دوبارہ بشارت و انذار کی بحث کے پیش نظر گزشتہ امتوں میں سے ایک گروہ کے حالات اور اس کے

---

[1] مجمع البیان جلد نہم ص ۳۲۵۔

دردناک انجام کی طرف اشارہ ہے۔

۱۹ اور ۲۱۔ دوبارہ مسئلہ توحید اور عظمت خدا کی نشانیوں کی طرف لوٹتا ہے اور "ضدی و ہٹ دھرم دشمنوں" کو متنبہ کرنے کے بعد سورت اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

تو اس طرح سے اس سورہ کا اصل مقصد مبدء و معاد پر ایمان کی بنیادوں کو مضبوط کرنا اور اس کے ذریعے تقویٰ کی طرف تحرک کی ایک قوی موج ایجاد کرنا ہے، جس سے لوگ طغیان اور سرکشی سے باز آجائیں اور اپنے بلند انسانی مرتبہ کی قدر و قیمت کو پہچانیں۔ جس کی اسلام کی ابتدائی تحریک کے ایام میں سرزمین مکہ کے ماحول کے لیے از حد ضرورت تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ الٓمّٓ ۝

۲۔ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۳۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝

۴۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

۵۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝

ترجمہ

۱۔ الم۔

۲۔ یہ وہ کتاب ہے جو عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے

اور اس میں شک و تردید نہیں ہے۔

۳۔ لیکن وہ کہتے ہیں (محمدؐ نے) خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔ لیکن (انھیں جاننا چاہیئے) کہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق بات ہے، تاکہ تم ایسے گروہ کو ڈراؤ جس کی طرف تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے شاید (وہ پند و نصیحت حاصل کرکے) ہدایت پا جائیں۔

۴۔ خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا ہے، پھر عرش (قدرت) پر قرار پایا۔ تمھارے لیے اس کے علاوہ اور کوئی ولی اور شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

۵۔ اس جہاں کے امور کی آسمان سے زمین کی طرف تدبیر کرتا ہے، پھر اس دن جس کی مقدار ہزار سال ہے، ان سالوں کے (حساب سے) جو تم شمار کرتے ہو، اس کی طرف لوٹ جائے گا (اور دنیا ختم ہو جائے گی)۔

تفسیر

عظمت قرآن اور مبدء و معاد:

اس سورہ میں ہم "حروف مقطعات" (الف۔ لام۔ میم) سے ایک بار پھر رُوبرو ہو رہے ہیں اور یہ پندرھویں دفعہ ہے کہ ہم قرآنی سورتوں کے آغاز میں اس قسم کے حروف دیکھ رہے ہیں۔

سورہ بقرہ کے آغاز (اسی تفسیر کی جلد اوّل) اور آل عمران (جلد دوم) اور اعراف (جلد ششم) میں ہم ان حروف کی مختلف تفسیروں سے تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ جو بحث قرآن کی اہمیت کے سلسلہ میں ان حروف کے فوراً بعد آئی

ہے، ایک بار پھر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ "الٓمٓ" قرآن کی عظمت اور پروردگار عالم کی عظیم قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اس قسم کی عظیم اور مطالب سے لبریز کتاب جو حضرت محمد مصطفےٰ کا جاودانی معجزہ ہے "الف با" ایسے سادہ حروف سے وجود میں آئی ہے اور جن پر ہر ایک کی دسترس ہے۔

فرماتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں (تنزیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین)۔[1]

واقع میں یہ آیت دو سوالوں کا جواب ہے، گویا پہلے اس آسمانی کتاب کے مضامین اور مندرجات کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو جواب میں کہتا ہے۔ اس کے مندرجات اور مضامین حق ہیں اور اس میں کم ترین شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر اس کے وجود میں لانے والے کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو جواب میں کہتا ہے۔ یہ کتاب "رب العالمین" کی طرف سے ہے۔

یہ تفسیر بھی متحمل ہے کہ "من رب العالمین" کا جملہ "لاریب فیہ" کے لیے دلیل ہو گویا کوئی سوال کرتا ہے کہ کس بناء پر یہ کتاب حق ہے، تو کہتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ عالمین کے اس پروردگار کی طرف سے ہے، جس کے وجود سے حق اور حقیقت جلوہ گر ہوتے ہیں۔

ضمناً خدا کے تمام اوصاف میں سے "رب العالمین" کی صفت پر دارومدار اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب عجائبات عالم کا مجموعہ اور عالم وجود کے حقائق کا نچوڑ ہے۔ کیونکہ عالمین کے پروردگار کی طرف سے ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ قرآن نہیں چاہتا کہ یہاں صرف دعوے پر قناعت کرے۔ بلکہ یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ "عیان راچہ بیان" کے مصداق خود اپنی کتاب کے مضامین ہی اس کی حقانیت اور صداقت کے گواہ ہیں۔

پھر اس تہمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے جو بارہا مشرکین اور بے ایمان منافقین اس عظیم آسمانی کتاب پر باندھتے تھے۔ "وہ کہتے ہیں محمد نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے، حالانکہ یہ پروردگار عالمین کی طرف سے نہیں ہے" (ام یقولون افتراہ)۔[2]

ان کے بے دلیل دعوے کے جواب میں کہتا ہے: "وہ افترا نہیں ہے، بلکہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق

---

[1] "تنزیل الکتاب" مبتدائے محذوف "ھذا" کی خبر ہے اور "لاریب فیہ" اس کی صفت اوّل اور "من رب العالمین" دوسری صفت ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ہو سکتا ہے، تینوں یکے بعد دیگرے خبریں ہوں۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔ بہرحال تنزیل مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں آیا ہے اور کتاب کی طرف اس کی اضافت صفت کی موصوف کی طرف اضافت کے قسموں سے ہے یہ احتمال بھی ہے کہ شاید مصدر اپنے اصلی معنی میں آکر مبالغہ کا معنی بتا رہا ہو۔

[2] "ام" یہاں "بل" کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ تقدیری طور پر یہ جملہ یوں ہو سکتا ہے (ایعترفون بہ ام یقولون افتراہ (تفسیر فخر رازی وابوالفتوح) لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

بات ہے: "بل ھو الحق من ربك"۔

اور اس کی حقانیت کی دلیل خود اس میں آشکار و نمایاں ہے۔

پھر اس کے نزول کے ہدف اور مقصد کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "ہدف اور مقصد یہ تھا کہ ایک گروہ کو تو انذار کرے اور ڈرائے کہ جنہیں تجھ سے پہلے انذار کرنے والا نہیں آیا ہے، شاید وہ پند و نصیحت اور ہدایت حاصل کریں"؛ (لتنذر قوما ما اتاھم من نذیر من قبلك لعلھم یھتدون)۔

اگرچہ پیغمبر اسلام کی دعوت "بشارت" یعنی خوشخبری بھی ہے اور "انذار" بھی یعنی ڈرانا بھی۔ اور پیغمبر "بشیر" سے زیادہ "نذیر" ہے۔ لیکن گمراہ اور ہٹ دھرم قوم کے مقابلہ میں "انذار" پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

"ھو الحق من ربك" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی حقانیت کی دلیل خود اسی میں مشہود ہے اور "لعلھم یھتدون" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن ہدایت کے لیے صرف سرزمین ہموار کرتا ہے لیکن مصمم ارادہ تو بہرحال خود انسان ہی کرتا ہے۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں:

۱۔ اس قوم سے کونسی قوم مراد ہے جن کی طرف پیغمبر اسلام سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟

۲۔ علاوہ ازیں کیا خود قرآن نہیں کہتا:

"وان من امة الا خلا فیھا نذیر"

"کوئی امت ایسی نہیں تھی کہ جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو"۔ (فاطر۔ ۲۴)

پہلے سوال کے جواب میں مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مراد قبیلہ قریش ہے، جس میں پیغمبر اسلام سے پہلے کوئی انذار کرنے اور ڈرانے والا نہیں تھا۔

لیکن دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ مراد دورِ فترت ہے (یعنی حضرت عیسیٰ کے قیام اور پیغمبر اسلام کے ظہور کا درمیانی زمانہ)۔

لیکن ان دونوں جوابوں میں سے کوئی بھی جواب صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ سوال کرنے والے کے نظریہ کے مطابق زمین کبھی بھی حجتِ خدا سے خالی نہیں رہتی اور ہر دور میں پیغمبر یا وصی پیغمبر اتمام حجت کے لیے انسانوں کے درمیان موجود رہتے ہیں۔

اس بناء پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "نذیر" سے مراد کوئی عظیم پیغمبر ہو جو اپنی دعوت کو آشکارا اور معجزات کے ساتھ اور وسیع و عریض ماحول میں ظاہر کرے، اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کا انذار کرنے والا جزیرہ نمائے عرب اور قبائل "مکہ" کے درمیان ظاہر نہیں ہوا۔

اور دوسرے سوال کے جواب میں یوں کہنا چاہیئے "وان من امة الا خلا فیھا نذیر" کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر امت میں انذار کرنے والا موجود رہا ہے۔ لیکن یہ کہ وہ ہر جگہ ذاتی و شخصی طور پر بھی موجود ہو، یہ ضروری نہیں ہے۔ یہی بات کہ خدائے عظیم کے پیغمبروں کی دعوت کی صدا ان کے اوصیاء کے ذریعے دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچ جائے کافی ہے۔

یہ بات ٹھیک اس طرح ہے کہ ہم کہیں کہ ہر امت میں اولوالعزم پیغمبر بھی تھے اور آسمانی کتاب بھی۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تاریخی طور پر اس پیغمبر کی صدا اور اس کی آسمانی کتاب اس کے نمائندوں اور اوصیاء کے ذریعہ سے اس ساری اُمت تک پہنچی ہے۔

عظمت قرآن اور رسالت پیغمبر اکرمؐ کے بعد اسلام کے ایک اور اہم ترین بنیادی عقیدہ یعنی توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کو بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "خدا وہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین اور ہر اس چیز کو چھ دنوں میں پیدا کیا جو ان دونوں کے درمیان ہے" (اللہ الذی خلق السماوات والارض وما بینھما فی ستة ایام)۔[1]

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی آیات میں چھ دنوں سے مراد "چھ دور" ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ "دن" کے معانی میں سے ایک معنی روز مرہ کے استعمال میں "دور" بھی ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں، ایک دن تھا کہ استبدادی ٹولہ حکومت کرتا تھا اور آج "شورائی" نظام ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں، استبدادی ٹولے ہزارہا سال حکومت کرتے رہے ہیں۔ لیکن اسے "ایک دن" سے تعبیر کرتے ہیں:

اور دوسری طرف یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ آسمان و زمین پر مختلف دور گزرے ہیں:

ایک دن نظام شمسی کے تمام کرات ایک پگھلے ہوئے تودے کی صورت میں تھے۔

تو دوسرے دن سیارے سورج سے الگ ہو گئے اور اس کے اطراف گردش کرنے لگے۔

ایک دن زمین آگ کا ایک ٹکڑا تھی۔

دوسرے دن ٹھنڈی اور سرد ہو کر نباتات اور حیوانات کی زندگی کے قابل بن گئی، پھر زندہ موجودات مختلف مراحل میں وجود میں آئے۔

(ہم اس معنی کی تشریح اور اسی طرح چھ ادوار کی تفصیل چھٹی جلد کے صفحہ ۱۷۷ پر سورۂ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں)۔

واضح ہے کہ پروردگار کی بے انتہاء قدرت اس سارے جہاں کی ایجاد کے لیے ایک مختصر سے لمحہ بلکہ اس سے بھی کم تر کے لیے کافی ہے۔ لیکن یہ تدریجی نظام عظمتِ خدا اور اس کے علم اور تمام مراحل میں اس کی تدبیر کو بہتر طریقہ سے بیان کر سکتا ہے۔

مثلاً اگر "جنین" ایک ہی لمحہ میں اپنے تکامل وارتقاء کے تمام ادوار کو طے کر کے متولد ہو جاتا ہے تو اس کے عجائبات انسان کی نظر سے دور رہ جاتے ہیں۔ لیکن جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ان نو ماہ کے دوران میں ہر دن اور ہر ہفتہ نئے

---

[1] لفظ اللہ اس جملہ میں مبتداء ہے اور "الذی" اس کی خبر ہے، اس جملہ کی ترکیب میں اور احتمال بھی دیئے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ "اللہ" خبر ہے مبتداء محذوف کی۔ یا یہ کہ اللہ مبتداء ہے اور اس کی خبر "مالکم من دونہ من ولی" ہے لیکن یہ دونوں احتمالات چنداں مناسب نظر نہیں آتے۔

عجائب وغرائب شکل اور حالات اپنے اندر لیتا ہے اور یکے بعد دیگرے عجیب وغریب اور مختلف مراحل سے گزرتا ہے تو آفریدگار کی عظمت سے ہم بہتر طور پر آشنا ہوتے ہیں۔

مسئلہ آفرینش وخلقت کے بعد عالم ہستی پر "حاکمیت خدا" کے مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"پھر خدا عرش پر مستقر ہوا اور سارے عالم ہستی پر حکومت کی" (ثم استوی علی العرش)۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ لفظ "عرش" اصل میں بلند پایہ تختوں کے معنی میں ہے اور عام طور پر کنایہ ہوتا ہے، قدرت اور طاقت سے جیسا کہ روزمرہ تعبیرات میں ہم کہتے ہیں۔ فلاں شخص کے تخت کے پائے گر گئے۔ یعنی اس کی قدرت اور طاقت ختم ہوگئی ہے۔

اس بناء پر خدا کا عرش پر قرار پانا اس کے جسمانی معنی میں نہیں ہے کہ خدا بادشاہوں کی طرح کوئی تخت رکھتا ہو اور اس کے اوپر بیٹھا ہو۔ بلکہ اس معنی میں ہے کہ وہ جہان ہستی کا خالق بھی ہے اور سارے عالم پر اس کی حکومت بھی ہے[1]

اور آیت کے آخر میں توحید "ولایت" و "شفاعت" کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرکے مراحل توحید کو مکمل کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس کے علاوہ تمہارا کوئی ولی وشفیع نہیں ہے" (مالکم من دونہ من ولی ولا شفیع)۔

اس واضح دلیل کے باوجود کہ جہان کی خالقیت اس کی حاکمیت کی دلیل ہے اور حاکمیت ولی، شفیع اور معبود کی توحید پر دلالت کرتی ہے۔ تو پھر تم کیوں بے راہ روی اختیار کرتے ہو اور بتوں کے دامن کو پکڑتے ہو۔ "تم سوچتے سمجھتے کیوں نہیں؟" (افلا تتذکرون)۔

حقیقت میں توحید کے تین مراحل جو اوپر والی آیت میں بیان ہوئے ہیں، ہر ایک مرحلہ ایک دوسرے کی دلیل شمار ہوتا ہے۔ توحید خالقیت، توحید حاکمیت کی دلیل ہے اور توحید حاکمیت ولی وشفیع ومعبود کی وحدانیت پر دلیل ہے۔

یہاں پر بعض مفسرین کے لیے ایک سوال پیش ہوتا ہے، جس کا جواب چنداں مشکل یا پیچیدہ نہیں ہے اور وہ یہ کہ آیت کا آخری جملہ کہتا ہے کہ خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست اور شفاعت کرنے والا نہیں ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارا ولی وشفیع صرف خدا ہے اور بس! تو کیا ممکن ہے کہ کوئی اپنے پاس سے کسی کی شفاعت کرے؟

① اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ تمام شفاعت کرنے والوں کو اس کی اجازت سے شفاعت کرنا چاہیئے۔ "من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ" (بقرہ۔ ۲۵۵) اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ شفاعت اگرچہ ہوتی انبیاء اور اولیاء الٰہی کی طرف سے ہے لیکن لوٹتی ذات پاک کی طرف ہے۔ شفاعت چاہے گناہوں کی بخشش کے لیے ہو یا نعمات الٰہی تک پہنچنے کے لیے۔

اس بات کی شاہد وگواہ وہ آیت ہے کہ جو ٹھیک اسی آیت کے مضمون میں سورۂ یونس کی ابتداء میں آئی ہے،

---

[1] اس بات کی مزید وضاحت تفسیر نمونہ جلد ۶ صفحہ ۱۰۰ (سورۂ اعراف آیہ ۵۴ کے ذیل میں مطالعہ کریں۔

اور ہم وہاں پڑھتے ہیں:

"یدبر الامر ما من شفیع الا من بعد اذنہ" (یونس-۳)

"کوئی شفاعت کرنے والا اس وقت تک شفیع کہلائے گا، جب اس ذات کی اجازت ہو گی"۔

(۲) اس امر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ ہم پروردگار کی بارگاہ میں توسل کے وقت اس کی صفات سے متوسل ہوتے ہیں اس کے رحمان، رحیم، غفار اور غفور ہونے اور اس کے فضل و کرم سے مدد چاہتے ہیں، گویا اس کے پاس خود ایسے ہی شفیع قرار دیتے ہیں۔ ہر چند کہ اس کی صفات اس کی عین ذات ہیں۔ پھر بھی ان صفات کو اپنے اور اس کی پاک ذات کے درمیان واسطہ شمار کرتے ہیں۔

یہی چیز دعائے کمیل میں حضرت علیؑ کی پُر معنی عبارت میں آئی ہے:

"واستشفع بک الی نفسک"

"میں تیرے ذریعہ تجھ سے شفاعت کا طلب گار ہوں"۔

(۳) "شفیع" سے مراد یہاں ناصر اور یار و یاور ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یار و یاور اور ناصر صرف خدا ہے، اور بعض لوگوں نے یہاں شفاعت کو آفرینش و خلقت اور تکمیل نفوس کے معنی میں لیا ہے تو یہ در حقیقت اسی معنی کی طرف لوٹتا ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں پہلے توحید پروردگار کی طرف اور پھر مسئلہ معاد کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو گذشتہ آیات میں توحید کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں (توحید خالقیت، توحید مالکیت، اور توحید عبودیت)، یہاں توحید ربوبیت کے ذکر سے وہ سلسلۂ گفتگو مکمل ہو جاتا ہے، یعنی جہانِ ہستی کا نظم و نسق صرف خدا ہی کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

فرماتا ہے "خدا اس جہان کے امور کو اپنے قرب کے مقام سے زمین کی طرف تدبیر کرتا ہے:" (یدبر الامر من السماء الی الارض)۔

دوسرے لفظوں میں خدا آسمان سے لے کر زمین تک تمام کائنات کو اپنے حیطۂ تدبیر اور نظم و نسق میں لیے ہوئے ہے اور اس کے علاوہ اس جہان کا کوئی مدبر نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے "پھر تدبیر امور کے لیے اس دن کہ جس کی مقدار ہزار سال ہے ان سالوں میں سے جنہیں تم شمار کرتے ہو، اس کی طرف لوٹے گا:" (ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون)۔

اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ مفسرین نے اوپر والی آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال پیش کیے ہیں۔ اور کئی احتمال

---

[1] پہلی تعبیر کے مطابق "سما" مقام قرب خدا کے معنی میں ہے اور دوسری تعبیر کے مطابق "سماء" اسی آسمان کے معنی میں ہے۔ (غور کیجئے گا)

پیش کیے ہیں:

۱۔ بعض نے اسے اسی دنیا میں تدبیر عام کے "قوس نزولی" اور "قوس صعودی" کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

۲۔ بعض خدائی فرشتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو آسمان و زمین کے درمیانی فاصلہ کو پانچ سو سال کی مدت میں طے کرتے اور اسی مدت میں واپس بھی آجاتے ہیں اور اس جہان کی تدبیر میں حکم خدا سے مشغول ہیں۔

۳۔ بعض اس عالم میں خدائی تدبیر کے دور کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ تدبیر کے مختلف ادوار ہیں اور پھر ایک دور کی مدت ایک ہزار سال ہے اور خدا ہر ہزار سال میں آسمان و زمین کے تدبیر امر کا اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے اور اس ہزار سالہ دور کے ختم ہونے پر دوسرے دور کا آغاز ہوجاتا ہے۔

یہ تفسیریں علاوہ اس کے کہ ناتمام اور مبہم مطالب کو پیش کرتی ہیں، کوئی قرینہ اور مخصوص شاہد بھی خود اس آیت یا دوسری آیات سے بھی پیش نہیں کرتیں۔

ہمارے نظریہ کے مطابق قرآن کی دوسری آیات کے قرینہ نیز ان روایات کی بنا پر جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں، اس آیت سے مراد کوئی اور چیز ہے اور یہ کہ خدا نے اس جہان کو خلق کیا ہے اور آسمان و زمین کو مخصوص تدبیر کے ساتھ نظم عطا کیا ہے اور انسانوں اور دوسرے زندہ موجودات کو لباس حیات پہنایا ہے۔ لیکن اس کائنات کے خاتمہ پر سب کچھ ختم کردے گا۔ سورج تاریک اور ستارے بے نور ہوجائیں گے اور قرآن کے بقول آسمانوں کو کاغذ کی طرح لپیٹ دے گا، یہاں تک کہ مذکورہ چیزیں اس جہان کے پھیلنے سے پہلے کی حالت میں آجائیں گی:

"یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب کما بدأنا اوّل خلق نعیدہ"[1]

"وہ دن کہ جب آسمان کو طومار کی طرح ہم لپیٹ دیں گے، پھر جس طرح ہم نے خلقت کا آغاز کیا تھا اسے واپس پلٹا دیں گے"

اور اس جہان کے لپیٹے جانے کے بعد ایک نئے نقشے اور زیادہ وسیع جہان کا اختراع ہوگا۔ یعنی اس دنیا کے اختتام پر ایک دوسرے جہان کا آغاز ہوگا۔

یہ معنی قرآن کی دوسری آیات میں بھی آیا ہے، منجملہ ان کے سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۵۶ میں ہم پڑھتے ہیں:

"انا للہ و انا الیہ راجعون"

"ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے"۔

اور سورۂ روم کی آیہ ۲۷ میں اس طرح آیا ہے:

"وھو الذی یبدؤا الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ"

"وہ وہی ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسے واپس پلٹا دیتا ہے اور یہ بات اس کے لیے نہایت

---

[1] سورۂ انبیاء، آیہ ۱۰۴۔

آسان ہے۔"

اور سورۂ یونس کی آیہ ۴ میں ہم پڑھتے ہیں:

" قل اللہ یبدؤا الخلق ثم یعیدہ فانی تؤفکون"

"کہہ دو خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو واپس لوٹاتا ہے، پھر تم کیوں حق سے روگرداں ہوتے ہو؟"

ان تعبیرات اور اس طرح کی دوسری تعبیرات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو کہتی ہیں کہ تمام امور آخرکار خدا کی طرف لوٹ جائیں گے:

"والیہ یرجع الامر کلہ" (سورۂ ہود آیۃ ۱۲۳)

واضح ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیت میں کائنات کے آغاز و انجام اور روز قیامت کے بپا ہونے کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جسے کبھی "قوس نزولی" اور "صعودی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ "خدا اس جہاں کے امر کی تدبیر آسمان سے زمین تک کرتا ہے۔ (آسمان سے ابتدا اور زمین پر انتہا ہوتی ہے) پھر یہ سب قیامت کے دن اس کی طرف پلٹ جائیں گے۔"

تفسیر علی بن ابراہیم" میں اسی آیت کے ذیل میں ہم پڑھتے ہیں کہ تدبیر امور سے مراد یہ ہے کہ خدا ان کی تدبیر کرتا ہے اور اس طرح امر دینی جو شریعت میں بیان ہوئے ہیں اور تمام بندوں کے اعمال یہ تمام چیزیں قیامت کے دن واضح ہوں گی اور اس دن کی مقدار اس دن کے سالوں کے حساب سے ہزار سال ہوگی۔[1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سورۂ معارج" کی آیت ۴ میں روز قیامت کے طول کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں:

" تعرج الملائکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ"

"فرشتے اور روح اس کی طرف عروج کریں گے، ایسے دن میں کہ جس کی مدت پچاس ہزار سال ہے۔"

تو کس طرح سے زیر بحث آیت کو جو اس کی مدت صرف ہزار سال معین کرتی ہے اور سورۂ معارج کی آیت کو آپس میں جمع کیا جا سکتا ہے!

اس سوال کا جواب اس حدیث میں موجود ہے جو "امالی شیخ طوسی" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

" ان فی القیامۃ خمسین موقفا، کل موقف مثل الف سنۃ مما تعدون، ثم تلا ھذہ الآیۃ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ۔"

" قیامت میں پچاس موقف (اعمال کی دیکھ بھال اور حساب کے لیے محل توقف) ہیں کہ جن میں سے ہر موقف ہزار سال کی مقدار ہے، ان سالوں میں جنہیں تم شمار کرتے ہو، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی، اس دن میں کہ جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔"

---

[1] "تفسیر نور الثقلین" جلد ۴ ص ۲۲۱ اور "تفسیر صافی" ذیل آیت زیر بحث۔

البتہ ان تعبیروں کا اس مطلب سے کوئی تضاد نہیں ہوگا، جب ہزار سال اور پچاس ہزار سال کا عدد یہاں گنتی کی صورت میں ہو۔ بلکہ ہر ایک میں کثرت اور زیادتی بیان کرنا مقصود ہو۔ یعنی قیامت میں پچاس موقف ہیں کہ جن میں سے ہر ایک پر انسان کو بہت زیادہ رکنا پڑے گا۔

چند ایک نکات

"یدبر الامر" کی آیت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہمارے زمانے کے کچھ خود ساختہ مسلک کے پیروکاروں نے اپنے مسلک کی توجیہ کے لیے اوپر والی آیت کو دستاویز قرار دیتے ہوئے عوام الناس کو فریب دینے اور مغالطہ میں ڈالنے کے لیے اس آیت کو اپنے مقصد پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان کے اکثر مبلغین سے جب انسان روبرو ہوتا ہے، منجملہ ان دلائل کے کہ جس کا وہ فوراً ڈوبتے کی طرح تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں، یہی آیت ہے (یدبر الامر من السماء الی الارض .....) وہ کہتے ہیں۔

"امر" سے مراد اس آیت میں "دین اور مذہب" ہے اور "تدبیر" دین کے بھیجنے کے معنی میں ہے اور "عروج" دین کو اٹھانے اور نسخ کرنے کے معنی میں ہے۔ اور اس حساب سے کوئی مذہب ایک ہزار سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا ہزار سال کے بعد اسے اپنی جگہ دوسرے مذہب کو دے دینی چاہیئے۔ اسی بناء پر وہ کہتے ہیں "ہم قرآن کو قبول کرتے ہیں" لیکن اسی قرآن کے مطابق ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد دوسرا مذہب آئے گا!

اب ہم چاہتے ہیں کہ ایک غیر جانب دار فرد کے عنوان سے مذکورہ آیت کا صحیح طریقے پر تجزیہ و تحلیل کریں اور دیکھیں کہ جس چیز کا یہ لوگ دعوے کرتے ہیں، آیا آیت کا بھی اس چیز سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ اس بات سے قطع نظر کہ یہ معنی آیت کے مفہوم سے اس قدر دور ہے کہ خالی الذہن پڑھنے والے کی فکر و ذہن میں آ بھی نہیں سکتا۔

خوب غور و خوض کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جس چیز پر وہ آیت کو مطابقت دینا چاہتے ہیں نہ صرف یہ کہ آیت کے مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں، بلکہ بہت سی جہات سے واضح اشکالات سے بھی دوچار ہے۔

① لفظ "امر" کو دین و مذہب کے معنی میں لینا نہ صرف یہ کہ اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ قرآن کی دوسری آیات بھی اس کی نفی کرتی ہیں۔ کیونکہ دوسری آیات میں "امر" فرمان، آفرینش و خلقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے؛

"انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون" (سورہ یٰس آیت ۸۲)

"اس کا امر تو بس یہ ہے کہ جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرے تو کہتا ہے ہو جا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے"۔

اس آیت میں اور "سورہ قمر" کی آیت ۵۰ اور "سورہ مومنون" کی آیت ۲۷، "سورہ اعراف" کی آیت ۵۴، "سورہ ابراہیم" کی آیت ۳۲ اور "سورہ نحل" آیت ۱۲، "سورہ روم" آیت ۲۵، اور "سورہ جاثیہ" آیت ۱۲ اور بہت سی دوسری آیات میں "امر" امر تکوینی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، نہ کہ دین و مذہب کی تشریع کے معنی میں۔

بنیادی طور پر جہاں آسمان وزمین اور آفرینش وخلقت وغیرہ کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے، امر اس معنی میں آتا ہے۔ (غور کیجئے گا)

(۲) لفظ "تدبیر" بھی خلقت وآفرینش اور کائنات کی وضع وکیفیت کو سنوارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ مذہب نازل کرنے کے معنی میں، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کی دوسری آیات میں (آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں) دین و مذہب کے بارے میں بالکل لفظ تدبیر استعمال نہیں ہوا، بلکہ لفظ "تشریع" یا "تنزیل" یا "انزال" استعمال ہوا ہے:

"شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحًا" (شوریٰ ۱۳)

تشریعت کا آغاز اس چیز سے ہوا جس کی نوح کو وصیت کی تھی۔"

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون"

"جو شخص خدا کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہ کافر ہے۔" (مائدہ ۴۴)

"نزّل علیک الکتاب بالحق مصدقًا لما بین یدیہ" (آل عمران ۳)

"برحق قرآن کو تجھ پر نازل کیا ہے، جو پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔"

(۳) محل بحث آیت سے پہلے اور بعد کی آیت عالم کی خلقت وآفرینش سے متعلق ہے، نہ کہ تشریع ادیان سے۔ کیونکہ قبل والی آیت میں چھ دن (دو دور) میں آسمان وزمین کی خلقت کے بارے میں گفتگو تھی اور بعد والی آیات میں خلقت انسان کے متعلق گفتگو تھی۔

کہے بغیر واضح ہے کہ آیات کی مناسبت تقاضا کرتی ہے کہ یہ آیت بھی جو آیات "خلقت" کے درمیان واقع ہوئی ہے، مسئلہ خلقت اور آفرینش کے انتظامی امور سے مربوط ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب سیکڑوں سال پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس آیت میں گوناگوں احتمالات کے باوجود کسی نے یہ احتمال نہیں دیا کہ یہ آیت تشریع ادیان سے مربوط ہے۔ مثلاً تفسیر "مجمع البیان" جو مشہور ترین اسلامی تفسیر ہے اور جس کے مؤلف کا تعلق سنہ چھ سو ہجری سے ہے اوپر والی آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے باوجود کسی بھی مسلم دانشور کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ اس آیت کا تعلق تشریع ادیان سے ہے۔

(۴) لفظ "عروج" "صعود کرنے اور اوپر جانے" کے معنی میں ہے، نہ کہ نسخ ادیان اور ان کے زائل ہونے کے معنی میں، اور قرآن میں کسی جگہ بھی "عروج" "نسخ" کے معنی میں نظر نہیں آیا یہ لفظ قرآن کی پانچ آیات میں ذکر ہوا ہے، لیکن کہیں بھی اس کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ ادیان کے بارے میں وہی لفظ "نسخ" یا "تبدیل" وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر ادیان اور کتب آسمانی کوئی ایسی چیز نہیں جو مثلاً ارواح بشر کی طرح اختتام زندگی کے بعد فرشتوں کے ساتھ آسمان کی طرف پرواز کر جائیں، بلکہ نسخ شدہ دین اسی زمین پر موجود ہیں، ان کے صرف چند ایک مسائل منسوخ ہوئے ہیں، جبکہ ان کے اصول اپنی قوت کے ساتھ باقی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ لفظ "عروج" باوجودیکہ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی نسخ ادیان کے معنی میں استعمال نہیں ہوا،

اصولی طور پر نسخ ادیان کے مفہوم کے ساتھ سازگار بھی نہیں ہے، کیونکہ منسوخ ادیان آسمان کی طرف عروج نہیں کرتے۔

⑤ ان سب کے علاوہ یہ معنی واقعیت عینی کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔ گذشتہ ادیان کا ایک دوسرے سے فاصلہ کہیں پر بھی ایک ہزار سال نہیں تھا۔

مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کے درمیان کا فاصلہ ۱۵۰۰ سال سے زیادہ تھا اور حضرت عیسیٰ اور پیغمبر اسلام کے ظہور کا فاصلہ ۶۰۰ سو سال سے کم تھا۔

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ان لوگوں کے قول کے مطابق ان دونوں میں سے کوئی فاصلہ بھی ہزار سال کا نہیں بلکہ زیادہ بھی ہے۔

ایک اولو العزم نبی اور مخصوص شریعت کے بانی حضرت "نوحؑ" کا اولوالعزم شریعت کے دوسرے بانی اور بت شکن مبیر و حضرت ابراہیم کے درمیان ۱۴۰۰ سال سے زیادہ فاصلہ ہے اور اسی طرح حضرت "ابراہیمؑ" اور حضرت "موسیٰؑ" کے درمیان فاصلہ ۵۰۰ سال سے کم لکھا ہے۔

اس موضوع سے ہم یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ نمونہ کے طور پر بھی گذشتہ مذاہب و ادیان کا ایک دوسرے کے ساتھ کا فاصلہ ایک ہزار سال نہیں تھا۔ "تو خود حدیث مفصل بخوان ازیں مجمل"

⑥ ان سب باتوں سے قطع نظر سید علی محمد باب کے جس دعوے کے لیے یہ سب لوگ ناروا توجیہات کے متحمل ہوئے ہیں، اس حساب سے بالکل سازگار نہیں ہے، کیونکہ خود انہیں کے اعتراف کے مطابق اس کے دعوے کی ابتداء ۱۲۶۰ ہجری قمری میں تھی۔ اور اس بات کے پیش نظر کہ پیغمبر اسلام کی دعوت کی ابتداء ہجرت سے ۱۳ سال قبل تھی تو ان دونوں کے درمیان فاصلہ ۱۲۷۳ سال بنتا ہے، یعنی ہزار سال سے ۲۷۳ سال زائد بنتے ہیں۔ اب وہ خود ہی بتائیں کہ ہم کس نقشے کے تحت ان ۲۷۳ سالوں کو ادھر اُدھر کریں؟ اور کس طرح اتنے بڑے عدد کو نظر انداز کر دیں؟

⑦ اور فرض کیجیے کہ ہم ان چھ اعتراضات کو بھی ایک طرف کیے دیتے ہیں اور اس قدر واضح اور روشن تجزیات کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور صرف عقل و خرد کو فیصلہ کے لیے بلاتے ہیں اور فرض کرتے ہیں کہ قرآن کے بجائے چاہتے ہیں کہ نبوت کے نئے دعوے داروں کے سامنے آنے والے لوگوں کی ذمہ داری کو واضح کریں اور کہیں کہ "ہزار سال گزرنے کے بعد نئے پیغمبر کے انتظار میں رہو"! تو کیا اس کا یہی راستہ تھا، جیسا مذکورہ آیت میں ذکر ہوا ہے، مطلب کو بیان کریں اور بارہ تیرہ صدیوں تک کوئی عالم اور غیر عالم اس آیت کے معنی سے ذرہ برابر بھی مطلع نہ ہو سکے اور ۱۲۷۳ سال گزرنے کے بعد صرف ایک گروہ "کشف جدید" کے عنوان سے جو صرف اور صرف اس کے نزدیک ہی قابل قبول ہے، اس سے پردہ اُٹھائے

کیا زیادہ عقل مندی کی بات نہیں تھی کہ اس جملہ کی جگہ پر یوں کہا جاتا: "تمہیں میں بشارت دیتا ہوں کہ ایک ہزار سال کے بعد ایک پیغمبر اس نام کا ظہور کرے گا۔"

جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے پیغمبر اسلام کے متعلق کہا:

" ومبشرًا برسول یأتی من بعد اسمه احمد "

(سورۂ صف آیہ ۶)

بہر حال شاید یہ اس حد تک جتنا ہم نے بحث کی ہے، بحث کا محتاج نہ ہوتا، لیکن مسلمانوں کی نوجوان نسل کو عالمی استعمار کے ہتھکنڈوں اور اسلام کے مورچوں کو کمزور کرنے اور نقصان پہنچانے والے ساختہ مسالک کی چالوں سے خبردار کرنے کے لیے قدرے تفصیلی گفتگو کی تاکہ وہ ان کی اس منطق کے صرف ایک گوشہ سے باخبر ہو جائیں اور باقی کا وہ خود حساب کریں۔

۶۔ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝
۷۔ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝
۸۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝
۹۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۔ وہ وہی خدا ہے کہ مخفی و آشکار سے باخبر ہے اور ناقابل شکست اور مہربان ہے۔
۷۔ وہ وہی ہے، جس نے جس چیز کو پیدا کیا، اچھا پیدا کیا اور خلقتِ انسان کی ابتدا مٹی سے قرار دی۔
۸۔ پھر اس کی نسل کو ناچیز اور بے قدر و قیمت پانی کے نچوڑ سے خلق کیا۔
۹۔ پھر اس کے بدن کو موزوں بنایا اور اپنی روح میں سے اس میں پھونکا

اور تمھارے لیے کان آنکھیں اور دل قرار دیئے، لیکن تم بہت کم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہو۔

تفسیر

خلقت انسان کے حیران کُن مراحل:

زیر بحث آیات پہلے تو اشارہ اور تاکید ہیں، ان توحیدی مباحث پر جو پہلے کی آیات میں گزر چکی ہیں جو چار مراحل میں خلاصہ ہوتی ہیں (توحید خالقیت، حاکمیت، ولایت اور ربوبیت) فرماتا ہے: "وہ جیسے کہ ان صفات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، وہی ہے خدا کہ جو مخفی و آشکار سے باخبر ہے اور ناقابل شکست اور مہربان ہے" (ذالک عالم الغیب والشھادۃ العزیز الرحیم)۔

ظاہر ہے جو چاہتا ہے کہ آسمان و زمین کے امور کی تدبیر کرے اور ان پر حاکم اور ولایت، شفاعت اور خلاقیت کے قیام کا ذمہ دار ہو، اسے تمام چیزوں کے پنہاں و آشکار سے آگاہ ہونا چاہیئے، کیونکہ آگاہی اور وسیع علم کے بغیر ان امور میں سے کوئی بھی امکان پذیر نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایسی ذات کو "عزیز" (قدرت مند اور ناقابل شکست) ہونا چاہیئے۔ تاکہ ان اہم کاموں کو انجام دے سکے۔

لیکن ایسی عزت و قدرت جو سنگدلی سے ملی ہوئی نہ ہو بلکہ رحمت اور لطف و کرم سے جڑواں ہو۔

بعد والی آیت بطور عموم آفرینش کے نظام احسن کی طرف بطور خاص اور خلقت انسان کے آغاز اور اس کے ارتقائی مراحل کی طرف بطور عام اشارہ ہے اور فرماتا ہے "وہ وہی ہے جس نے جس چیز کو پیدا کیا بہت اچھا پیدا کیا" (الذی احسن کل شیء خلقہ)۔

ہر چیز کو جس شے کی ضرورت تھی اس نے دی، دوسرے لفظوں میں خلقت کے عظیم عمل کی بنیاد کو "نظام احسن" یعنی ایسے نظم و ضبط پر استوار کیا، جس سے زیادہ کامل کا تصور نہیں ہو سکتا تھا۔

تمام موجودات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی اور ہر ایک کو وہی کچھ عطا فرمایا جو وہ زبان حال سے چاہتا تھا۔

اگر انسان کے وجود پر نگاہ کریں اور اس کے بدن کے مختلف کارخانوں میں سے ہر ایک کو مدنظر رکھیں تو معلوم ہوگا، کہ وہ ساخت، حجم، سالموں کی وضع اور کیفیت ان کی طرز کار بالکل اسی طرح خلق کیے گئے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کو احسن طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اعضاء کے درمیان اس طرح مربوط نظام اور ہم آہنگی عطا کی ہے کہ وہ سب بغیر استثناء کے یا تو

ایک دوسرے پر موثر ہوتے ہیں اور یا ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔

اور یہی معنی بطور کلی تمام عالم پر حکم فرما ہے، باوجود یکہ اس کی مخلوقات خصوصاً زندہ موجودات کی دنیا میں تنوع پایا جاتا ہے اور بڑا فرق بھی۔

خلاصہ

دھندہ ای کہ بہ گل نکہت و بہ گل جان داد
بہر کہ آنچہ سزا دید حکمتش آن داد!

وہ جس نے پھول کو خوشبو اور مٹی میں رُوح پھونکی جو جس چیز کے لائق تھا، خالق حکمت نے اسے وہی کچھ دیا، جی ہاں وہی ہے جو پھولوں کو انواع واقسام کی دل انگیز خوشبوئیں عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو خاک اور مٹی کو رُوح اور جان دیتا ہے اور اس سے ایک آزاد اور باہوش انسان کو پیدا کرتا ہے اور اسی سیاہ مٹی سے کبھی انواع واقسام کے پھول کبھی انسان اور کبھی دوسرے موجودات کی انواع پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خود مٹی کو بھی اپنی حد تک جس چیز کا حامل ہونا چاہئے، اسی کی حامل ہے۔

اسی طرح کی گفتگو ہم سورۂ طٰہٰ کی آیت ۵۰ میں حضرت موسیٰ و ہارون کے قول سے پڑھتے ہیں:

"ربنا الذی اعطی کل شیء خلقہ ثم ھدٰی" (سورۂ طٰہٰ)

"ہمارا پروردگار تو وہ ہے، جس نے ہر موجود کو جو کچھ اس کی آفرینش کے لیے ضروری تھا عطا کیا اور پھر اس کی تمام مراحل وجود میں رہبری کی"۔

یہاں پر ایک سوال برائیوں کی خلقت اور "کائنات کے احسن نظام" کے ساتھ سازگاری کی کیفیت کے بارے میں سامنے آتا ہے، جسے ہم انشاء اللہ نکات کی بحث میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

اس کے بعد قرآن "آفاق" کے مقدمہ اور تمہید کو ذکر کرنے کے بعد "انفس" کی بحث میں وارد ہوتا ہے۔ اور جس طرح آفاقی آیات کی بحث میں توحید کی مختلف اقسام کے بارے میں گفتگو کی تھی، یہاں انسان کے بارے میں چند عظیم نعمتوں کی بات کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے "خدا نے انسان کی خلقت کی ابتدا مٹی سے فرمائی" (وبدأ خلق الانسان من طین)۔

تاکہ اس سے ایک طرف تو اپنی قدرت کی عظمت بھی بیان کرے کہ اس قسم کی برجستہ مخلوق کو اس طرح کے سادہ اور معمولی قیمت کے موجود سے خلق کیا ہے اور اس "دل آویز" نقش کو "پانی اور مٹی" سے خلق فرمایا ہے۔

اور اس انسان کو تنبیہ اور خبردار بھی کرے کہ تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟

واضح رہے کہ یہ آیت "آدم" کی خلقت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے، نہ کہ تمام انسانوں کے بارے میں کیونکہ ان کی نسل کو جاری رکھنا بعد والی آیت میں پیش کیا گیا ہے اور اس آیت کا ظہور واضح دلیل ہے، انسان کی مستقل خلقت اور اکم از کم نوع انسانی کے بارے میں (تحول انواع کے مفروضہ کی نفی کے لیے یعنی نظریہ ارتقاء کی نفی کی ہے۔

اگرچہ بعض لوگوں نے اس آیت کی اس طرح تفسیر کرنا چاہی ہے کہ وہ انواع کے ارتقاء کے ساتھ بھی سازگار ہو۔ کیونکہ انسان کی خلقت پست تر انواع کی طرف لوٹتی ہے اور پھر وہ پانی اور مٹی پر جاکر ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن آیت کی ظاہری تعبیر یہ ہے کہ "آدم" اور "مٹی" کے درمیان دوسری بے شمار انواع زندہ موجودات کا فاصلہ نہیں تھا بلکہ انسان کی خلقت بغیر کسی واسطہ کے مٹی سے ہی صورت پذیر ہوئی ہے۔

البتہ قرآن نے دوسری جاندار انواع کے بارے میں گفتگو نہیں کی ہے۔

یہ معنی سورۂ آل عمران کی آیت ۵۹ کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیادہ واضح ہو جاتا ہے، جہاں وہ کہتا ہے:

" ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب " (آل عمران)

"عیسٰی کی باپ کے بغیر خلقت کوئی عجیب چیز نہیں ہے وہ آدم کی خلقت کی طرح ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا"۔

اور سورۂ حجر کی آیہ ۲۶ میں فرماتا ہے:

" ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون "

"ہم نے انسان کو خشک مٹی سے کہ جو بدبودار مٹی سے پیدا ہوئی تھی بنایا ہے"۔

ان تمام آیات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدم کی خلقت ایک مستقل مخلوق کی صورت میں خشک اور گیلی مٹی سے وجود میں آئی ہے۔ اور سب کو معلوم ہے کہ تحول انواع کا مفروضہ ہرگز ایک قطعی و یقینی علمی مسئلہ کی صورت اختیار کیے ہوئے نہیں ہے تاکہ ہم اوپر والی آیات کے ساتھ اس کے تضاد کی وجہ سے ان کی کسی اور طرح سے تفسیر کریں، دوسرے لفظوں میں جب تک واضح قرینہ ظواہر آیات کے برخلاف موجود نہ ہو تو انہیں ان کے ظاہری معنی پر ہی تطبیق کرنا ہوگی اور آدم کی مستقل خلقت کا مطالعہ بھی بالکل یہی ہے۔

بعد والی آیت نسل انسانی کی خلقت اور اولادِ آدم کی ولادت کے بعد کے مراحل کی کیفیت کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: "پھر خدا نے اس کی نسل کو ناچیز اور بے قدر پانی کے نچوڑنے سے قرار دیا" (ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین)۔

یہاں "جعل" دراصل خلقت کے معنی میں ہے۔ اور "نسل" اولاد اور تمام مراحل میں اولاد در اولاد کے معنی میں ہے۔

"سلالہ" اصل میں ہر چیز کا خالص اور نچوڑ کے معنی میں ہے اور یہاں پر مراد آدمی کا نطفہ ہے۔ جو حقیقت میں اس کے کل وجود کا نچوڑ ہوتا ہے اور اولاد کی پیدائش مبدا اور نسل کو جاری رکھنے کا منبع ہے۔

یہ پانی جو ظاہراً بے قدر و قیمت اور اپنی ساخت اور اس میں تیرنے والے حیاتیاتی سالموں کے لحاظ سے اور اس طرح مخصوص مائع اور سیال ترکیب کے لحاظ سے کہ جس میں سالمے تیرتے رہتے ہیں، بہت ہی ظریف اور حد سے زیادہ پیچیدہ ہے اور عظمت پروردگار اور اس کے علم و قدرت کی نشانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور لفظ "مہین" جو ضعیف، حقیر اور ناچیز کے معنی میں ہے، اس کی ظاہر وضع اور کیفیت کی طرف اشارہ ہے ورنہ یوں تو مرموز ترین موجودات میں سے ہے۔

بعد والی آیت رحم کی دنیا میں انسانی ارتقاء کے پیچیدہ اور اسی طرح ان مراحل کی طرف اشارہ ہے، جو آدم نے

مٹی سے خلقت کے وقت طے کیے تھے، فرماتا ہے: "پھر انسان کے بدن کو موزوں بنایا" (ثم سواہ)۔

"اور اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا" (ونفخ فیہ من روحہ)۔

"اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل قرار دیئے" (وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ)۔

"لیکن بہت کم تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہو" (قلیلاً ما تشکرون)۔

"سواہ" مادہ "تسویہ" سے تکمیل کرنے کے معنی میں ہے اور یہ ان تمام مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں انسان نطفہ کی صورت سے لے کر اس مرحلہ تک جبکہ اس کے بدن کے تمام اعضاء ظاہر ہوتے ہیں طے کرتا ہے اور اسی طرح وہ مراحل کہ جو آدم نے مٹی سے خلق ہونے سے لے کر نفخ رُوح تک طے کیے تھے۔[1]

"نفخ" (پھونکنے) کی تعبیر رُوح کے آدمی کے بدن میں رُوح کے حلول سے کنایہ ہے، گویا اسے ہوا اور تنفس سے تشبیہ دی گئی ہے، اگرچہ نہ یہ معنی مراد ہے اور نہ وہ۔

اور اگر کہا جائے کہ انسان کا نطفہ تو ابتدا ہی سے، جب کہ وہ رحم میں قرار پاتا ہے اور اس سے پہلے بھی تو ایک زندہ موجود ہے، تو پھر اس بنا پر نفخ رُوح کا کیا معنی ہے؟

تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ابتدا میں جب نطفہ منعقد ہوتا ہے تو صرف ایک قسم کی حیاتِ نباتی کا حامل ہوتا ہے، یعنی صرف غذا حاصل کرتا اور نشوونما پاتا ہے، لیکن نہ تو اس میں حس و حرکت جو "حیات حیوانی" کی نشانی ہے اور نہ ہی قوت ادراک جو "حیاتِ انسانی" کی نشانی ہے، موجود ہوتی ہے۔

لیکن رحم میں نطفہ کا ارتقاء اس مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ حرکت کرنے لگتا ہے اور تدریجاً دوسری انسانی طاقتیں اس میں زندہ ہو جاتی ہیں اور یہ وہی مرحلہ ہے، جسے قرآن نفخ رُوح سے تعبیر کرتا ہے۔

"رُوح" کی "خدا" کی طرف اضافت اصطلاح کے مطابق "اضافت تشریفی" ہے یعنی ایک زبردست قیمتی اور با شرافت رُوح جو اس قابل ہے کہ اسے رُوحِ خدا کا نام دیا جائے انسان میں پھونکی جاتی ہے اور یہ بات اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان اگرچہ "مادی جہات" کے لحاظ سے "تاریک مٹی" یا "بے قدر و قیمت پانی" سے ہے۔ لیکن معنوی اور روحانی لحاظ سے "روح الٰہی" کا حامل ہے۔

ایک طرف تو اس کا وجود مٹی پر اور دوسری طرف عرش پروردگار پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور ایک حیران کن معجون ہے۔

---

[1] قابل توجہ یہ ہے کہ بعض نے اس آیت کو صرف جنینی ارتقاء کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعض نے احتمال دیا ہے ممکن ہے کہ آدم کے مٹی سے پیدا ہونے کے بعد جو مراحل طے کئے ہیں، صرف اس کی ناظر ہو کیونکہ قرآن کی دوسری آیات میں بعینہٖ یہی تعبیرات خلقت آدم کے بارے میں آئی ہیں، لیکن دونوں کی طرف لوٹے تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ آدم کی مٹی سے خلقت بھی اور نطفہ کے پانی سے بھی اس کی نسل نے بھی ان مراحل کو طے کیا ہے اور طے کرتے رہتے ہیں۔

"کز فرشتہ سرشتہ و ز حیوان" (فرشتہ اور حیوان کا معجون مرکب ہے) اور ان دو پہلوؤں کے حامل ہونے کی وجہ سے اس میں قوس صعودی و نزولی اور تکامل و انحطاط حد سے زیادہ وسیع ہے۔[1]

قرآن کے آخری مرحلہ میں جو خلقت انسان کا پانچواں مرحلہ شمار ہوتا ہے، کان اور آنکھ اور دل ایسی نعمتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، البتہ یہاں مقصد ان اعضا کی خلقت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خلقت تو نفخ روح سے پہلے صورت پذیر ہوتی ہے، بلکہ مراد سننے، دیکھنے اور درک و خرد کی حس ہے۔

یہ جو تمام "ظاہری" اور "باطنی" حواس میں سے صرف ان تین پر اکتفا کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اہم ترین ظاہری حواس جو انسان اور اس کی بیرونی دنیا کے درمیان طاقت ور رابطہ قائم کرتے ہیں، وہ کان اور آنکھ ہیں۔ کان آوازوں کا ادراک کرتے ہیں ـــ خاص کر تعلیم و تربیت ان کے ذریعے ہی انجام پاتے ہیں اور آنکھ بیرونی دنیا اور اس عالم کے مختلف مناظر کے دیکھنے کا ذریعہ ہے۔

اور عقل و خرد کی قوت انسان کے باطنی حواس میں سے اہم ترین حس ہے، جو دوسرے لفظوں میں وجود بشر پر حکمران ہے۔

جالب توجہ یہ کہ "افئدۃ" "فؤاد" کی جمع ہے کہ جو قلب (دل) کے معنی میں ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ظریف و عمدہ معنی رکھتا ہے۔ یہ لفظ عام طور پر وہاں بولا جاتا ہے، جہاں "افروختگی" (روشنی) اور "پختگی" ہو۔

اور اس طرح سے خدا نے اس آیت میں شناخت اور معرفت کے اہم ترین آلات جو انسان کے وجود کے "ظاہر" و "باطن" میں ہیں، بیان کیے ہیں کیونکہ علوم انسانی یا تو "تجربہ" کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، اور اس کا ذریعہ آنکھ اور کان ہیں۔

اور یا "عقلی تجزیہ و تحلیل اور استدلالات" کے ذریعہ ہوتا ہے اور ان کا ذریعہ عقل و خرد ہے کہ قرآن میں وہ "افئدہ" سے تعبیر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ادراکات جو وحی، اشراق اور شہود کے طریقہ سے قلب انسان میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔ وہ بھی انہی "افئدہ" کے وسیلہ سے ہوتے ہیں۔

اگر شناخت اور پہچان کے یہ ذرائع انسان سے چھین لیے جائیں تو اس کے وجود کی قدر و قیمت مٹھی بھر خاک اور سنگریزوں کی حد تک سقوط کر جائے گی۔ اسی بنا پر زیر بحث آیت کے آخر میں انسانوں کو ان عظیم نعمتوں کی شکر گزاری کے مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے۔ بہت کم اس کا شکر بجالاتے ہو، جو اس طرف اشارہ ہے کہ جس قدر بھی ان عظیم نعمتوں کا شکر بجالاؤ یہ پھر بھی کم ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۰ میں سورۃ حجر کی آیت ۲۹ کے ذیل میں بھی ہم بحث کر چکے ہیں۔

ایک نکتہ

مٹی سے آدمؑ کی خلقت کی کیفیت: اگرچہ قرآن کی مختلف آیات میں کبھی تو "مٹی" سے انسان کی خلقت کی گفتگو کی ہے (جیسے اوپر والی آیات میں) سورۂ اسراء کی آیت ۶۱ میں آدم و ابلیس کی داستان میں آیا ہے:

"فسجدوا الا ابلیس قال ءاسجد لمن خلقت طینًا"

"تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے کہا، کیا میں اس کو سجدہ کروں جو مٹی سے پیدا شدہ ہے"؟ (سورۂ اسراء، ۶۱)

اور کبھی "پانی" سے خلقت کی گفتگو کی ہے۔ مثلاً "وجعلنا من الماء کل شیء حی"

(انبیاء، ۳۰)

لیکن واضح رہے کہ یہ سب چیزیں ایک ہی مطلب کی طرف لوٹتی ہیں، یہاں تک کہ وہ جگہ بھی کہ جہاں آدمؑ کی "تراب" (مٹی) سے خلقت کی گفتگو ہے "ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب" (آل عمران - ۵۹) کیونکہ مراد گیلی مٹی ہے۔ (یعنی گارا ہے)۔

یہاں پر دو نکتے واضح ہو جاتے ہیں:

① جن لوگوں نے احتمال یہ دیا ہے کہ انسان کی مٹی سے خلقت سے مراد یہ ہے کہ افرادِ بشر نباتات سے براہ راست یا غیر مستقیم طور پر غذا حاصل کرتے ہیں اور نباتات بھی سارے مٹی سے ہیں ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں اور زیر بحث آیات کے قرینہ سے "خود آدم" کی خلقت کی طرف اشارہ ہیں جو مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔

② یہ تمام آیات "نظریۂ ارتقاء" کی نفی پر دلیل ہیں (کم از کم انسان کے بارے میں)، اور نوعِ بشر جو "آدم" پر منتہی ہوتی ہے ایک مستقل خلقت کی حامل ہے۔

اور جن لوگوں نے یہ گمان کیا کہ مٹی سے خلقت والی آیات نوعِ انسانی کی طرف ہیں جو ہزارہا اسطوں سے اکیلے اور طاق سالمے والے موجودات کی طرف لوٹتی ہیں، اور وہ آخری مفروضات کی بنا پر سمندروں کے ساحلوں کی دلدل سے وجود میں آئے ہیں۔

باقی رہے خود حضرت آدم وہ ایک فرد تھے کہ جنہیں نوعِ بشر کے درمیان سے منتخب کیا گیا۔ لیکن وہ کوئی مستقل خلقت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان کا امتیاز ان کے مخصوص صفات سے تھا، کسی طرح بھی آیاتِ قرآنی کے ظاہر سے سازگار نہیں ہے۔

ہم ایک بار پھر تاکید کرتے ہیں کہ تحول انواع کا مسئلہ کوئی مسلم علمی قانون و کلیہ قاعدہ نہیں ہے، بلکہ صرف ایک مفروضہ ہے کیونکہ وہ چیز کہ جس کے ڈانڈے کئی لاکھ سال قبل قاعدہ تک جا ملتے ہیں، جو یقیناً قابل تجربہ اور مشاہدہ نہیں ہے اور نہ ہی ثابت شدہ

علمی قوانین کی صف میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بلکہ ایک ایسا مفروضہ ہے کہ جو مختلف انواع و اجناس کے ظہور کی توجیہ کے لیے وجود میں آیا ہے اور اس کی قدر و قیمت صرف اسی قدر ہے کہ وہ عالم میں ظہور پذیر ہونے والی چیزوں کی اندازا توجیہ کرتے ہیں۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ مفروضے ہمیشہ ایک حال پر باقی نہیں رہتے، بلکہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور نئے مفروضے ان کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔

اسی بناء پر کبھی بھی ایسے مفروضوں پر فلسفی مسائل کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی، کیونکہ فلسفی مسائل کی بنیادیں ٹھوس اور محکم ہوتی ہیں۔

ہم ارتقاء انواع کے مفروضہ کی بنیادوں اور ان کے غیر مستحکم ہونے کے بارے میں جلد ۱۱ صفحہ ۶۲ کے بعد کے صفحات "قرآن اور خلقت انسان" کے عنوان کے تحت سورۂ حجر کی آیت ۲۸ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

اس بحث کے آخر میں اس نکتہ کی یاد آوری ضروری سمجھتے ہیں کہ ارتقاء کے مفروضہ کا مسئلہ "توحید اور خدا شناسی" سے کسی قسم کا کوئی ارتباط نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ ماورا طبیعت عالم کی نفی پر دلیل شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ اعتقاد توحیدی کہتا ہے کہ کائنات خدا کی طرف سے خلق ہوئی ہے اور خدا نے اسے موجودات کے تمام خواص عطا کیئے ہیں اور خدا کی طرف سے تمام مراحل میں ان پر فیض نازل ہوتا ہے۔ اس معنی کو "ثبوت انواع" کے نظریہ کا مقصد بھی اسی طرح قبول کر سکتا ہے، جس طرح تحول انواع کے مفروضہ کا کوئی معتقد قبول کرتا ہے۔ صرف ایک مشکل جس سے تحول کا مفروضہ دوچار ہے، یہ کہ وہ اس تفصیل کے ساتھ میل نہیں کھاتا، جسے قرآن نے خلقت آدم کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اس کی تخلیق مٹی اور گارے سے ہوئی ہے۔

اس بناء پر ہم ارتقاء کے نظریہ کی صرف اسی دلیل سے نفی کرتے ہیں نہ کہ مسئلہ توحید کی مخالفت کی بناء پر۔ یہ بات تو تھی تفسیری لحاظ سے۔

رہا علمی (سائنسی) اعتبار سے، تو اس کی نفی کا تعلق، چونکہ اس کے ثبوت کے لیے قطعی دلائل موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا ہم اس لحاظ سے بھی اس کی نفی کرتے ہیں۔

۱۰۔ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۜ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝

۱۱۔ قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝

۱۲۔ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝

۱۳۔ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝

۱۴۔ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ۫ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۰۔ انھوں نے کہا کیا جس وقت ہم مر جائیں گے اور زمین میں گم ہو جائیں گے تو نئی زندگی پالیں گے ؟ لیکن وہ تو اپنے پروردگار کی ملاقات کا انکار

کرتے ہیں (اور چاہتے ہیں کہ معاد کے انکار سے آزاد ہو جائیں اور اپنی ہوس رانی کو جاری وساری رکھیں)۔

۱۱۔ کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مامور ہوا ہے، تمھاری (رُوح کو) قبض کرلے گا، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

۱۲۔ اور اگر تم ان لوگوں کو دیکھو، جس وقت کہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سر نیچے کیے ہُوئے کہیں گے، پروردگار! جو کچھ تو نے وعدہ کیا تھا، ہم نے اسے دیکھا اور سُنا ہے، ہمیں واپس پلٹا دے، تاکہ ہم عمل صالح بجا لائیں، ہم قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔

۱۳۔ اگر ہم چاہتے تو ہر انسان کو (جبری طور پر اور) لازمی ہدایت دیتے۔ لیکن ہم نے (انھیں آزاد چھوڑ رکھا ہے اور) مقرر کیا ہے کہ دوزخ کو (بے ایمان اور گناہگار) جن وانس سے بھر دیں۔

۱۴۔ (اور ان سے کہو کہ عذاب جہنم کو) چکھو۔ اس لیے کہ آج کی ملاقات کو تم نے فراموش کر دیا تھا، ہم نے بھی تمھیں فراموش کیا ہے اور ہمیشہ کے عذاب کو ان اعمال کی وجہ سے چکھو جو تم نے انجام دیئے ہیں۔

تفسیر

ندامت اور بازگشت کا تقاضا:

یہ آیات معاد کے بارے میں ایک بولتی ہوئی ناطق بحث کے ساتھ شروع ہو رہی ہیں۔ اس کے دوسرے جہان

میں "مجرمین" کی حالت کو بیان کرتا ہے اور مجموعی طور پر گذشتہ بحثوں کی تکمیل ہے جو "مبداء" کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "مبداء و معاد" کی بحث قرآن مجید میں عام طور پر ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے۔

پہلے کہتا ہے "انہوں نے کہا کیا جس وقت ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے اور زمین میں گم ہو گئے تو نئی پیدائش پائیں گے" (وقالوا ءاذا ضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید)۔

"زمین میں گم ہو جانے" کی تعبیر (ضللنا فی الارض) اس طرف اشارہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد پانی مٹی کی طرح خاک ہو جاتا ہے اور اس کا ہر ذرہ عوامل طبیعی اور غیر طبیعی کی بناء پر ایک گوشہ میں جا پہنچتا ہے اور پھر اس کی کوئی چیز بھی باقی نظر نہیں آتی تاکہ اسے قیامت میں دوبارہ پلٹانے کا یقین دلائے۔

لیکن حقیقت میں وہ اپنے اس کام سے قدرت خدا کے منکر نہیں ہیں "بلکہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات کا انکار کرتے ہیں" (بل ھم بلقاء ربھم کافرون)۔

وہ چاہتے ہیں کہ پروردگار کی ملاقات کے مرحلہ کا انکار کریں جو حساب و کتاب اور ثواب و عقاب کا مرحلہ ہے اور اس کے بعد عمل میں آزادی حاصل کریں تاکہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں انجام دیں۔

درحقیقت یہ آیت سورۂ قیامت کی پہلی آیات سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے جہاں قرآن نے کہا ہے:

"ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامہ بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوی بنانہ بل یرید الانسان لیفجر امامہ یسئل ایان یوم القیامۃ"

"کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اس کی پراگندہ اور بکھری ہوئی ہڈیوں کو ہم جمع نہیں کر سکیں گے؟ ہم تو یہاں تک قادر ہیں کہ تمہاری انگلیوں کے پوروں (کے خطوط) پہلے نظام کی طرف پلٹا دیں، لیکن انسان کا ہدف و مقصد یہ ہے کہ وہ دن جو اس کے سامنے ہے (انکار قیامت کرکے) فسق و فجور اور گناہ کے ساتھ گزار دے۔ اس لیے پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی" (سورۂ قیامت ۳ تا ۶)

اس بناء پر وہ استدلال کے لحاظ سے لولے لنگڑے نہیں بلکہ ان کی تن آسانی نے ان کے دل پر حجاب ڈال رکھا ہے اور ان کی بُری نیتیں مسئلہ معاد کے قبول کرنے سے مانع ہیں۔ ورنہ وہی خدا جس نے مقناطیس کو یہ اثر بخشا ہے کہ لوہے کے بہت ہی چھوٹے ذرات کو جو منوں مٹی کے اندر چھپے ہوتے ہیں، انھیں ایک گردش سے اپنی طرف جذب کر کے آسانی کے ساتھ انھیں جمع کر لیتا ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ انسان کے جسم کے ذرات کے درمیان بھی اس قسم کی کشش پیدا کر دے؟

کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ ایک انسان کے جسم میں موجود مختلف پانی (اور جسم انسانی کا اکثر حصہ پانی پر ہی مشتمل ہے) اور اسی طرح اس کے غذائی مواد میں سے ہر ایک، مثلاً ایک ہزار سال قبل اس کی ہر ہر جز اس عالم کے کسی گوشہ میں بکھری پڑی تھی۔ ہر قطرہ ایک سمندر میں اور ہر ذرہ ایک اقلیم اور براعظم میں، لیکن وہ بادل و بارش اور دوسرے قدرتی عوامل کے ذریعے جمع ہوئے اور آخرکار وجود انسان کو تشکیل دیا، تو کونسا مقام تعجب ہے کہ پراگندہ اور منتشر ہونے کے بعد دوبارہ پہلی حالت کی طرف پلٹ آئیں اور ایک دوسرے سے آملیں؟

بعد والی آیت ان کا جواب ایک دوسرے طریقے سے دیتی ہے، کہتی ہے" یہ تصور نہ کرو کہ تمہاری شخصیت تمہارے اس جسمانی بدن کے ساتھ ہے بلکہ تمہاری شخصیت کی اساس و بنیاد کو تمہاری "روح" تشکیل دیتی ہے اور وہ محفوظ ہے "کہہ دے کہ موت کا فرشتہ جو تم سب پر مقرر کیا ہے تمہاری (روح) قبض کرتا ہے، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جاتے ہو" (قل یتوفاکم ملک الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون)۔

" یتوفاکم" کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو مادہ " توفی" (بروزن تصدی) اس ہے واپس لینے کے معنی میں ہے۔ موت فنا اور نابودی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ فرشتے کے ایک طرح سے آدمی کی روح کو قبضے میں لے لینے کے معنی میں ہے، وہ روح جو وجود انسان کے اہم اور بنیادی حصہ کو تشکیل دیتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن معاد جسمانی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور روح اور مادی جسم کی بازگشت کو قیامت میں قطعی اور یقینی سمجھتا ہے۔ لیکن اوپر والی آیت سے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ انسانی شخصیت کی اساس یہ مادی اجزاء نہیں ہیں جنہوں نے تمہاری تمام فکر کو اپنی طرف مشغول کر رکھا ہے بلکہ وہ روحانی جوہر ہے، جو خدا کی طرف سے آیا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔

اور خلاصہ کے طور پر اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اوپر والی یہ آیت معاد اور قیامت کے منکرین کو اس طرح جواب دیتی ہے کہ اگر تمہاری مشکل جسمانی اجزاء کا منتشر اور پراگندہ ہونا ہے تو تم خود قدرت خدا کو قبول کرتے ہو اور اس کے منکر نہیں ہو اور اگر اس پراگندگی کی وجہ سے انسان کی شخصیت کے اضمحلال اور نابودی والی مشکل ہے تو وہ بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ انسانی شخصیت کی بنیاد روح پر استوار ہے۔

یہ اعتراض مشہور شبہ " اکل و ماکول" سے ملتا جلتا ہے اور اس کا جواب بھی دو مقامات پر ایک دوسرے سے شباہت رکھتا ہے۔[1]

ضمناً اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ چند ایک قرآنی آیات میں " توفی" اور " قبض ارواح" کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے:

" اللہ یتوفی الانفس حین موتھا" (زمر ۴۲)

" خدا جانوں اور نفسوں کو موت کے وقت لے لیتا ہے"۔

اور بعض آیات میں فرشتوں کی ایک جماعت کی طرف نسبت ہے:

" الذین تتوفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم" (نحل ۲۸)

وہ کہ فرشتے جن کی ارواح کو قبض کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ ظالم و ستمگر لوگ ہیں"...)

---

[1] شبہ " اکل و ماکول" کے سلسلہ میں مزید وضاحت اور اس کے تفصیلی جواب کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۱ سورہ بقرہ کی آیت ۲۶ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

اور زیر بحث آیات میں قبض ارواح کی نسبت "ملک الموت" اموت کے فرشتہ) کی طرف دی گئی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تعبیروں کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے "ملک الموت" جنس کا معنی رکھتا ہے اور ان تمام فرشتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور یا پھر ان کے رئیس اور سب سے بڑے فرشتے کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ تمام فرشتے حکم خدا سے قبض روح کرتے ہیں لہذا خدا کی طرف بھی نسبت دی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد ان کافر مجرم اور معاد کے منکرین کی کیفیت جو قیامت میں اس کے مختلف مناظر کو مشاہدہ کرنے سے ہوگی۔ اپنے کیے پر سخت نادم اور پشیمان ہوں گے۔ اس طرح مجسم اور ان کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے۔ اگر تو دیکھے مجرمین کو جس وقت کہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے سر نیچے کیے ہوئے کہیں گے۔ پروردگارا جو کچھ تو نے وعدہ کیا تھا، اس کو ہم نے دیکھا اور سنا ہے۔ ہم اپنے کیے پر نادم ہیں۔ ہمیں واپس پلٹا دے تاکہ ہم عمل صالح انجام دیں۔ ہم اس جہان قیامت پر یقین رکھتے ہیں[1] اگر تم تعجب میں ڈوب جاؤ گے [1] ولو ترى اذ المجرمون ناكسوا رؤوسهم عند ربهم ربنا ابصرنا وسمعنا فارجعنا نعمل صالحا انا موقنون[1]

یقیناً آپ تعجب کریں گے کہ کیا یہ سر نیچے کیے ہوئے نادم اور پشیمان افراد وہی مغرور، سرکش اور منہ زور لوگ ہیں جو دنیا میں کسی حقیقت کے مقابلہ میں سر نہیں جھکاتے تھے؟ لیکن اب جبکہ قیامت کے مناظر کو دیکھیں گے اور مقام شہود پر پہنچ جائیں گے۔ تو کلی طور پر متغیر ہو کر بدل جائیں گے۔ لیکن یہ تغیر اور بیداری جلدی گزر جانے والی ہے اور قرآن کی دوسری آیات کے مطابق اگر اس جہان کی طرف پلٹ آئیں تو اپنی اسی روش و طریقہ کو جاری رکھیں گے۔ (انعام، ۲۸)

"ناکس" "نکس" (بروزن عکس) کے مادہ سے کسی چیز کا اوندھے منہ ہونے کے معنی میں ہے۔ لیکن یہاں سر نیچے کرنے کے معنی میں ہے۔

"ابصرنا" (ہم نے دیکھا ہے) کو "سمعنا" (ہم نے سنا ہے) پر مقدم رکھنا اس بناء پر ہے کہ قیامت میں پہلے انسان اس کے مناظر سے روبرو ہوگا اور پھر اس کے بعد خدا اور اس کے فرشتوں کی بازپرس کو سنے گا۔

ضمناً جو کچھ ہم نے کہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مجرمین" سے مراد یہاں کفار اور خصوصیت سے قیامت کے منکرین ہیں۔

بہرحال یہ پہلا موقع نہیں کہ ہم آیات قرآنی میں اس مسئلہ سے روبرو ہو رہے ہیں کہ مجرمین نتائج اعمال کے اور عذاب الٰہی کے آثار کے مشاہدے سے سخت پریشان ہوں گے اور دنیا کی طرف بازگشت کا تقاضا کریں گے۔ حالانکہ سنت الٰہی کے لحاظ سے اس قسم کی بازگشت امکان نہیں رکھتی، جس طرح کہ نوزاد بچے کی بازگشت رحم مادر کی طرف اور درخت سے

---

[1] اس آیہ شریفہ میں "لو" شرطیہ ہے اور "ترى" کا جملہ اس کی شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور تقدیری طور پر اس طرح ہے۔ ولو ترى اذ المجرمون ..... لرأيت عجبا۔ ربنا ابصرنا کے جملہ کا بھی ایک محذوف ہے اور وہ دراصل "يقولون ربنا ابصرنا" ہے۔

جدا شدہ پھل کی بازگشت درخت کی طرف ممکن نہیں ہوتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مجرمین کا دنیا کی طرف بازگشت کا تقاضا صرف عمل صالح انجام دینے کے لیے ہے۔ اور اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ قیامت میں سرمایۂ نجات صرف اعمال صالح ہی ہیں۔ ایسے اعمال جو پاک اور ایمان سے سرچشمہ اور خالص نیت سے انجام پائیں۔

اور چونکہ ایمان کو قبول کرنے کے لیے آیت کا سارا اصرار اور زیادہ زور ممکن ہے، یہ توہم پیدا کرے کہ کیا خدا اس قدر قدرت و توانائی نہیں رکھتا کہ نور ایمان کا پرتو ان کے دل میں ڈال دے؟ تو بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اگر ہم چاہتے تو ہر انسان کو (جبری طور پر) ضروری ہدایت دے دیتے" (ولو شئنا لآتینا کل نفس ھداھا)۔

یقیناً ہم ایسی قدرت رکھتے ہیں لیکن ایسا ایمان جو ہمارے جبری طریقے سے وجود میں آئے تو ایسے ایمان کی چنداں قیمت نہیں ہے، لہٰذا ہم نے ارادہ کر لیا کہ بنی نوع انسان کو یہ اعزاز اور افتخار بخشیں کہ وہ "مختار" ہو اور ارتقائی مراحل اپنے قدموں سے طے کرے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "میں نے انھیں آزاد چھوڑ دیا، لیکن مقرر کر دیا کہ دوزخ کو بے ایمان اور گناہگار جن و انس کے تمام افراد سے بھر دوں" (ولکن حق القول منی لاملئن جھنم من الجنۃ والناس اجمعین)۔

جی ہاں انھوں نے اپنے غلط اختیار سے اس راہ کو طے کیا ہے لہٰذا وہ سزا اور عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اور ہم نے بھی قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ دوزخ کو ان سے بھر دیں۔

اگر اس بات کو مدنظر رکھا جائے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، اسی طرح قرآن مجید کی سینکڑوں آیات کو دیکھا جائے جو انسان کو مختار، صاحب ارادہ، مکلف بتکالیف شرعیہ اپنے اعمال کا جواب دہ، انبیاء، تہذیب نفس اور خود سازی کے ذریعہ قابل ہدایت و اصلاح سمجھتی ہیں تو اوپر والی آیت کے بارے میں ہر قسم کا توہم دور ہو جاتا ہے کہ یہ جبر کی دلیل ہے جیسا کہ فخر رازی وغیرہ نے خیال کیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اوپر والا دو ٹوک فیصلہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کہیں یہ تصور نہ کرنا کہ خدا کی رحمانیت و رحیمیت گناہوں سے آلودہ اور تم گر مجرموں کی سزا اور عذاب سے مانع ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آیات رحمت سے مغرور ہو جاؤ اور اپنے آپ کو خدا کی سزا اور عذاب سے معاف تصور کرو۔ کیونکہ اس کی رحمت کا اپنا مقام ہے اور غضب کا اپنا مقام۔

"لاملئن" کے جملہ کے اوّل میں لام قسم اور آخر میں نون تاکید کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اس وعدہ کو پورا کرے گا اور دوزخ کو ان دوزخیوں سے بھر دے گا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو حکمت کے خلاف ہے۔

اس لیے بعد کی آیت میں کہتا ہے، ہم ان دوزخیوں سے کہیں گے کہ جہنم کا عذاب اس بنا پر چکھو کہ آج کی ملاقات کو تم بھول گئے تھے۔ اور ہم نے بھی تمھیں فراموشی کے حوالے کر دیا" (فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا انا نسینکم)۔

"اور نیز ہمیشگی کے عذاب کو ان اعمال کی وجہ سے چکھو، جنہیں تم انجام دیتے تھے" (وذوقوا عذاب الخلد بما کنتم تعملون)۔

اس آیت سے ایک بار پھر معلوم ہوتا ہے، قیامت کی دادگاہ اور علامت کو بھول جانا ہی انسان کی بدبختی کا اصل سرچشمہ ہے اور یہی وہ صورت ہے کہ جس میں وہ اپنے آپ کو قانون شکنی اور مظالم کے سلسلہ میں آزاد سمجھتا ہے، نیز اس آیت سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ابدی اور ہمیشہ کی سزا و عذاب ان اعمال کی وجہ سے ہی ہے، جنہیں انسان خود انجام دیتا ہے۔ نہ کوئی اور چیز! [1]

ضمناً: بندوں کے بارے میں پروردگار کی خاموشی سے مراد یہاں خدا کی بے اعتنائی، ترکِ حمایت اور فریاد رسی نہ کرنا ہے۔ ورنہ سارا جہان ہمیشہ پروردگار کے سامنے ہے، اور اس کے بارے میں فراموشی ایک بے معنی سی بات ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ روح کا استقلال اور اس کی اصلیت:

اوپر والی آیات میں سے پہلی آیت جو موت کے فرشتہ کے ذریعے قبض ارواح پر دلالت کرتی ہے، انسان کی روح کے استقلال کی دلیل ہے۔

کیونکہ "توفی" سے تعبیر جو حاصل کرنا اور قبض کرنا کے معنی میں ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ بدن سے جدائی کے بعد روح نابود نہیں ہوتی بلکہ باقی رہ جاتی ہے اور اصولاً اوپر والی آیت میں انسان کو روح یا نفس سے تعبیر کرنا اس معنی پر ایک اور گواہ ہے کیونکہ مادہ پرستوں کے عقیدے کے مطابق روح سالموں کے "فزیکل اور کیمیکل" خواص کے علاوہ کچھ نہیں جو بدن کے فنا ہونے کے ساتھ نابود ہو جاتے ہیں جیسے گھڑی کے نابود ہونے کے ساتھ ہی اس کی سوئی کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔

اس نظریے کے مطابق روح کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو انسانی شخصیت کی محافظ ہو بلکہ اس کے جسم کے خواص کی ایک جزء ہے، جو جسم کے ختم ہو جانے سے ختم ہو جاتی ہے۔

روح کی اصلیت اور استقلال کے سلسلے میں ہمارے پاس متعدد فلسفی دلائل موجود ہیں۔ جن کا ایک گوشہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۵ کے ذیل میں جلد ۱۲ میں ہم بیان کر چکے ہیں، یہاں پر مقصود صرف اس موضوع پر نقلی دلیل کو بیان کرنا تھا اور اوپر والی آیت کا شمار اس معنی پر دلالت کرنے والی آیات میں ہوتا ہے۔

۲۔ موت کا فرشتہ (ملک الموت):

قرآن مجید کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم فرشتوں کے ایک گروہ کے ذریعہ اس جہان کے امور کی تدبیر کرتا ہے جیسا کہ

---

[1] "خلود اور عذاب جاودانی کے فلسفہ" کے بارے میں جلد ۹ میں ——— سورۂ ہود آیت ۱۰۷ کے ذیل میں ہم ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

سورہ نازعات کی آیت ۵ میں فرماتا ہے (فالمدبرات امرا) "قسم ہے ان فرشتوں کی جو حکم خدا سے تدبیر امور کرتے ہیں"۔

ہم سب جانتے ہیں کہ سنت الٰہی اس پر ہے کہ وہ اپنی مشیت کو اسباب کے ذریعے عملی شکل دیتا ہے۔ اور ان فرشتوں میں سے ایک گروہ قبض ارواح کرنے والا ہے جن کی طرف سورۂ نحل کی آیت ۲۸ اور ۳۲ میں قرآن کی بعض دوسری آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے اور ان سب میں سرفہرست "ملک الموت" قرار پاتا ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سی احادیث بیان ہوئی ہیں، جن میں سے بعض کی طرف اشارہ ضروری نظر آتا ہے۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

الامراض والاوجاع کلها برید الموت ورسل الموت! فاذا جاء الاجل الی ملک الموت بنفسه فقال یا ایها العبد! کم خبر بعد خبر؟ وکم رسول بعد رسول؟ وکم برید بعد برید؟ انا الخبر الذی لیس بعدی خبر!

"بیماریاں اور درد و تکالیف سب موت کے قاصد اور اس کے بھیجے ہوئے ہیں، جس وقت انسان کی زندگی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور موت کا فرشتہ آجاتا ہے تو وہ اس فرشتہ کو دیکھ کر وحشت کرتا ہے اور اسے کسی پیشگی اطلاع دیئے بغیر خیال کرتا ہے لیکن، وہ کہتا ہے اے بندۂ خدا کس قدر متواتر خبریں پے در پے قاصد اور مسلسل پیغام رساں تیری طرف بھیجے ہیں۔ اب میں آخری خبر ہوں اور میرے بعد کوئی خبر نہیں ہے"۔

پھر وہ کہتا ہے "اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کرے۔ چاہے رضا و رغبت کے ساتھ یا جبر و اکراہ کے ساتھ"۔ اور جس وقت موت کا فرشتہ اسکی روح قبض کرتا ہے اور اس کے عزیز و اقارب نالہ و شیون بلند کرتے ہیں تو وہ پکار کے کہتا ہے: (علی من تصرخون؟ وعلی من تبکون؟ فوالله ما ظلمت له اجلا ولا اکلت له رزقا بل دعاه ربه) "کس پر تم چیخ پکار کر رہے ہو؟ اور کس کے لیے آنسو بہا رہے ہو؟ خدا کی قسم اس کا وقت آن پہنچا ہے اور وہ ساری روزی کھا چکا ہے۔ اس کے پروردگار نے اسے دعوت دی ہے، اور اس نے اس کی دعوت کو قبول کیا ہے"۔

"فلیبک الباکی علی نفسه، وان لی فیکم عودات وعودات حتی لا ابقی فیکم احدا"۔

"اگر رونا چاہتے ہو تو اپنے آپ پر گریہ کرو، میں پھر بھی بارہا تمہارے پاس آؤں گا یہاں تک کہ تم میں سے ایک شخص کو بھی باقی نہیں چھوڑوں گا"۔ [1]

۲۔ ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ ایک انصاری شخص کی عیادت کے لیے اس کے گھر تشریف لے گئے موت کے فرشتے کو اس کے سرہانے دیکھ کر فرمایا، میرے اس دوست سے نرمی کا سلوک کرو، کیونکہ یہ ایک باایمان شخص ہے۔ ملک الموت نے عرض کی آپ کو بشارت ہو کہ میں تمام مومنین کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔ اور آپ

---

[1] مجمع البیان ذیل آیت زیر بحث و تفسیر نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۴۲۵۔

جان لیجئے کہ جس وقت میں جبض اولاد آدم کی رُوح قبض کرتا ہوں تو اس کے گھر والے آہ و فریاد کرتے ہیں تو میں گھر کے پاس کھڑا ہو جاتا ہوں اور کہتا ہوں، اس میں میرا تو کوئی گناہ نہیں، بلکہ اس کی اپنی زندگی ختم ہو گئی ہے، بارہا تمہاری طرف لوٹ کر آؤں گا خبردار، ہوشیار رہو۔

پھر کہتا ہے (ما خلق اللہ من اھل بیت مدر ولا شعر ولا وبر، فی بر ولا بحر الا و انا اتصفحھم فی کل یوم ولیلۃ خمس مرات حتی انی لا عرف بصغیرھم و کبیرھم منھم بانفسھم) خدا نے کسی بھی شہر و بیاباں، گھر اور خیمہ خشکی اور دریا میں رہنے والے انسان کو پیدا نہیں کیا، مگر یہ کہ میں ہر شبانہ روز میں پانچ مرتبہ بڑے غور کے ساتھ ان کی طرف نگاہ کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں ان کے تمام چھوٹے بڑوں کو خود ان سے بہتر پہچانتا ہوں۔ [1]

اس مضمون کی دوسری روایات بھی مختلف اسلامی مآخذ میں موجود ہیں کہ جن کا مطالعہ تمام انسانوں کو متنبہ اور خبردار کرتا ہے، تاکہ وہ جان لیں کہ ان کے اور موت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے کہ ایک مختصر سے لمحے میں تمام چیزیں ختم ہو جائیں۔

کیا ان حالات کے باوجود اس بات کا موقع ہے کہ انسان اس دُنیا کی چمک دمک پر فریفتہ اور طرح طرح کے ظلم و گناہ سے آلودہ ہو کر عاقبت کار سے غافل ہو جائے؟

---

[1] تفسیر "درمنثور" بحوالہ المیزان جلد ۱۷ ص ۲۰۸۔

۱۵۔ اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۩

۱۶۔ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ

۱۷۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ

۱۸۔ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسْتَوٗنَ

۱۹۔ اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۫ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ

۲۰۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِیْدُوْا فِیْهَا وَقِیْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ

ترجمہ

۱۵۔ صرف وہی لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں کہ جس وقت یہ

آیات انھیں یاد دلائی جائیں تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالاتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔

۱۶۔ ان کے پہلو رات کو بستروں سے دُور رہتے ہیں (وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور خدا کی بارگاہ کی طرف رُخ کرتے ہیں) اپنے پروردگار کو خوف و امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں روزی دی ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

۱۷۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کیسی اہم جزائیں جو آنکھوں کی روشنی کا سبب بنتی ہیں، ان کے لیے چھپی ہوئی ہیں۔ یہ ان اعمال کی جزاء ہے جنہیں وہ انجام دیتے تھے۔

۱۸۔ کیا وہ شخص جو صاحب ایمان ہو، اس شخص کی طرح ہے جو فاسق ہے؟ نہیں! یہ دونوں کبھی بھی برابر نہیں ہو سکتے۔

۱۹۔ لیکن وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیئے، اُن کے لیے دائمی بہشت کے باغات ہوں گے یہ (خدا کی طرف سے) ان کی میزبانی کا وسیلہ ہے، ان اعمال کے مقابلہ میں جنھیں وہ انجام دیتے تھے۔

۲۰۔ لیکن وہ لوگ جو فاسق ہو گئے (اور اپنے پروردگار کی اطاعت سے نکل گئے) ان کی ہمیشہ کی جگہ آگ ہے، جس وقت چاہیں کہ اس سے نکلیں تو انھیں اس کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا، اس آگ کا عذاب چکھو جس کا تم انکار کرتے تھے۔

تفسیر

عظیم جزائیں جنہیں کوئی نہیں جانتا!

ہم سب کو معلوم ہے کہ قرآن کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ بہت سے حقائق کو ایسے دلنشین انداز میں ایک دوسرے کے تقابل اور موازنہ کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ وہ اچھی طرح ہر ایک کی سمجھ میں آجائیں۔

گذشتہ آیات میں مجرمین اور کافرین کے بارے میں بیان شدہ تشریح کے بعد یہاں پر بھی برجستہ مؤمنین کی صفات اور ان کے اصول عقاید اور عملی پروگرام کو اختصار کے ساتھ دو آیات کے ضمن میں آٹھ صفات کے ذکر کے ساتھ بیان کرتا ہے [1]

پہلے فرماتا ہے: "صرف وہی لوگ ہماری آیات پر ایمان لے آتے ہیں کہ جنہیں جب بھی ان آیات کی یاد دہانی کرائی جائے تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ اور اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے" انما یؤمن بآیاتنا الذین اذا ذکروا بھا خروا سجدا وسبحوا بحمد ربھم وھم لا یستکبرون۔

"انما" کی تعبیر جو عام طور پر حصر کے لیے ہے، اس نکتہ کو بیان کرتی ہے کہ جب کوئی شخص ایمان کا دم بھرتا ہے لیکن ان خصوصیات کا حامل نہیں جو ان آیات میں آئی ہیں تو وہ سچے مومنین کی صف میں نہیں ہے بلکہ ایسا ضعیف الایمان شخص ہے جو کسی کھاتے میں شمار کے قابل نہیں۔

اس آیت میں ان کی صفات کے چار حصے بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ آیاتِ الٰہی کے سنتے ہی سجدہ میں گر پڑتے ہیں "سجدوا" کے بجائے "خروا" کی تعبیر ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ بیدار دل مومنین کا گروہ آیاتِ قرآن سننے کے وقت اس طرح شیفتہ اور پروردگار کے ارشادات کا مجذوب ہے کہ بے اختیار سجدہ میں گر پڑتا ہے اور اس راہ میں دل و جان کو ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے [2]

---

[1] توجہ رکھنا چاہیے کہ یہ آیت قرآن مجید میں "واجب سجدہ" کی پہلی آیت ہے۔ چنانچہ جو شخص اس ساری آیت کو پڑھے۔ یا کسی دوسرے سے سنے تو واجب ہے کہ سجدہ کرے۔ البتہ اس میں وضو واجب نہیں ہے۔ لیکن احتیاط واجب یہ ہے کہ پیشانی اسی چیز پر رکھے کہ جس پر سجدہ صحیح ہے۔

[2] "راغب" "مفردات" میں لکھتے ہیں "خروا" دراصل "خریر" کے مادہ سے ہے، جو پانی وغیرہ کی اس آواز کے معنی میں ہے جو بلندی سے نیچے کی طرف گر رہا ہو اور اس تعبیر کو سجدہ کرنے والوں کے بارے میں استعمال کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ جس طرح سجدہ کے لیے زمین پر گرتے ہیں، اسی وقت ان کی تسبیح کی صدا بلند ہوتی ہے۔

ہی ہاں ان کی پہلی خصوصیت اپنے محبوب و معبود کے کلام و گفتگو سے ان کا عشق سوزاں اور لگاؤ ہے۔

یہی خصوصیت قرآن کی دوسری آیات میں انبیاء کی ایک برجستہ ترین صفت کے عنوان سے ذکر ہوئی ہے، جیسا کہ خداوند عظیم انبیاء کے ایک گروہ کے متعلق کہتا ہے،

"اذا تتلی علیھم آیات الرحمٰن خروا سجدًا وبکیًا" (سورۂ مریم - ۵۸)

"جس وقت خداوند رحمان کی آیات ان پر پڑھی جاتی تھیں تو وہ خاک پر گر پڑتے اور سجدہ کرتے اور گریۂ شوق کرتے تھے"۔

اگرچہ لفظ "آیات" یہاں بطور مطلق ذکر ہوا ہے۔ لیکن واضح ہے کہ ان سے مراد زیادہ تر وہ آیات ہیں جن میں توحید کی دعوت ہے اور شرک سے نبرد آزمائی کی ترغیب۔

۲ و ۳۔ دوسری اور تیسری نشانی ان کی پروردگار کی "تسبیح" اور "حمد" ہے۔ ایک طرف جہاں وہ خدا کو نقائص سے پاک اور منزہ شمار کرتے ہیں تو دوسری طرف اس کے صفات کمال و جمال کی بنا پر اس کی حمد و ستائش کرتے ہیں۔

۴۔ ان کی ایک اور صفت تواضع، فروتنی اور ہر قسم کے استکبار سے دوری ہے۔ کیونکہ کبر و غرور کفر قبل ایمانی کے زینہ کی پہلی سیڑھی ہے اور حق و حقیقت کے سامنے جھک جانا ایمان کا پہلا قدم ہے۔

وہ لوگ جو تکبر اور خود پسندی کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں، وہ نہ تو خدا کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی تسبیح و حمد بجا لاتے ہیں اور نہ ہی اس کے بندوں کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اپنے سامنے ایک عظیم بت رکھتے ہیں اور بڑائی خود ان کی اپنی ذات ہے۔

اس کے بعد ان کی دوسری صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "ان کے پہلو رات کے وقت بستروں سے دور ہو جاتے ہیں"، وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور بارگاہ خدا کا رُخ کر کے اس سے راز و نیاز کرتے ہیں: (تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع)[1]

جی ہاں! جس وقت غافل لوگوں کی آنکھ سو رہی ہوتی ہے تو وہ رات کا ایک حصہ بیدار ہوتے اور اس وقت جبکہ زندگی کا کاروبار ٹھپ ہوتا ہے، فکری مشاغل کم سے کم حد کو پہنچ جاتے ہیں۔ اور آرام و سکون اور خاموشی نے ہر جگہ کو گھیر رکھا ہوتا ہے اور عبادات میں ریا کا شائبہ بہت ہی کم ہوتا ہے اور خلاصہ یہ کہ اس وقت حضور قلب کے بہترین مواقع میسر ہوتے ہیں، یہ لوگ اپنے پورے وجود کے ساتھ بارگاہ معبود کا رُخ کرتے ہیں اور اپنے معشوق و محبوب کے آستانے پر سر جھکا دیتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے، اس کی بارگاہ میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ اس کی یاد میں زندہ ہیں اور اپنے دل کے پیمانے

---

[1] "تتجافیٰ" مادہ "جفا" سے اصل میں اُٹھانے اور دُور کرنے کے معنی میں ہے۔ "جنوب" جمع ہے "جنب" کی جو پہلو کے معنی میں ہے اور "مضاجع" جمع ہے "مضجع" کی جو بستر کے معنی میں۔ اور بستر سے پہلو کا دُور ہونا رات کے وقت بستر خواب سے اُٹھنے اور پروردگار کی عبادت کرنے سے کنایہ ہے۔

کو اس کی مہر و محبت سے لبریز اور سرشار رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے "وہ اپنے پروردگار کو "خوف" "وامید" کے ساتھ پکارتے ہیں" (یدعون ربھم خوفًا وطمعًا)۔

جی ہاں ان کی دوا در صفات "خوف" و "رجا" یا "ڈر" اور "امید" ہے، نہ تو اس کے غضب اور عذاب سے مامون رہتے ہیں اور نہ اس کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں۔ اس "خوف اور امید" کا توازن جو خدا کی راہ میں ان کے تدریجی کمال و ارتقاء اور پیش رفت کا ضامن ہے، ہمیشہ ان کے وجود میں کارفرما ہے۔

وجہ یہ ہے کہ امید پر خوف کا غلبہ انسان کو مایوسی اور سستی کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے، اور رجاء اور طمع کا غلبہ اسے غرور و غفلت پر آمادہ کرتا ہے اور یہ دونوں خدا کی طرف انسان کے ارتقائی سراحل کے دشمن ہیں۔

آخری اور آٹھویں خصوصیت ان کی یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے انھیں رزق دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں" (ومما رزقناھم ینفقون)۔

نہ صرف یہ کہ اپنے مال ضرورت مندوں کو بخش دیتے ہیں، بلکہ اپنے علم و دانش، قوت اور قدرت، صحیح رائے اور تجربہ اور فکری ذخیرے کو ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

وہ خیر و برکت کا مرکز ہیں اور نیکیوں کے آب زلال یعنی صاف ستھرے پانی کا لازوال چشمہ ہیں کہ تشنہ کاموں کو سیراب اور محتاجوں کو اپنی ہستی کے مطابق بے نیاز کر دیتے ہیں۔

جی ہاں! ان کے اوصاف محکم عقیدہ، قوی ایمان، خدا سے حقیقی عشق، عبادت و اطاعت، کوشش و حرکت اور بندگان خدا کی ہر لحاظ سے مدد کرنے کا مجموعہ ہیں۔

پھر بعد والی آیت میں پہلے مومنین کے عظیم اور اہم اجر کو بیان کرتا ہے، جو پہلے کی دو آیات میں مذکورہ نشانیوں کے حامل ہیں، ایک ایسی قابل توجہ تعبیر کے ساتھ جو ان کے اجر کی حد سے زیادہ اہمیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ فرماتا ہے، "کوئی شخص نہیں جانتا کہ آنکھوں کی ٹھنڈک میں کیا اہم اجر و ثواب ان کے لیے چھپا رکھے گئے ہیں" (فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین)۔

یہ بڑا عظیم اور بلند تر اجر ہے جو ان کے اعمال کے بدلے میں دیا گیا۔

"کوئی شخص نہیں جانتا" کی تعبیر نیز "قرۃ اعین" (آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا باعث ہے) کی تعبیر ان نعمتوں کی بے حساب عظمت کو بیان کرتی ہیں، خصوصاً جب لفظ "نفس" سیاق نفی میں نکرہ کی شکل میں آیا ہے اور عموم کا معنی دے رہا ہے اور ملائکہ مقرب اور اولیاء اللہ سمیت تمام نفوس کو شامل ہے۔

"نفس" کی طرف اضافت کے بغیر "قرۃ اعین" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خدا کی نعمتیں جو آخرت کے گھر کے لیے پہلے مومنین کے ثواب اور اجر کے طور پر مقرر کی گئی ہیں، اس طرح ہیں کہ ہر ایک کی آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا سبب ہوں گی۔

"قرۃ" مادہ "قر" (بروزن حر) سے ٹھنڈک اور خنکی کے معنی میں ہے اور چونکہ مشہور ہے کہ محبت

اور شوق کے آنسو ہمیشہ ٹھنڈے اور خنک اور غم و حسرت کے آنسو گرم اور سوزاں ہوتے ہیں" قرۃ اعین" کی تعبیر لغت عرب میں ایسی چیز کے معنی میں ہے جو انسان کی آنکھ کے ٹھنڈا ہونے کا سبب ہو۔ یعنی شوق اور محبت کے آنسو اپنی آنکھوں سے جاری کرتا ہے اور یہ انتہائی خوشحالی اور سرور کا لطیف کنایہ ہے۔

لیکن فارسی زبان میں اس قسم کی تعبیر موجود نہیں ہے بلکہ ہم کہتے ہیں، اس کی آنکھ کی روشنی کا سبب ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ فارسی کی یہ تعبیر" یوسف و یعقوب" کی قرآنی داستان سے لی گئی ہو کہ قرآن کے بقول جس وقت بشارت دینے والا یعقوب کے پاس آیا اور یوسف کا پیراہن ان کے چہرے پر رکھا تو ان کی نابینا آنکھیں روشن ہو گئیں۔ (سورۂ یوسف آیت ۹۶) اور یہ تعبیر بھی زبردست سرور اور خوشی سے کنایہ ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"ان اللہ یقول اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت، ولا اذن سمعت، ولا خطر علی قلب بشر!

"خدا فرماتا ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے ایسی نعمتیں فراہم کر رکھی ہیں کہ جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کوئی فرد بشر ان کے متعلق سوچ سکتا ہے!" [1]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، جسے عظیم مفسر مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں بھی پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ آخر یہ عظیم ثواب و اجر کیوں مخفی رکھا گیا ہے؟

اس کے بعد موصوف اس سوال کے تین جواب دیتے ہیں:

۱۔ اہم اور نہایت قیمتی امور اس طرح ہیں کہ لفظوں سے آسانی کے ساتھ ان کی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ایسا اوقات ان کا مخفی رکھنا زیادہ فرحت بخش اور فصاحت کی رُو سے زیادہ بلیغ ہے۔

۲۔ اصولی طور پر جو چیز آنکھوں کی ٹھنڈک اور روشنی کا باعث ہو، اس کا دامن اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ انسان کا علم و دانش اس کے تمام خصوصیات تک نہیں پہنچ سکتا۔

۳۔ چونکہ یہ اجر نماز تہجد کے لیے قرار دیا گیا ہے جو مخفی صورت میں ادا کی جاتی ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اس عمل کی جزا بھی عظیم اور مخفی ہو۔ توجہ رہے کہ گذشتہ آیت میں "تتجافی جنوبھم عن المضاجع" کا جملہ نماز شب کی طرف اشارہ ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"ما من حسنۃ الا ولھا ثواب مبین فی القرآن، الا صلوٰۃ اللیل، فان

---

[1] اس حدیث کو طبرسی سمیت بہت سے مفسرین نے منجملہ ان کے "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں "آلوسی" نے "روح المعانی" میں "قرطبی" نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ مشہور محدثین "بخاری" اور "مسلم" نے بھی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

اللہ عزاسمہ لم یبین لنا بھا لعظم خطرھا ، قال : فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین"۔

"کوئی نیک عمل نہیں مگر یہ کہ اس کا واضح ثواب قرآن میں بیان ہوا ہے سوائے نماز تہجد کے۔ خدائے عظیم نے اس کے ثواب کو واضح طور پر بیان نہیں کیا۔ یہ اس کی اہمیت کی وجہ سے ہے، اس لیے فرماتا ہے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کیسے عمدہ ثواب جو آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا باعث ہیں، ان کے لیے پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔[1]

لیکن ان تمام چیزوں سے قطع نظر جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے، عالم قیامت ایک ایسا جہان ہے، جو اس جہان کی نسبت صدسے زیادہ وسیع ہے۔ دنیاوی زندگی اس کے مقابلے میں ایسی ہے جس طرح دُنیا کے مقابلے میں شکم مادر میں موجود بچے کی زندگی۔ بلکہ وہ عالم اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اور اصولی طور پر ہم جیسے دُنیا کی چار دیواری میں مقید افراد کے لیے اس کے تمام اطراف وجہات قابل درک نہیں ہیں۔ بلکہ کسی کے لیے ابھی قابل تصور بھی نہیں۔

ہم نے صرف اس کے بارے میں بات سُنتے اور دُور سے ایک سایہ کے مانند اسے دیکھتے ہیں۔ لیکن جب تک اس جہان والا ادراک اور نظر پیدا نہ کریں، اس کی اہمیت کا درک ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ بچہ کے لیے شکم مادر میں بالفرض کامل عقل وہوش رکھتا ہو تو اس دنیا کی نعمتوں کا ادراک ناممکن ہے۔

یہی تعبیر شہدائے راہ خدا کے بارے میں آئی ہے کہ جس وقت کوئی شہید زمین پر گرتا ہے تو زمین کہتی ہے، آفرین ہے اے پاکیزہ رُوح پاکیزہ بدن سے پرواز کر رہی ہے۔ تیرے لیے بشارت اور خوشخبری ہو: "ان للک مالا عین رأت و لاذن سمعت ، ولاخطر علی قلب بشر"[2]

بعد والی آیت اس تقابل کو جو گذشتہ آیات میں تھا، زیادہ صراحت کے ساتھ واضح کرتے ہوئے کہتی ہے "کیا وہ شخص جو مومن ہے، مثل اس شخص کے ہے جو فاسق ہے؟ نہیں یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہیں" (افمن کان مؤمنا کمن کان فاسقا لا یستوون)۔

یہ جملہ استفہام انکاری کے طور پر بیان ہوا ہے، وہ استفہام جس کا جواب ہر انسان کی عقل وفطرت سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے، اس کے باوجود پھر بھی تاکید کے لیے "لا یستوون" کا جملہ ذکر کیا ہے جو ان کے برابر نہ ہونے کو مزید واضح کرتا ہے۔

اس آیت میں "فاسق" "مومن" کے مقابلہ میں ذکر ہوا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فسق ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جو کفر کو بھی شامل ہے اور دوسرے گناہوں کو بھی، کیونکہ یہ لفظ اصل میں "فسقت الثمرۃ" (یعنی پھل

---

[1] "مجمع البیان" محل بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان ذیل آیہ ۱۷ آل عمران جلد ۲ ۔ تفسیر نمونہ جلد ۳ اسی آیت کے ذیل میں۔

اپنے چھلکے سے باہر نکلا یا جب کھجور کی گٹھلی اپنے گودے سے جدا ہو اور باہر جا گرے) سے یہ جملہ لیا گیا ہے۔ پھر خدا اور عقل کے حکم کی اطاعت سے خارج ہونے پر اطلاق ہوا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جو شخص کفر اختیار کرتا ہے یا گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ پروردگار اور عقل و خرد کے فرمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پھل جب تک اپنے چھلکے اور خول کے اندر رہتا ہے صحیح و سالم ہے اور جس وقت پوست و چھلکے سے خارج ہو جائے، خراب ہو جاتا ہے، تو اس بنا پر جو بھی انسان فاسق ہوتا ہے، فوراً خراب اور فاسد بھی ہو جاتا ہے۔

عظیم مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ ایک دن "ولید بن عقبہ[1]" نے حضرت علیؑ سے عرض کیا۔ "انا ابسط منک لسانا واحد منک سنانا" "میں آپ سے زیادہ وسیع و فصیح زبان اور زیادہ تیز نیزہ رکھتا ہوں"۔ (اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے خیال میں تقریر اور جنگ دونوں میں حضرت سے بڑھا ہوا ہے)۔

حضرت علیؑ نے اس کے جواب میں فرمایا "لیس کما تقول یا فاسق" "اے فاسق! جیسے تو کہتا ہے ویسا نہیں ہے"۔ (اس طرف اشارہ ہے کہ تو وہی شخص تو ہے، جس نے قبیلہ "بنی مصطلق" کی زکوٰۃ جمع کرنے کے وقت ان کے اسلام کے خلاف قیام کرنے کا الزام لگایا تھا اور خدا نے سورۂ حجرات کی آیت ۶ (یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا) ..... میں نے تیری تکذیب کی اور تجھے فاسق کہا۔[2]

بعض مفسرین نے یہاں اضافہ کیا ہے کہ آیہ "افمن کان مؤمنا کمن کان فاسقا" اس گفتگو کے بعد نازل ہوئی ہے اور "ولید" و "بنی المصطلق" کا واقعہ مدینہ میں رونما ہونا یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ایک مصداق پر تطبیق کے قبیل میں سے ہے۔

لیکن ان بعض مفسرین کے قول کے مطابق، جو اوپر والی آیت کو اور اس کے بعد والی دو آیات کو مدنی سمجھتے ہیں کوئی مشکل باقی نہیں رہ جاتی اور کوئی مانع اور حرج نہیں ہے کہ یہ تین آیات اوپر والی گفتگو کے بعد نازل ہوئی ہوں۔

بہر حال نہ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے عمیق ایمان میں کوئی بحث و اختلاف ہے اور نہ ہی "ولید" کے فسق میں جن دونوں کی طرف قرآنی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں اس عدم مساوات اور برابر نہ ہونے کو زیادہ وسیع شکل میں بیان کرتے ہوئے آیا ہے: باقی رہے وہ جو ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دیا، ان کے لیے بہشت جاوداں کے باغات ہوں گے، (امّا الذین امنوا وعملوا الصالحات فلھم جنات

---

[1] عقبہ (بروزن عقدہ)۔

[2] اس روایت کو مرحوم "طبرسی" نے مجمع البیان میں اور "قرطبی" نے اپنی تفسیر میں اور فاضل "برسوی" نے روح البیان میں نقل کیا ہے۔ قابل توجہ یہ کہ کتاب "الغابہ فی معرفۃ الصحابہ" میں ہے کہ تفسیر قرآن سے آگاہ افراد کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ آیہ ان جاءکم فاسق بنبأ ولید بن عقبہ کے بارے میں قبیلہ بنی مصطلق کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔

المأوی[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ یہ جنات مأوی ان کے انجام شدہ اعمال کے بدلے میں (نزلا بما کانوا یعملون) خدا کی ان کے لیے مہمانی کا ذریعہ ہیں۔

"نزل" کی تعبیر جو ایسی عموماً چیز کے لیے بولی جاتی ہے جو مہمان کی خاطر تواضع کے لیے آمادہ کرتے ہیں اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ مومنین کی جنت میں ہمیشہ مہمانوں کی طرح خاطر تواضع کی جاتی رہے گی۔ جبکہ دوزخی جیسا کہ بعد والی آیت میں آئے گا قیدیوں کی طرح ہیں جس وقت باہر نکلنے کی خواہش کریں گے تو انھیں پلٹا دیا جائے گا۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ کہف کی آیہ ۱۰۲ میں اس طرح آیا ہے (انا اعتدنا جہنم للکافرین نزلا) "ہم نے جہنم کو کافروں کی خاطر و تواضع کے لیے آمادہ کیا ہے" حقیقت میں (فبشرھم بعذاب الیم) "انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے" کی قسم سے ہے جو کنایہ ہے اس بات سے کہ بجائے پذیرائی (خاطر تواضع) کے سزا و عذاب ملے گا اور بشارت کی جگہ انھیں تہدید کرتا ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ "نزل" وہ پہلی چیز ہے کہ جس سے نئے وارد ہونے والے مہمان کی خاطر تواضع کی جاتی ہے (ہمارے زمانے میں دہی چائے اور شربت) اسی بنا پر یہ امر اس کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ جنات مأوی اپنی تمام نعمات و برکات کے ساتھ ان خدائی مہمانوں کی پذیرائی کا پہلا مرحلہ ہے۔ اور ان نعمات کے بعد ایسے برکات ہیں کہ جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔

"لھم جنات" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ خدا جنت کے باغات عاریۃ انھیں نہیں دیتا، بلکہ ہمیشہ کے لیے ان کی ملکیت میں دے دے گا۔ اس طرح سے کہ کبھی بھی ان نعمتوں کا زوال ان کے فکری سکون کو منتشر نہیں کرے گا۔

اور بعد والی آیت میں ان کے نقطہ مقابل کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے "لیکن وہ لوگ جو فاسق ہو گئے ہیں اور اپنے پروردگار کی اطاعت سے نکل گئے ہیں، ان کے لیے ہمیشہ رہنے کی جگہ جہنم کی آگ ہے" (واما الذین فسقوا فمأواھم النار)۔

وہ ہمیشہ کے لیے اس وحشت ناک جگہ میں مقید اور محبوس ہیں۔ اس طرح سے کہ "جس وقت اس سے نکلنا چاہیں گے، انھیں واپس لوٹا دیا جائے گا" (کلما ارادوا ان یخرجوا منھا اعیدوا فیھا)۔

اور انھیں کہا جائے گا کہ چکھو تم اس کے عذاب کو جس کا ہمیشہ انکار کیا کرتے تھے" (وقیل لھم ذوقوا عذاب النار الذی کنتم بہ تکذبون)۔

دوبارہ ہم یہاں دیکھ رہے ہیں کہ عذاب الٰہی "کفر و تکذیب" کے مقابلہ میں آیا ہے اور اس کا ثواب و جزا "عمل" کے مقابلہ

---

[1] مأوی مادہ "اوی" (بروزن قوی) سے ایک چیز کے دوسرے چیز سے انضمام دخل جانے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مکان و مسکن اور رہائش گاہ کے لیے بولا گیا ہے۔

میں ہے۔

جو اس طرف اشارہ ہے کہ تنہا "ایمان" ہی کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ عمل کے لیے سبب بھی بنے۔ لیکن کفر اکیلا عذاب کے لیے کافی ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ عمل نہ بھی ہو۔

ایک نکتہ

عابد شب زندہ دار: (تتجافی جنوبھم عن المضاجع) "رات کے وقت ان کے پہلو بستر سے دور ہوتے ہیں" کے جملہ کی تفسیر میں روایاتِ اسلامی میں دو تفسیریں وارد ہوئی ہیں۔

ایک تفسیر نماز "عشاء" کی جو اس طرف اشارہ ہے کہ سچے مومنین نماز مغرب کے بعد اور عشاء سے پہلے بستروں پر نہیں جاتے کہ کہیں انھیں نیند نہ آجائے اور ان کی نماز عشاء ہاتھ سے نکل نہ جائے کیونکہ اس زمانہ میں معمول تھا کہ رات کی ابتداء میں لوگ استراحت کرتے تھے اور پنج گانہ نمازوں کے درمیان استحبابی جدائی کے حکم کے مطابق نمازوں کو جداگانہ پڑھتے اور ہر ایک کو اس کی فضیلت کے وقت میں بجالاتے تھے؛ اور جس وقت نمازِ مغرب کے بعد اور وقت عشاء سے پہلے سو جاتے تو ممکن ہوتا کہ نمازِ عشاء کے لیے بیدار نہ ہوں۔

اس تفسیر کو "ابن عباس" نے "در منثور" کے مطابق پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے اور "امالی" "شیخ" میں بھی "امام جعفر صادقؑ" سے منقول ہے۔[1]

لیکن زیادہ تر روایات اور مفسرین کے کلمات میں نماز شب اور تہجد کے لیے بستر سے اٹھنے کی تفسیر آئی ہے۔

ایک روایت میں امام محمد باقرؑ سے اس طرح ہم پڑھتے ہیں کہ آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا۔

"الا اخبرک بالاسلام اصلہ وفرعہ وذروۃ سنامہ"

"کیا تجھے اسلام کی اصل و فرع اور بلند ترین چوٹی کا تعارف نہ کراؤں؟"

راوی نے عرض کیا قربان جاؤں ارشاد فرمایئے!

تو فرمایا۔

"اما اصلہ الصلوٰۃ وفرعہ الزکوٰۃ وذروۃ سنامہ الجہاد"

"اس کی اصل نماز اس کی فرع زکات اور اس کی بلند چوٹی جہاد ہے۔"

پھر آپ نے مزید فرمایا اگر تم چاہو تو تمام ابواب خیر کا تم سے تعارف کراؤں؟

راوی کہتا ہے میں آپ پر قربان جاؤں، ارشاد!

امام نے فرمایا:

---

[1] "در منثور" اور "امالی شیخ" بحوالہ "تفسیر المیزان" جلد ۱۶ صفحہ ۲۰۳۔

الصوم جنة، والصدقة تذهب بالخطيئة، وقيام الرجل في جوف الليل بذكر الله، ثم قرأ " تتجافى جنوبهم عن المضاجع "

" روزہ جہنم کی آگ سے سپر اور ڈھال ہے، اور صدقہ گناہ کو مٹا دیتا ہے، اور انسان کا رات کی تاریکی میں اٹھنا اسے یاد خدا میں ڈالتا ہے۔ پھر آپ نے " تتجافى جنوبهم عن المضاجع " کی آیت تلاوت فرمائی "۔ [1]

تفسیر "مجمع البیان" میں "معاذ بن جبل" سے یوں نقل ہوا ہے کہ میں جنگ "تبوک" میں رسول خدا کی خدمت میں حاضر تھا۔ گرمی نے سب کو پریشان کر رکھا تھا اور ہر شخص کسی نہ کسی کو نہ میں پناہ لیے ہوئے تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ پیغمبر سب سے زیادہ میرے قریب ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے اور جہنم کی آگ سے دور رکھے۔

فرمایا تو نے بہت بڑا سوال کیا ہے۔ لیکن اس کا جواب ایسے شخص کے لیے مشکل نہیں، جس پر خدا نے آسان کیا ہو۔ پھر آپ نے مزید فرمایا:

" تعبد الله ولا تشرك به شيئًا وتقيم الصلوة المكتوبة وتؤدي الزكوة المفروضة وتصوم شهر رمضان "

" خدا کی پرستش کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دو، واجب نمازوں کو بجا لاؤ، واجب زکوٰۃ جو محتاجوں کا حق ہے ادا کرو اور ماہ رمضان کے روزے رکھو "

اس کے بعد آپ نے فرمایا اگر چاہو تو خیرات کے دروازوں کی بھی تمہیں خبر دوں؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ضرور فرمایئے! فرمایا:

" الصوم جنة من النار والصدقة تكفر الخطيئة وقيام الرجل في جوف الليل يبتغي وجه الله ثم قرأ هذه الآية تتجافى جنوبهم عن المضاجع "

روزہ جہنم کی آگ سے ڈھال اور راہ خدا میں خرچ کرنا گناہوں کا کفارہ اور رات کی تاریکی میں انسان کا خدا کی خوشنودی کے لیے قیام۔ پھر آپ نے "تتجافى جنوبهم عن المضاجع" والی آیت کی تلاوت کی۔ [2]

اگرچہ کوئی مانع نہیں کہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہو کہ نماز عشاء کے لیے رات کے ابتدائی حصے میں بیدار

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ باب "دعائم الاسلام" حدیث ۱۵ ص ۳۰ مدرک گذشتہ۔

[2] مجمع البیان ذیل آیات زیر بحث و تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۲۹۔

رہنے کو بھی شامل ہو اور وقت سحر نماز شب کے لیے اُٹھنے کو بھی، لیکن اگر "تتجافیٰ" کے مفہوم پر زیادہ غور کیا جائے تو دوسرا معنی ذہن میں بہتر منعکس ہوتا ہے، کیونکہ اس جملہ کا ظہور یہ ہے کہ پہلے ان کے پہلو بستر میں آرام و سکون میں ہوتے ہیں۔ پھر اس سے جدا ہو جاتے ہیں اور یہ رات کے آخر حصہ میں نماز شب کی ادائیگی کے لیے قیام کرنے کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ اس بنا پر پہلی روایات مفہوم کو وسعت دینے اور خصوصیت کو ختم کرنے کے قبیل سے ہیں۔

اگرچہ اس بابرکت نماز کی اہمیت کے بارے میں وہی اوپر والی چند روایات ہی کافی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اسلامی روایات میں جس قدر اس عبادت کو اہمیت دی گئی ہے، کسی اور عبادت کے بارے میں بہت ہی کم گفتگو ہوئی ہے۔

حق تعالےٰ کے سچے دوست راہ فضیلت کے راہی اس لیے بے ریا عبادت کو ہمیشہ ہی سے بہت زیادہ اہمیت دیتے آرہے ہیں جو دل کو نور اور جلا بخشتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ اس بابرکت عبادت سے ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی توفیق نہ رکھتے ہوں۔ لیکن کیا مانع ہے کہ بعض راتوں میں جب بھی یہ توفیق حاصل ہو، اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اس وقت جب خاموشی ہر جگہ حکم فرما ہو اور ہر قسم کے کاروبار ٹھپ ہوں، بچے عالم خواب میں ہوں اور ماحول حضور قلب اور خدا سے راز و نیاز کے لیے آمادہ ہو تو اٹھیں اور خانۂ خدا کے دروازے پر جائیں اور دل کو دوست کے عشق کے نور سے روشن کریں۔ [1]

---

[1] نماز شب کی اہمیت اور اس کے بجالانے کا طریقہ جلد ۱۲ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۷۹ کے ذیل میں ہم بیان کر چکے ہیں

۲۱۔ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○

۲۲۔ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنْتَقِمُونَ ○

ترجمہ

۲۱۔ ہم انھیں (اس دنیا کا) نزدیکی عذاب (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے چکھائیں گے۔ شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔

۲۲۔ اس شخص سے بڑھ کر کون زیادہ ستم گر ہے، جسے اس کے پروردگار کی آیات کی یاد دہانی کرائی گئی ہو، لیکن وہ اس سے اعراض کرے۔ یقیناً ہم مجرمین سے انتقام لیں گے۔

تفسیر

تربیتی اور اصلاحی سزائیں:

گناہگاروں اور ان کی دردناک سزاؤں کے بارے میں تو گذشتہ آیات میں بحث ہو چکی ہے۔ موجودہ آیات میں ان کے بارے میں خدا کے ایک مخفی لطف کی طرف اشارہ ہے، جو دنیا میں خفیف اور بیدار کرنے والی سزاؤں کی صورت میں ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ خدا ہرگز نہیں چاہتا کہ بندہ عذاب جاودانی میں گرفتار ہو۔ لہٰذا بندے کی نجات کے لیے اُسے بیدار کرنے والے ہر قسم کے وسائل کو بروئے کار لاتا ہے۔

خدا اپنے پیغمبر بھیجتا ہے، آسمانی کتابیں نازل کرتا ہے، نعمت دیتا ہے، مصیبت میں گرفتار کرتا ہے اور اگر ان میں سے کسی چیز سے فائدہ نہ اٹھائیں تو پھر اس قسم کے اشخاص کا سوائے جہنم کی آگ کے کوئی اور انجام نہیں ہے۔

فرماتا ہے: "ہم انھیں دُنیا کا نزدیکی عذاب آخرت کے عذاب سے پہلے چکھائیں گے، شاید وہ بیدار ہو کر پلٹ آئیں"۔

(ولنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر لعلھم یرجعون)۔

یقیناً "عذاب ادنیٰ" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو زیادہ تر ان احتمالات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے جنہیں مفسرین نے بطور جداگانہ بیان کیا ہے۔

منجملہ ان کے اس سے مراد مصائب و درد اور رنج و غم ہیں۔

یا مکہ کا سات سالہ شدید قحط اور خشک سالی، جس میں مشرکین اس قدر گرفتار ہوئے کہ انھیں مجبوراً مردار لاشے کھانا پڑے۔

یا وہ کاری ضربیں جو ان کے پیکر پر جنگِ "بدر" میں وارد ہوئیں۔

اس قسم کے دوسرے امور۔

باقی رہا وہ جو بعض نے احتمال دیا ہے کہ مراد "عذاب قبر" یا "رجعت کا عذاب" ہے۔ وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ وہ "لعلھم یرجعون" (شاید وہ اپنے اعمال سے پلٹ آئیں) کے جملہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

البتہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ اس دُنیا میں بھی مختلف عذاب ہیں جن کے نزول کے وقت توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ "عذاب استیصال" یعنی وہ عذاب جو سرکش اقوام کی نابودی کے لیے اس وقت نازل ہوتا ہے جب ان میں اصلاح کا کوئی وسیلہ کارگر ثابت نہیں ہوتا اور طبعاً اس قسم کا عذاب بھی آیت کے موضوع بحث سے خارج ہے۔

باقی رہا "عذاب اکبر" جو قیامت کے دن کا عذاب ہے تو وہ ہر سزا اور عذاب سے بہت بڑا اور زیادہ دردناک ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیوں "ادنیٰ" (زیادہ نزدیک) "اکبر" (زیادہ بڑے) کے مقابلہ میں قرار پایا ہے۔ حالانکہ یا تو "ادنیٰ" "بعد" (زیادہ دور) کے مقابلہ میں ہوتا یا "اصغر" "اکبر" کے مقابلہ میں قرار پاتا؟ اس میں بھی ایک نکتہ مضمر ہے، جس کی طرف بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ دنیاوی عذاب دو اوصاف کا حامل ہوتا ہے "چھوٹا ہونا" اور "نزدیک ہونا" اور تہدید اور تنبیہ کے موقع پر مناسب نہیں ہوتا کہ اس کے چھوٹے پن کو مدنظر رکھا جائے بلکہ اس کے نزدیک ہونے کو دیکھا جائے گا۔

اور عذاب آخرت بھی دو اوصاف کا حامل ہوتا ہے "دُور ہونا" اور "بڑا ہونا" اور اس کے بارے میں بھی مناسب یہی ہے کہ اس کے بڑے ہونے کو مدنظر رکھا جائے نا کہ "دور ہونے کو"۔ (خوب غور کیجئے)

"لعلھم یرجعون" کے جملہ میں "لعل" کی تعبیر جیسا کہ پہلے بھی ہم نے کہا ہے، اس بناء پر ہے کہ تنبیہ اور خبردار کرنے والے عذاب بیداری کے لیے علت تامہ نہیں ہیں بلکہ علت کی جزء ہیں اور انھیں سازگار و آمادہ زمین کی ضرورت ہے جو اس شرط کے بغیر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے اور لفظ "لعل" اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

ضمناً اس آیت سے مصائب و آلام اور رنج و بلاؤں کا ایک اہم فلسفہ واضح ہو جاتا ہے جو توحید، خدا شناسی اور عدل پروردگار کی مباحث میں زیادہ سوال انگیز مسائل میں سے ہے۔

نہ صرف یہاں بلکہ قرآن کی دوسری آیات میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ موجود ہے منجملہ ان کے سورہ اعراف کی آیت ۹۴ میں ہم پڑھتے ہیں:

"وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اھلھا بالبأساء والضراء لعلھم یضرعون"

"ہم نے کسی شہر اور دیار میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر یہ کہ وہاں کے لوگوں کو مشکلات اور نقص و زیاں میں مبتلا کیا ہے تاکہ وہ بیدار ہوں اور خدا کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں"

اور چونکہ جس وقت بیدار کرنے والے وسائل میں سے کوئی بھی وسیلہ حتی کہ خدائی عذاب بھی سود مند ثابت نہیں ہوتا، تو پھر اس گروہ کے ظالم ترین لوگوں سے پروردگار کے انتقام کے علاوہ کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔

بعد والی آیت میں اس طرح فرماتا ہے: "کون سا شخص زیادہ ستم گر ہے اس شخص سے، جسے اس کے پروردگار کی آیات یاد دلائی جائیں اور وہ ان سے اعراض اور روگردانی کرے:" (ومن اظلم ممن ذکر بآیات ربہ ثم اعرض عنھا)۔

"یقیناً ہم ان بے ایمان مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے" (انا من المجرمین منتقمون)۔

حقیقت میں یہ ایسے لوگ ہیں جن پر نہ خدائی نعمتیں مؤثر ہیں اور نہ اس کا عذاب اور خبردار کرنے والی بلائیں اور مصائب اسی بنا پر ان سے زیادہ ظالم کوئی شخص نہیں ہے۔ لہٰذا اگر ان سے انتقام نہ لیا جائے تو پھر کس سے لیا جائے؟

ظاہر ہے کہ گذشتہ آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہاں "مجرمین" سے مراد مبدء یا معاد کے منکر اور بے ایمان گناہگار ہیں۔

آیات قرآن میں بارہا ایک گروہ کا "اظلم" (سب سے بڑھ کر ظالم افراد) کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے اگرچہ اس کی مختلف تعبیریں ہیں۔ لیکن واقع میں سب کی سب ایک اصل کی طرف لوٹتی ہیں، اور وہ ہے کفر و شرک اور بے ایمانی کی جڑ اس بناء پر "ظالم ترین" کا مفہوم جو اصطلاح کے مطابق سب سے بڑھ کر بری صفت ہے، وہ مخدوش نہیں ہوتی۔

اوپر والی آیت میں "ثم" کی تعبیر جو عام طور پر فاصلہ کو بیان کرنے کے لیے ہے، ہوسکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ اس قسم کے افراد کو سوچنے سمجھنے کے لیے کافی موقع اور مہلت دی جاتی ہے۔ کبھی بھی ابتدائی مخالفتیں انتقام الٰہی کا سبب نہیں بنتیں۔ لیکن ضروری فرصت اور مہلت کے ختم ہونے کے بعد خدا کے انتقام کے مستحق ہوں گے۔

ضمناً توجہ کرنا چاہیئے کہ "انتقام" کی تعبیر عربی لغت کے لحاظ سے "سزا دینے" کے معنی میں ہے۔ اگرچہ "دلی تشفی" (اندرونی تپش کا بجھانا) اس لفظ کے مفہوم میں روز مرہ کے استعمال کے لحاظ سے اس میں چھپا ہوا ہے لیکن اگر اس کے اصلی اور لغوی معنی کو دیکھا جائے تو اس میں موجود نہیں ہے۔

اس لیے قرآن مجید میں یہ تعبیر خداوند عالم کے بارے میں بارہا استعمال ہوئی ہے حالانکہ وہ اس قسم کے مفاہیم سے برتر اور بالاتر ہے۔ وہ صرف حکمت و مصلحت کی بناء پر کام کرتا ہے۔

۲۳- وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ

۲۴- وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۖ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝

۲۵- اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۳- ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی اور تجھے شک نہیں ہونا چاہیئے کہ اس نے آیاتِ الٰہی کو حاصل کر لیا۔ اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت کا ذریعہ قرار دیا۔

۲۴- اور ان میں سے ہم نے ائمہ (اور پیشوا) منتخب کیے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کی) ہدایت کرتے تھے۔ اس بناء پر کہ انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔

۲۵- یقیناً تمھارا پروردگار ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ (اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی سزا دے گا)۔

تفسیر

امامت کا اہم ترین سرمایہ:

زیر بحث آیات میں حضرت "موسیٰؑ" اور "بنی اسرائیل" کی داستان کی طرف ایک مختصر سا اشارہ ہے تاکہ پیغمبر اسلامؐ اور مومنین کی تسلی ہو اور ان کی دلداری کی جائے اور مشرکین کی تکذیب، انکار اور روڑے اٹکانے کے مقابلہ میں جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے، صبر و شکیبائی اور استقامت اور پائداری کی دعوت اور مومنین کے لیے بشارت بھی ہو کہ آخر کار وہ اس کافر اور ہٹ دھرم گروہ پر کامیابی حاصل کریں گے، جس طرح کہ بنی اسرائیل اپنے دشمنوں پر کامیاب ہوئے اور روئے زمین کے پیشوا اور امام و رہبر قرار پائے۔

اور چونکہ موسیٰؑ ایک عظیم پیغمبر ہیں کہ جن پر یہودی بھی ایمان رکھتے ہیں اور عیسائی بھی تو اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ قرآن و اسلام کی طرف اہل کتاب کی حرکت کا سبب بنیں۔

پہلے کہتا ہے "ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی۔" (ولقد آتینا موسی الکتاب)۔

"اس بنا پر آپ اپنے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ و تردد کو نہ آنے دیں کہ موسیٰؑ نے آیات الٰہی کو حاصل کر لیا؟" (فلا تکن فی مریة من لقائه)۔

"ہم نے موسیٰ کی آسمانی کتاب تورات کو بنی اسرائیل کی ہدایت کا ذریعہ قرار دیا؟" (وجعلناه هدی لبنی اسرائیل)۔

"من لقائه" کی ضمیر کس چیز کی طرف لوٹتی ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے اور اس سلسلے میں سات یا اس سے زیادہ احتمال دیئے گئے ہیں۔

لیکن جو احتمال سب سے زیادہ نزدیک نظر آتا ہے، یہ ہے کہ کتاب (یعنی تورات) کی طرف لوٹتی ہے اور مفعول کا پہلو رکھتی ہے اور اس کا فاعل موسیٰؑ ہے۔

اس بناء پر سارے جملہ کا معنی یوں ہوگا "تجھے شک نہیں ہونا چاہیئے کہ موسیٰ علیہ السلام کتاب آسمانی کی لقاء کو پہنچا، اور جو چیز خدا کی بارگاہ سے ان پر القاء ہوئی تھی اسے حاصل کر لیا۔"

اس تفسیر کا ناطق گواہ یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں تین جملے وارد ہوئے ہیں پہلا اور آخری جملہ یقیناً تورات کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اس بناء پر مناسب یہی ہے کہ درمیانی جملہ بھی اسی معنی کو بیان کرے تاکہ قیامت یا قرآن مجید کی بات کرے کیونکہ اس صورت میں جملہ معترضہ ہوگا اور ہم جانتے ہیں کہ جملہ معترضہ خلاف ظاہر ہے اور جب تک اس کی ضرورت نہ ہو اس کی طرف نہیں جانا چاہیئے۔

تنہا سوال جو اس تفسیر میں باقی رہ جاتا ہے وہ لفظ "لقاء" کے آسمانی کتاب کے بارے میں استعمال کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ قرآن میں تمام طور پر یہ لفظ "اللہ" یا "رب" یا "آخرت" وغیرہ کی طرف اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جو قیامت کی طرف اشارہ ہے۔

اور اسی بناء پر بعض مفسرین اس احتمال کو ترجیح دیتے ہیں کہ اوپر والی آیت نے پہلے تو موسیٰ پر تورات کے نزول کو بیان کیا ہے، پھر پیغمبر اسلام کو حکم دیا ہے کہ "لقاء اللہ" اور مسئلہ معاد میں شک و شبہ نہ کریں اور پھر از سر نو مسئلہ تورات کی طرف لوٹتا ہے۔

لیکن یقین جانیئے کہ اس صورت میں اس آیت کے جملوں کے درمیان مناسبت بالکل ختم ہو جائے گی اور ان کا باہمی رابطہ اور تعلق بالکل ختم ہو جائے گا۔

البتہ توجہ رکھنا چاہیئے کہ "لقاء" کا کلمہ اگرچہ قرآن میں کتب آسمانی کو حاصل کرنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا، لیکن "القاء" اور "تلقی" بارہا اس معنی میں استعمال ہوئے ہیں جیسا کہ سورۂ قمر کی آیت ۲۵ میں ہم پڑھتے ہیں "ءالقی الذکر علیہ من بیننا" کیا ہم سب کے درمیان میں سے قرآن مجید پر القاء ہوا ہے؟"

اور سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت سلیمانؑ کا خط ملکہ سبا کو ملا تو اس نے کہا:

"انی القی الی کتاب کریم"

"گرامی قدر خط مجھ پر القاء ہوا ہے۔" (نمل - ۲۹)

اور اسی سورہ کی آیت ۶ میں قرآن مجید کے بارے میں ہے:

"وانک لتلقی القرآن من لدن حکیم علیم"

"تو قرآن کو خدائے حکیم و علیم سے تلقی کرتا ہے۔ (نمل - ۶)

اس بناء پر فعل "القاء" و "تلقی" بارہا اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

یہاں تک کہ خود فعل "لقاء" انسان کے نامہ اعمال کے بارے میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ اسراء کی آیت ۱۳ میں ہے:

"ونخرج لہ یوم القیامۃ کتابا یلقاہ منشورا" (اسراء - ۱۳)

"قیامت کے دن اس انسان کے لیے ہم کتاب باہر نکالیں گے جسے کھلا ہوا دیکھے گا۔"

مجموعی طور پر جو کچھ ہم نے کہا ہے، اس سے اس تفسیر کی ترجیح اوپر والی آیت میں دیئے گئے باقی سارے احتمالات پر واضح ہو جاتی ہے۔ [1]

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے "لقائہ" کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام کو سمجھا ہے۔ تو اس قول کی بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا: "اے محمدؐ تمہیں شک نہیں ہونا چاہیئے کہ تم موسیٰؑ سے ملاقات کرو گے۔" اور اس کو انھوں نے شب معراج کی موسیٰ سے ملاقات (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن ہر صورت میں اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ پیغمبر اس قسم کے مسائل میں کبھی قسم کا شک و شبہ نہیں رکھتے تھے بلکہ اس قسم کی تعبیریں عموماً مقصد کی تائید اور دوسروں کے لیے نمونہ ہوتی ہیں۔

بعد والی آیت میں ان اعزازات کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل کو استقامت و ایمان کے زیر سایہ نصیب ہوئے تاکہ دوسروں کے لیے درس ہو فرماتا ہے۔ "اور ان میں سے ہم نے امام اور پیشوا قرار دیئے کہ جنہوں نے ہمارے فرمان اور حکم سے خلق خدا کی ہدایت کے امور کو اپنے ذمہ لیا کیونکہ انھوں نے صبر کا مظاہرہ کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔" (وجعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا وکانوا بآیاتنا یوقنون)۔

یہاں پر کامیابی کا راز اور پیشوائی اور امامت کی شرط دو چیزوں کو بیان کرتا ہے۔ ایک آیاتِ الٰہی پر ایمان و یقین اور دوسری صبر و استقامت۔

یہ چیزیں بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام امتوں اور ماضی حال و مستقبل کے مسلمانوں کے لیے درس ہے کہ وہ اپنے یقین کی بنیادوں کو محکم کریں اور ان مشکلات سے خوف زدہ نہ ہوں جو خطِ توحید بار آور کرنے کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ صبر و استقامت کو اختیار کریں تاکہ تاریخ عالم میں مخلوق کے امام اور امتوں کے رہبر اور رہنما قرار پائیں۔

"یھدون" (ہدایت کرتے ہیں) کی تعبیر فعل مضارع کی شکل میں اور اسی طرح "یوقنون" (یقین رکھتے ہیں) بھی فعل

(گذشتہ صفحہ کا باقی حاشیہ) یا قیامت کے دن کی ملاقات کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ لیکن یہ معنی مفہوم جملہ کے ساتھ مناسب نظر نہیں آتا، بعض دوسروں نے کہا ہے کہ

ضمیر کا مرجع "الکتاب" ہے اور اس سے مراد قرآن ہے۔ تو اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا:

"اے پیغمبر! اس سلسلہ میں کہ قرآن وحی الٰہی ہے شک و شبہ کو اپنے اندر راہ نہ دو۔"

یہ معنی اگرچہ اس سورہ کی ابتدائی آیات کے ساتھ مناسب ہے لیکن دوسرے جملوں کے ساتھ جو خود اس آیت میں ہیں، چنداں مناسب نہیں ہے۔ علاوہ ازیں زیر بحث آیت میں "کتاب" تورات کے معنی میں ہے اور ضمیر کی سوئے قرآن بازگشت اس سے ہماہنگی نہیں رکھتی، اور اس معنی کی یہ توجیہ کہ اس سے مراد مطلق آسمانی کتاب ہے، پھر بھی اس کے خلاف ظاہر ہونے میں کمی نہیں کرتی۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ

"لقائہ" کی ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے اور یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ معاد اور قیامت کے معاملہ میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ کرو۔ یہ معنی بھی اگرچہ گذشتہ آیات کے نامناسب نہیں ہے لیکن خود زیر بحث آیت کے مضمون کے ساتھ تقریباً کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتا۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے یہ جو بعض تفاسیر نے آیت کو موسیٰؑ اور پیغمبر اسلام کے پروگرام کے دو خطوط سے باہمی ملاپ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ نیز ایک باذوق مطلب تو ہے، لیکن آیت کے الفاظ کے واقعی مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس بنا پر واضح ترین تفسیر وہی ہے، جو ہم نے پیش کی ہے۔

مضارع کی صورت میں ان کی تمام عمر میں ان دو اوصاف کے دوام کی دلیل ہے، کیونکہ رہبری کا مسئلہ ایک لمحہ کے لیے بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے اور ہر ہر قدم پر رہبر اور لوگوں کے پیشوا کی ذات نت نئی مشکل سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا اسے چاہیئے کہ یقین اور دائمی استقامت کی قوت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرے اور امر الٰہی کے خطِ ہدایت کو دوام عطا کرے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مسئلہ ہدایت کو "امرِ الٰہی" سے مقید کرتے ہوئے فرماتا ہے "یھدون بامرنا" اور امرِ ہدایت میں اہم یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ خدا کا فرمان ہو نہ کہ لوگوں کا اور نہ ہی اپنی خواہش اور دلی تمنا اور نہ ہی ہر کہ ومہ کی تقلید ہو۔

امام جعفر صادقؑ اپنی ایک حدیث میں قرآن مجید کے مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے "ائمہ اور پیشواؤں کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور زمانے میں ایک وہ امام جو امرِ خدا سے، تاکہ لوگوں کے حکم سے ہدایت اپنے ذمہ لیتے ہیں اور امرِ خدا کو اپنے امر پر مقدم شمار کرتے ہیں۔ اور اس کے حکم کو اپنے حکم سے برتر قرار دیتے ہیں۔

اور دوسرے وہ امام جو جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں، اپنے حکم کو فرمانِ حق پر مقدم کرتے ہیں اور اپنے فرمان کو حکمِ الٰہی سے پہلے قرار دیتے ہیں اور اپنی خواہشاتِ نفسانی کے مطابق اور کتاب اللہ کے خلاف عمل کرتے ہیں۔[1]

یہاں امر سے مراد امرِ تشریعی (خدا کے شرعی احکام ہیں) یا امرِ تکوینی (عالمِ آفرینش میں خدا کا حکم) ہے۔ ظاہر آیت میں تو وہی پہلا معنی ہے اور روایات و مفسرین کی تعبیریں بھی اسی معنی کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

لیکن بعض عظیم مفسرا سے "امرِ تکوینی" کے معنی میں بھی سمجھتے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ آیات اور روایات میں ہدایت دو معنی کے لیے آئی ہے۔ "ارائہ طریق" (راستہ دکھانا) "وایصال الی المطلوب" (مقصد تک پہنچانا)۔

خدا کے مقرر کردہ پیشواؤں کی ہدایت بھی دو طریقوں سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ کبھی تو صرف امر و نہی پر قناعت کرتے ہیں اور کبھی لائق اور آمادہ دلوں میں باطنی تاثیر کے ذریعہ انھیں تربیت کے مقاصد اور روحانی درجات تک پہنچاتے ہیں۔

لفظ "امر" بعض قرآنی آیات میں "امرِ تکوینی" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

"انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون" (سورہ یٰس آیت ۸۲)

"جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا فرمان صرف یہ ہوتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔"

زیرِ بحث آیت میں "یھدون بامرنا" کا جملہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ ایسے امام اور پیشوا تھے جو

---

[1] ان الائمۃ فی کتاب اللہ عز وجل امامان: قال اللہ تبارک وتعالیٰ وجعلنا ائمۃ یھدون بامرنا لا بامر الناس یقدمون امر اللہ قبل امرھم وحکم اللہ قبل حکمھم قال وجعلناھم ائمۃ یدعون الی النار یقدمون امرھم قبل امر اللہ وحکمھم قبل حکم اللہ ویأخذون باھوائھم خلاف ما فی کتاب اللہ عز وجل۔ (کافی جلد اول ص ۱۸۶ باب ان الائمۃ فی کتاب اللہ امامان)

پروردگار کی قدرت سے آمادہ نفوس میں اثر کرتے تھے اور انھیں تربیت کر کے انسانیت کے اعلیٰ وارفع مقاصد کی طرف لے جاتے ہیں۔[1]

یہ معنی فی نفسہ ایک قابل توجہ معنی ہے جو امور امامت اور فروغ ہدایت میں سے ایک ہے۔ لیکن "یھدون بامرنا" کے جملہ کو اس معنی میں منحصر سمجھنا ظاہر آیت کے ساتھ موافق نہیں ہے۔ البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہم لفظ "امر" کو اس جملہ میں اس لفظ کے وسیع معنی میں لیں جو "امر تکوینی" اور "امر تشریعی" دونوں کو شامل ہو اور ہدایت کے دونوں معنی آیت میں جمع ہو جائیں۔ یہ معنی بعض ان احادیث کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے کہ جو آیت کی تفسیر میں ہم تک پہنچی ہیں۔

ہر حالت میں امام اور پیشوا کا اس مقام تک پہنچنا صرف یقین و استقامت کے پرتو میں ہی امکان پذیر ہے۔

البتہ جو بحث یہاں باقی رہ جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ آیا بنی اسرائیل میں ائمہ اور پیشواؤں سے مراد انبیاء کرام ہیں جو اس قوم میں موجود تھے یا وہ علماء و دانش مند ہیں جو حکم الٰہی سے لوگوں کو نیکیوں کی ہدایت کرتے تھے؟

آیت اس بارے میں خاموش ہے۔ وہ صرف اس قدر کہتی ہے کہ ہم نے ان میں ایک جماعت کو امام اور ہادی قرار دیا ہے۔ لیکن "جعلنا" (ہم نے قرار دیا) کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیادہ تر یہی نظر آتا ہے کہ مراد پیغمبر ہیں جو خدا کی طرف سے اس مقام کے لیے منصوب تھے۔

اور چونکہ بنی اسرائیل نے دوسری امتوں کی طرح ان پیچے ائمہ اور پیشواؤں کے بعد اختلاف شروع کر دیئے، مختلف راستے طے کئے اور لوگوں کے درمیان فرقہ بندی کو ہوا دی۔ لہٰذا آخری محل بحث آیت میں تہدید آمیز لہجہ میں کہتا ہے "تیرا پروردگار ان کے درمیان قیامت کے دن ان اختلافات کے بارے میں جو اُن کے درمیان تھے، فیصلہ کرے گا۔" اور ہر شخص کو اس کے کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ (ان ربک ھو یفصل بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)۔

ہمیشہ حق کو "خواہشاتِ نفسانی" کے ساتھ مخلوط کر دینے سے ہی اختلاف پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا قیامت کے دن تمام خواہشات اور ہوا اور ہوس کافور ہو جائیں گی اور حق اپنی اصلی شکل و صورت میں ظہور پزیر ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں خدا اپنے فرمان کے ذریعہ تمام اختلافات کو ختم کر دے گا۔ یہ معاد و قیامت کا ایک اور فلسفہ ہے۔ (غور کیجئے گا)

ایک نکتہ:

خدائی رہبروں کا صبر و استقامت: ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ زیر بحث آیات میں پیشواؤں اور ائمہ کے لیے دو شرائط ذکر ہوئی ہیں، پہلی صبر و استقامت اور دوسری آیاتِ الٰہی پر ایمان و یقین۔

صبر و استقامت کی بہت زیادہ شاخیں ہیں۔ یہ کبھی تو ان مصائب کے مقابلہ میں ہوتا ہے جو خود انسان کو درپیش ہوتے ہیں۔

---

[1] تفسیر المیزان جلد اوّل صـ ۲۷۵۔

کبھی ان رنج وغم اور تکالیف کے مقابلہ میں ہوتا ہے جو انسان کے دوست اور احباب اس کو دیتے ہیں۔
اور کبھی اس کے مقدس مقامات کے بارے میں طعن وتشنیع کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔
کبھی کج فکر اور کج اندیش لوگوں کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے۔
کبھی بدخواہوں کی طرف سے۔
کبھی جاہلوں اور نادانوں کی طرف سے۔
اور کبھی آگاہ اور سمجھدار بدخواہوں کی طرف سے!
خلاصہ یہ کہ ایک آگاہ اور دُور اندیش رہبر کو ان تمام مشکلات وغیرہ کے مقابلہ میں استقامت اختیار کرنا چاہیئے۔ کبھی بھی میدانِ حوادث سے نہ ہٹے، بے تابی اور جزع اور فزع نہ کرے، زمام اختیار ہاتھ سے نہ جانے دے، مایوس نہ ہو اضطراب اور پشیمانی کا مظاہرہ نہ کرے تاکہ وہ اپنے عظیم مقصد تک پہنچ جائے۔
اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک جامع حدیث نقل ہوئی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔
آپ نے اپنے ایک صحابی سے ارشاد فرمایا:
"جو شخص صبر کرتا ہے تو اس کا یہ صبر تھوڑی سی مُدت کے لیے ہوتا ہے (اس کے بعد کامیابی ہوتی ہے) اور جو شخص بے تابی کرتا ہے، تو اس کی بے تابی بھی مختصر مدت کے لیے ہوتی ہے (آخر کار شکست ہے)۔
اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:
"تم پر لازم ہے کہ تمام امور میں صبر وشکیبائی کا مظاہرہ کرو، کیونکہ خدائے بزرگ وبرتر نے حضرت محمدؐ کو مبعوث کیا اور انھیں صبر ومدارات کا حکم دیا۔"
اور فرمایا:
"جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کے مقابلہ میں صبر اختیار کرو اور ضرورت کی صورت میں ان سے الگ ہو جاؤ۔ لیکن اس حد تک بھی جدائی ٹھیک نہیں کہ وہ حق کی طرف دعوت دینے سے ہی روک دے۔"
نیز فرمایا:
"نیکیوں کا ہتھیار لے کر برائیوں کے مقابلہ میں کھڑے ہو جاؤ۔ کیونکہ اس موقع پر جو لوگ تمہارے ساتھ عداوت اور دشمنی رکھتے ہیں وہ صمیمی اور مخلص دوست کی مانند ہو جائیں اور اس مقام پر سوائے صابرین اور ان لوگوں کے اور کوئی نہیں پہنچ سکتا جن کے پاس ایمان کا ایک عظیم حصہ ہے۔"
پھر فرمایا:
"پیغمبرؐ نے صبر وشکیبائی اختیار کی، یہاں تک کہ لوگوں نے ان پر انواع واقسام کی تہمت کے تیر چلائے (انھیں مجنون اور ساحر کہا، شاعر کہہ کر پکارا اور انھیں دعوت نبوت میں جھٹلایا) ان کی باتیں سُن کر پیغمبرؐ تنگ آگئے، خدا نے یہ ارشاد ان پر نازل کیا: "ہم جانتے ہیں کہ تمہارا سینہ ان کی باتوں سے تنگ ہو جاتا ہے لیکن تم اپنے

پروردگار کی تسبیح وحمد بجالاؤ اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جاؤ" (کیونکہ یہی عبادتیں تمھیں آرام وسکون بخشیں گی)۔

دوبارہ انھوں نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کو متہم کیا تو آنجناب غمگین ہوئے تو خدا نے ان پر یہ ارشاد نازل کیا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں آپ کو غمگین کرتی ہیں، لیکن آپ جان لیں کہ ان کا مقصد آپ کو غمگین کرنا نہیں بلکہ یہ ظالم تو آیاتِ خدا کی تکذیب کرتے ہیں۔ آپ سے پہلے جو پیغمبر آئے تھے وہ بھی ان کی تکذیب کی آماجگاہ تھے لیکن انھوں نے صبر کیا۔ انھیں آزار دیا گیا۔ مگر انھوں نے صبر کیا یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد ونصرت آپہنچی۔ پیغمبرؐ نے بھی صبر کیا۔ یہاں تک کہ وہ حد سے گزر گئے اور خدا کا نام بھی بُرے الفاظ کے ساتھ زبان پر جاری کیا اور تکذیب کی۔

پیغمبر اکرمؐ نے عرض کیا، خداوندا میں نے اپنے بارے میں، اپنے خاندان اور عزت وآبرو کے بارے میں صبر اختیار کیا۔ لیکن تیرے مقام مقدس کے بارے میں بد دُعا کی، جس پر صبر نہیں کر سکتا۔ پھر بھی خدا نے انھیں صبر کا حکم دیا اور فرمایا "وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو"۔

پھر مزید کہتا ہے کہ اس کے بعد وہ پیغمبرؐ تمام حالات میں اور تمام مشکلات کے مقابلہ میں صابر ودشکیبا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں انھیں بشارت دیتا ہے کہ تمھارے خاندان میں ائمہ اور پیشوا پیدا ہوں گے اور ان ائمہ کو بھی صبر کی وصیت کی۔ اسی موقع کے لیے پیغمبرؐ نے فرمایا:

"الصبر من الایمان کالرأس من الجسد"

"صبر کو ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو بدن سے ہوتی ہے"۔

اور آخر کار آپ کا یہی صبر واستقلال مشرکین پر آپؐ کی کامیابی کا سبب بنا اور ان ستم گاروں سے انتقام لینے کا حکم صادر ہوا جو قابلِ ہدایت نہیں تھے۔ اور ان کی زندگی کا روزنامچہ پیغمبرؐ اور ان کے رفقائے کار کے ہاتھوں لپیٹ دیا گیا۔ یہ تو دُنیا میں ان کے صبر کی جزا تھی لیکن آخرت کا جو ثواب وجزا، آپ کے لیے ذخیرہ کیا گیا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے۔

پھر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"فمن صبر و احتسب لم یخرج من الدنیا حتی یقر اللہ عینا فی اعدائہ مع ما یدخر لہ فی الآخرۃ"

جو شخص صبر کرے اور اس صبر کو خدا کے کھاتے میں ڈال دے وہ دنیا سے اس وقت تک خارج نہیں ہوگا جب تک خداوند عالم اس کی آنکھوں کو اس کے دشمنوں کی شکست کے ذریعہ ٹھنڈا نہیں کر دیتا۔ لیکن آخرت کا وہ اجر اس کے علاوہ ہے جو اس کے لیے ذخیرہ کیا جا چکا ہے"۔[1]

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ صفحہ ۹۲ باب الصبر (خلاصہ کے ساتھ)۔

۲۶۔ اَوَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ ؕ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ ۝

۲۷۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ ۝

۲۸۔ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

۲۹۔ قُلْ یَوْمَ الْفَتْحِ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِیْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ۝

۳۰۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ کیا ان کی ہدایت کے لیے یہی کافی نہیں کہ ہم نے بہت سے افراد کو ہلاک کر دیا ہے، جو ان سے صدیوں پہلے گزر چکے ہیں؟ یہ ان کے (ویران شدہ) گھروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ اس میں (خدا کی قدرت اور اس کے دردناک عذاب کی نشانیاں ہیں) کیا وہ سنتے نہیں؟

۲۷۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک زمینوں کی طرف چلاتے

ہیں اور اس کے ذریعہ زراعتیں اگاتے ہیں کہ جن سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی۔ کیا وہ دیکھتے نہیں؟

۲۸۔ اور وہ کہتے ہیں، اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ تمہاری کامیابی اور فتح کب ہوگی۔

۲۹۔ کہہ دے کامیابی کے دن ایمان لانا کافروں کے لیے سود مند نہیں ہوگا اور انھیں کسی قسم کی مہلت نہیں دی جائے گی!

۳۰۔ اب جبکہ ایسا ہی ہے تو ان سے منہ پھیر لے اور منتظر رہ، وہ بھی منتظر ہیں۔ (تو رحمت خدا کا منتظر رہ اور وہ اس کے عذاب کے منتظر ہیں)۔

تفسیر

ہماری کامیابی کا دن:

گذشتہ آیات میں بے ایمان مجرمین کی تنبیہ موجود تھی اور زیر بحث پہلی آیت بھی اس تنبیہ کی تشریح اور تکمیل کے طور پر ہے فرماتا ہے: "کیا یہی بات ان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے کہ لوگوں میں سے بہت سے افراد جو ان سے صدیوں پہلے زندگی بسر کرتے تھے، ہم نے انھیں ہلاک کیا اور انھیں ان کے اعمال کی سزا دی" (اولم یھد لھم کم اھلکنا من قبلھم من القرون)۔[1]

"یہ ان کے ویران شدہ گھروں میں چلتے پھرتے ہیں"[2] اور ان نفرین شدہ اقوام کے آثار اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں: (یمشون فی مساکنھم)۔[3]

---

[1] "لم یھد" کا فاعل ایک مفہوم ہے جو "کم اھلکنا من قبلھم" کے جملہ سے سمجھا جاتا ہے۔ تقدیری طور پر یوں ہے "اولم یھد لھم کثرۃ من اھلکنا"۔

[2] اکثر مفسرین اس آیت کو اسی طرح بیان کرتے ہیں، جس طرح ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ "یمشون" کا جملہ ہلاک ہونے والوں کی حالت بیان کر رہا ہے۔ یعنی ان کی حالت یہ تھی کہ وہ عذاب الٰہی سے پوری طرح بے خبر تھے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"عاد" و "ثمود" کی عذاب میں مبتلا سرزمین اور "قوم لوط" کے ویران شدہ شہر شام کی طرف جاتے ہوئے ان کے راستوں میں موجود ہے۔ جس وقت ان سرزمینوں سے گزرتے ہیں۔ جو ایک دن قدرت مند لیکن گمراہ آلودہ گناہ اقوام کا مرکز تھیں، جتنا پیغمبر وانبیاء انھیں خبردار کرتے، اس کا کوئی اثر نہ ہوتا اور آخر کار عذاب الٰہی نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ تو گویا بیابان کا ایک ایک سنگریزہ اور ان کے ویران شدہ قصور و محلات زبان حال کے ساتھ پکار پکار کر ان کی کفر آلود زندگی کا انجام بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مکمل طور پر اپنے کان کھو بیٹھے ہیں جو سن نہیں پاتے۔

اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے "اس موضوع میں قدرت خدا کی نشانیاں اور عبرت کے درس ہیں۔ کیا وہ سنتے نہیں ہیں؟" (ان فی ذالک لآیات افلا یسمعون)۔

بعد والی آیت میں ایک اہم ترین نعمت الٰہی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تمام زمینوں کی آبادی کا سبب اور تمام زندہ موجودات کی حیات کا ذریعہ ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ جس طرح خدا شہکار لوگوں کی زمینوں کے ویران کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اسی طرح ویران اور مردہ زمینوں کے آباد کرنے اور اپنے بندوں کو ہر قسم کی نعمت و بخشش عطا کرنے پر بھی قادر ہے۔

فرماتا ہے "کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک اور بے آب و گیاہ زمینوں کی طرف چلاتے ہیں اور اس کے ذریعہ فصلیں اگاتے ہیں کہ جس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی غذا حاصل کرتے ہیں۔ کیا وہ دیکھتے نہیں؟" (اولم یروا انا نسوق الماء الی الارض الجرز فنخرج بہ زرعا تاکل منہ انعامھم وانفسھم افلا یبصرون)۔

"جُرز" (بروزن "شتر") اس زمین کو کہتے ہیں جس سے ہر قسم کے سبزہ کی بیخ کنی کی جا چکی ہو یا بالفاظ دیگر جس میں کسی قسم کی گھاس پھونس نہ اگ سکے اور یہ دراصل "جرز" (بروزن "مرض") کے مادہ سے قطع کرنے یا کاٹ دینے کے معنی میں ہے۔

گویا ہر قسم کی گھاس اس سرزمین سے کاٹ دی گئی ہے یا خود زمین نے اس سبزے کو کاٹ دیا ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ یہاں "نسوق الماء" (ہم پانی کو چلاتے ہیں) کی تعبیر بیان ہوئی ہے۔ جو اس طرف اشارہ ہے کہ پانی کی طبیعت اور اس کا مزاج اپنی سنگینی کی بنا پر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ وہ زمین کے اوپر اور گڑھوں میں موجود ہو اور اس کے سیال ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اسے زمین کی گہرائیوں کے اندر ہونا چاہیئے۔ لیکن جس وقت اسے ہمارا فرمان پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنی طبیعت کو چھوڑ کر ہلکے بخارات میں تبدیل ہو کر ہوا کے چلنے سے ہر طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔

جی ہاں یہی بادل جو آسمان کی بلندی میں ہیں درحقیقت میٹھے پانی کے عظیم سمندر ہیں۔ جو حکم خدا کے مطابق ہواؤں کی مدد سے خشک زمینوں کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔

سچ مچ اگر بارش نہ ہوتی تو بہت سی زمینیں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ دیکھ پاتیں۔ حتی کہ اگر بالفرض دریا اور ندی نالے پانی سے

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) اور اپنے گھروں میں چل پھر رہے تھے کہ اچانک عذاب الٰہی آ پہنچا اور انھیں ہلاک کر دیا۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

لبریز بھی ہوتے تو بھی پانی ان زمینوں پر مسلط نہ ہو سکتا۔ لیکن اب جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس رحمت الٰہی کی برکت سے بہت سے پہاڑوں کی بلندیاں، دشوار گزار درّے، اونچے اونچے ٹیلے اور اوپر کے بہت سے جنگل، فراواں درخت اور بہت سے سبزہ جات سے سبزہ زار بنے ہوئے ہیں۔ تو آبیاری کی یہ عجیب قدرت صرف بارش میں ہے۔ کسی اور چیز میں یہ طاقت نہیں تھی۔

"زرع" یہاں ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کی نباتات اور درختوں کو شامل ہے۔ اگرچہ کبھی کبھار استعمال کے موقع پر صرف درخت کے مقابل قرار پاتا ہے۔

اس آیت میں "چوپاؤں" کو "انسانوں" پر مقدم اس بنا پر کیا گیا ہے کہ چوپاؤں کی ساری غذا نباتات اور گھاس ہے جب کہ انسان کی غذا سبزہ بھی ہے اور چوپاؤں کا گوشت بھی۔

اور یا اس بنا پر کہ نباتات اُگتے ہی چوپاؤں کے لیے قابل استفادہ ہوتی ہیں جب کہ انسان کا نباتات سے استفادہ عام طور پر بعد کے زمانہ سے متعلق ہوتا ہے، یعنی جس وقت وہ اپنے دانے اور پھل کا بار اُٹھا لیتے ہیں۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ زیر بحث آیت کے آخر میں "افلا یبصرون" (کیا وہ دیکھتے نہیں ہیں) کا جملہ آیا ہے جبکہ گذشتہ آیت کے ذیل میں جہاں گذشتہ قوموں کے ویران شدہ قصور و محلات اور گھروں کی بات ہے "افلا یسمعون" (کیا وہ سنتے نہیں) کا جملہ آیا ہے۔

یہ فرق اس بنا پر ہے کہ بنجر زمینوں کے زندہ ہونے کا منظر بارش کے نزول کی وجہ سے سب لوگ آنکھ سے دیکھتے ہیں جبکہ گذشتہ قوموں سے متعلق مسائل عام طور پر خبروں کے طور پر سنتے ہیں۔

اوپر والی دونوں آیات کے مجموعہ سے جو نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ گویا خدا اس سرکش گروہ سے فرماتا ہے کہ اپنی آنکھ اور کان کھول کر حقائق کو سنو، دیکھو اور ان پر غور کرو کہ کس طرح ہم نے ایک دن ہواؤں کو حکم دیا کہ قوم عاد کے قصور اور محلات کو تباہ و برباد کر دو۔ دوسرے دن انھیں ہواؤں کو حکم دیا کہ پانی سے بھرے بادلوں کو مُردہ اور بنجر زمینوں کی طرف لے جاؤ اور انھیں آباد و سرسبز کرو۔ کیا ہماری اس قسم کی قدرت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے ہو؟

چونکہ گذشتہ آیات مجرمین کو انتقام کی تہدید اور مومنین کو امامت، پیشوائی اور کامیابی کی بشارت دے رہی تھیں، یہاں پر کفار غرور و نخوت سے یہ سوال پیش کرتے ہیں کہ یہ وعدے اور وعید کب عملی صورت اختیار کریں گے؟ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے۔ "وہ کہتے ہیں اگر تم سچ کہتے ہو تو تمھاری یہ فتح و کامرانی کب آئے گی؟" (ویقولون متی ھذا الفتح ان کنتم صادقین)۔

تو قرآن فوراً انھیں جواب دیتا ہے اور پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے۔ "کہہ دے آخر کار کامیابی کا دن آ کے رہے گا۔ لیکن اس دن ایمان لانا کافروں کے لیے سُود مند نہ ہوگا، اور کسی قسم کی انھیں مہلت بھی نہیں دی جائے گی" (قل یوم الفتح لا ینفع الذین کفروا ایمانھم ولا ھم ینظرون)۔

یعنی اگر تمھارا مقصد یہ ہے کہ خدائی وعدوں کی صداقت جو پیغمبر کی زبانی تم نے سُنی ہے، اسے آنکھوں سے

دیکھو اور پھر ایمان لے آؤ تو پھر اس دن دیر ہو چکی ہو گی اور ایمان تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "یوم الفتح" سے "عذاب استیصال" کے نزول کا دن ہے یعنی وہ عذاب جو کفار کی بیخ کنی کر دے گا اور انھیں ایمان لانے کا موقع بھی نہیں دے گا۔ دوسرے لفظوں میں عذاب استیصال دنیاوی عذاب کی ایک قسم ہے نہ کہ عذاب آخرت کی اور نہ عام دنیا کے عذابوں کی جو مکمل طور پر اتمام حجت کے بعد گناہگار قوموں کی زندگی کو ختم کر دیتے ہیں۔

اس گفتگو کے شاہد چند امور ہیں:

الف:۔ اگر عذاب سے مراد عام عذاب ہو یا جنگ بدر یا روز فتح مکہ جیسی مسلمانوں کی کامیابی مراد ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے تو "لا ینفع الذین کفروا ایمانھم" (اس دن کفار کو ان کا ایمان نفع نہیں دے گا) ٹھیک نہیں ہو گا۔ کیونکہ فتح بدر کے دن بھی اور فتح مکہ کے روز بھی ایمان لانا مفید تھا اور توبہ کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

ب:۔ اور اگر "یوم الفتح" سے مراد قیامت کا دن ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے اسے اپنایا ہے تو وہ "ولا ھم ینظرون" "انھیں مہلت نہیں دی جائے گی" کے جملہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے، کیونکہ مہلت دینا یا نہ دینا اس دنیا کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے قطع نظر، قرآن کے کسی مورد میں بھی "یوم الفتح" کے الفاظ قیامت کے معنی میں استعمال نہیں ہوئے۔

ج:۔ "فتح" کی تعبیر "عذاب استیصال" کے بارے میں قرآن مجید میں بار بار نظر آئی ہے۔ مثلاً سورہ شعراء کی آیت ۱۱۸ کہ جہاں حضرت نوح کہتے ہیں: (فافتح بینی وبینھم فتحا ونجنی ومن معی من المؤمنین) "پروردگارا! میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر اور اس ستمگر قوم کی بیخ کنی فرما اور مجھے ان تمام مومنین کو جو میرے ساتھ ہیں، نجات دے"۔ جو عذاب طوفان کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح سورۂ مومنون کی آیت ۲۸ میں بھی یہی صورت حال ہے۔

لیکن اگر مراد دنیا کا "عذاب استیصال" ہو تو جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے سازگار اور اوپر کے تمام قرائن سے ہم آہنگ ہے۔ اور واقع میں کفار و ظالمین کو تنبیہ ہے کہ اس قدر مومنین کی کامیابی اور کفار کے عذاب استیصال کے وعدہ کی درخواست نہ کرو۔ کیونکہ اگر اس درخواست کو عملی شکل دے دی گئی تو نہ تو پھر تمہیں موقع دیا جائے گا اور اگر موقع ملا بھی اور تم ایمان لے بھی آئے تو قابل قبول نہیں ہو گا۔

یہ معنی خصوصیت کے ساتھ گذشتہ آیات کے ساتھ ہیں جو سرکش قوموں کی ہلاکت کے بارے میں ہیں کہ جو قرون گذشتہ میں زندگی بسر کرتی تھیں اور جو عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر نیست و نابود ہو گئیں۔

کیونکہ کفار مکہ طبعاً سرکشی اور ہٹ دھرمی کی بناء پر اس قسم کے موضوع کی اپنے بارے میں درخواست کرتے تھے جو قبل کی دو آیات میں آئی ہے، لیکن قرآن انھیں تنبیہ کرتا ہے کہ وہ ہرگز اس قسم کا تقاضا نہ کریں۔ کیونکہ اگر عذاب نازل ہوا

تو کوئی چیز تمہارے لیے باقی نہیں رہے گی۔

آخر کار اس سورہ (سورۂ سجدہ) کی آخری آیت کے ساتھ ناطق اور معنی خیز تہدید کے ذریعہ سورہ کو ختم کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"اے پیغمبر! اب جبکہ ایسا ہے۔ ان سے منہ پھیر لو اور تم بھی منتظر رہو اور وہ بھی منتظر رہیں:" (فاعرض عنهم وانتظر انهم منتظرون)۔

اب جبکہ نہ تو بشارت انھیں اثر کرتی ہے اور نہ انذار (ڈرانا) اور نہ ہی وہ اہلِ منطق و استدلال ہیں تاکہ وسیع عالم خلقت میں آثارِ الٰہی کے مشاہدہ کرنے سے اسے پہچانیں اور اس کے غیر کی پرستش ترک کر دیں۔ اور نہ ہی بیدار ضمیر رکھتے ہیں کہ اپنی جان کے اندر سے بلند ہونے والے نغمۂ توحید پر کان دھریں۔ لہٰذا ان سے روگردانی کر کے منہ پھیر لیجئے اور اپنے خدا کی رحمت کے منتظر رہیئے اور وہ اس کے عذاب کے منتظر رہیں۔ کیونکہ وہ صرف عذاب کے لائق ہیں۔

پروردگار! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے جو حق کی اوّلین نشانی کو دیکھ کر اس کے سامنے جھک جاتے اور ایمان لے آتے ہیں۔

بارالٰہا! تکبر، غرور، سرکشی اور ہٹ دھرمی کی رُوح ہم سب سے دور فرما۔

خداوند! کفر و استکبار اور استعمار کے لشکروں پر لشکرِ اسلام کو مکمل کامیابی جلد سے جلد عطا فرما۔

سورۂ سجدہ کا اختتام

۲ محرم الحرام ۱۴۰۴ - ۱۸ مہر ماہ ۱۳۶۲

سُورۂ احزاب

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی
اور
۷۳ آیات پر مشتمل ہے

سورۂ احزاب
کی
وجہ تسمیہ اور فضیلت

یہ سورہ باتفاق علمائے اسلام مدینہ میں نازل ہوا اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کی کل ۷۳ آیات ہیں اور چونکہ اس سورہ کا اہم حصہ جنگِ احزاب (خندق) کے واقعہ کو بیان کرتا ہے، اس لیے اس کا یہ نام انتخاب ہوا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ پیغمبرِ اسلام فرماتے ہیں:

"من قرء سورة الاحزاب وعلمها اهله ..... اعطى الامان من عذاب القبر"

"جو شخص سورۂ احزاب کی تلاوت کرے اور اپنے گھر والوں کو اس کی تعلیم دے تو وہ عذاب قبر سے مامون رہے گا۔" [1]

اور امام صادقؑ سے بھی منقول ہے،

"من كان كثير القراءة لسورة الاحزاب كان يوم القيامة فى جوار محمد (ص) وآله وازواجه"

"جو شخص سورۂ احزاب کی زیادہ تلاوت کرتا ہے قیامت کے دن پیغمبرِ اکرمؐ اور ان کے خاندان والوں کے جوار میں رہے گا۔" [2]

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کے فضائل اور اعزازات صرف بے رُوح اور ہر قسم کے فکر اور عمل سے عاری تلاوت کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتے۔ ایسی تلاوت کی ضرورت ہے جو غور و فکر کا سرچشمہ ہو اور ایسا غور و خوض جو فکرِ انسانی کے افق کو اس طرح منور اور روشن کر دے کہ اس کا پرتو اس کے اعمال میں ظاہر ہو۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۸ صفحہ ۳۳۳ (ابتدائے سورۂ احزاب)۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۸ صفحہ ۳۳۳ (ابتدائے سورۂ احزاب)۔

سورۂ احزاب کے مندرجات:

یہ سورہ قرآن مجید کی مفید سورتوں میں سے ایک ہے اور اسلامی اصول و فروع کے سلسلہ میں مختلف النوع اور بہت ہی اہم مسائل کا تذکرہ کرتا ہے۔

جو مباحث اس سورہ میں آئے ہیں انھیں سات حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ

سب سے پہلے یہ سورت پیغمبر اسلامؐ کو خدا کی اطاعت کرنے اور کفار کی پیروی اور منافقین کی پیش کشوں کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اطمینان دلاتا ہے کہ وہ ان کی تخریب کاریوں کے مقابلہ میں اس کی حمایت فرمائے گا۔

دوسرا حصہ

زمانۂ جاہلیت کے کچھ خرافات مثلاً ظہار کا مسئلہ جسے طلاق اور عورت و مرد کے لیے ایک دوسرے سے جدائی کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اسی طرح (تبنیٰ) منہ بولے بیٹے" کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس پر خطِ تنسیخ کھینچتا ہے اور قرابت داری کے رشتوں کو حقیقی اور فطری رشتوں تک محدود کرتا ہے۔

تیسرا حصہ

جو اس سورت کا اہم ترین حصہ ہے، جنگِ احزاب اور اس کے ہلا دینے والے حوادث، مسلمانوں کی کفار پر معجزانہ فتح و کامرانی، منافقین کی تخریب کاری اور گوناں گوں بہانہ تراشی اور ان کی عہد شکنی سے تعلق رکھتی ہے اور اس سلسلہ میں نہایت ہی جامع اور جاذبِ نظر دستور اور احکام بیان ہوئے ہیں۔

چوتھا حصہ

ازواج پیغمبرِ اکرمؐ سے متعلق ہے کہ انھیں ہر چیز میں مسلمان عورتوں کے لیے اُسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل ہونا چاہیئے اور اس سلسلہ میں قرآن انھیں اہم دستور اور فرمان جاری کرتا ہے۔

پانچواں حصّہ

ہیں" زینب بنت جحش " کی داستان ہے جو ایک زمانہ تک پیغمبر کے مُنہ بولے بیٹے "زید" کی بیوی تھیں۔ پھر ان سے الگ ہوگئیں اور حکم خدا کے تحت پیغمبر سے ان کا عقد ہوا اور منافقین کے لیے دستاویز بن گئی کہ قرآن اس سلسلہ میں بہانہ جو افراد کو قانع جواب دیتا ہے۔

چھٹا حصّہ

مسئلہ حجاب کی بات کرتا ہے، جس کا گذشتہ پانچ حصّوں سے بھی قریبی رابطہ ہے اور تمام صاحب ایمان عورتوں کو اس اسلامی دستور کی پابندی کی تلقین کرتا ہے۔

ساتواں حصّہ

اور آخری حصّہ " معاد" جیسے اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس عرصہ عظیم میں راہ نجات اور اسی طرح عظیم انسان کی امانت یعنی اس کی ذمہ داری، فرائض کی بجا آوری اور ذمہ داری کی تشریح کرتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَلَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ۙ﴿۱﴾

۲۔ وَّاتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ۙ﴿۲﴾

۳۔ وَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا ﴿۳﴾

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ اے پیغمبرؐ! تقوٰے اختیار کرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو۔ خدا عالم اور حکیم ہے۔

۲۔ اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہیں وحی ہوتی ہے، اس کی پیروی کرو کیونکہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو، خدا اس سے آگاہ ہے۔

۳۔ اور خدا پر توکل کرو اور یہی کافی ہے۔ خدا انسان کا محافظ اور دفاع کرنے والا ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے یہاں مختلف شانِ نزول نقل کیے ہیں جو تقریباً ایک ہی موضوع پر دلالت کرتے ہیں۔ منجملہ

ان کے انھوں نے کہا ہے کہ یہ آیات "ابوسفیان" اور بعض دوسرے کفر و شرک کے سرغنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

وہ جنگ "احد" کے بعد "پیغمبر اسلام" سے امان پاکر مدینہ میں داخل ہوئے اور "عبداللہ بن ابی" اور اس کے کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا محمد! اپنے اور ہمارے خداؤں، لات و عزّٰی و منات نامی بتوں کو برا بھلا کہنے سے رک جایئے اور کہیئے کہ وہ اپنے پرستش کرنے والوں کی شفاعت کریں گے۔ تاکہ ہم بھی آپ سے لڑائی جھگڑے سے دستبردار ہو جائیں۔ پھر جو کچھ آپ اپنے خدا کی تعریف و توصیف کرنا چاہیں کریں، آپ آزاد ہیں۔"

اس پیش کش سے پیغمبر کو دکھ ہوا۔ حضرت عمر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ مجھے اجازت دیجیئے تاکہ انہیں قتل کر دوں! پیغمبر نے فرمایا "میں نے انھیں امان دی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی کوئی چیز ممکن نہیں"۔ لیکن آپ نے حکم دیا کہ انھیں مدینہ سے باہر نکال دیا جائے تو اس موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور پیغمبر کو حکم دیا کہ اس قسم کی کسی پیش کش کی پرواہ نہ کریں۔ [1]

تفسیر

صرف وحی الٰہی کی پیروی کریں:

خطرناک لغزشیں جو عظیم رہبروں کے راستوں میں قرار پائی ہیں، مخالفین کی طرف سے سودے بازی پر مبنی پیش کش ہوا کرتی ہیں۔ اور ایسے ہی موقع پر راہِ راست سے ہٹا دینے والے خطوط رہبروں کے درپیش ہوتے رہتے ہیں اور دشمن کوشش کرتا ہے کہ انھیں راہ راست اور صراطِ مستقیم سے ہٹا دے اور یہ ان کے لیے ایک عظیم آزمائش ہوتی ہے۔

"مشرکین مکہ" اور "منافقینِ مدینہ" نے بارہا کوشش کی کہ سودے بازی پر مبنی پیش کشوں کے ذریعہ پیغمبرِ اسلام کو خط توحید سے منحرف کر دیں۔ منجملہ ان کے وہی پیش کش ہے جو اوپر شان نزول میں ذکر ہو چکی ہے۔

لیکن سورۂ احزاب کی پہلی آیات نے نازل ہو کر ان کی سازش کو ختم کر دیا (اور اس پر پانی پھیر دیا) اور پیغمبر کو دو ٹوک انداز میں خط توحید کی روش کو کسی قسم کی سودے بازی کئے بغیر جاری رکھنے کا حکم دیا۔

یہ آیات مجموعی طور پر پیغمبر اکرم کو چار اہم حکم دے رہی ہیں:

پہلا حکم: تقوے اور پرہیز گاری کے سلسلہ میں ہے، جو دوسرے تمام پروگراموں کے لیے بنیادی عنصر ہے۔ فرماتا ہے۔ "اے پیغمبر! تقوے اختیار کرو:" (یا ایھا النبی اتق اللہ)۔

"تقوٰی" درحقیقت وہی باطنی ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس ہے۔ اور جب تک یہ احساس موجود نہ

---

[1] مجمع البیان ذیل زیر بحث آیت اور دوسری تفاسیر۔

ہو انسان کسی بھی اصلاحی پروگرام کے لیے حرکت نہیں کرتا۔

"تقوٰے" ہدایت اور آیاتِ الٰہی سے بہرہ ور ہونے اور فائدہ اُٹھانے پر آمادہ کرتا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں ہم پڑھتے ہیں "ھدًی للمتقین" یہ قرآن پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ تقوٰے کا آخری اور حقیقی مرحلہ ایمان اور احکام خداوندی پر عمل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کا پہلا مرحلہ ان تمام مسائل سے پہلے قرار پاتا ہے کیونکہ انسان اگر اپنے اندر ذمہ داری کا احساس نہ کرے تو نہ پیغمبروں کی دعوت کی تحقیق کرنے کی زحمت کرتا ہے اور نہ ہی ان کی باتوں پر کان دھرتا ہے یہاں تک کہ "دفع ضرر متحمل" کا مسئلہ جسے علماء علم کلام وعقائد نے معرفتِ الٰہی کے لیے کوشش کی بنیاد کے طور پر ذکر کیا ہے، حقیقت میں تقوٰی کی ایک شاخ ہے۔

دوسرا حکم: کفار ومنافقین کی اطاعت کی نفی ہے، خدا فرماتا ہے۔ "کفار ومنافقین کی اطاعت نہ کرو" (ولا تطع الکافرین والمنافقین)۔

اس آیت کے آخر میں اس موضوع کی تاکید کے لیے کہتا ہے: "خدا عالم اور حکیم ہے" (ان اللہ کان علیمًا حکیمًا)۔

اگر وہ آپ کو ان کی پیروی ترک کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ اس کے لامتناہی علم وحکمت کی بناء پر ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان کی اس اطاعت اور سودے بازی میں کیا کیا دردناک مصائب اور کیسے کیسے بے شمار مفاسد پنہاں ہیں۔

بہرحال تقوٰے اور احساس ذمہ داری کے بعد پہلا فریضہ صفحۂ قلب کو غیر خدا کی محبت سے صاف اور پاک کرنا ہے اور اس سرزمین سے مزاحمت کرنے والے کانٹوں کی بیخ کنی کرنا ہے۔

تیسرے حکم میں عقیدۂ توحید کی تخم ریزی اور وحیٔ الٰہی کی اتباع کرنے کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر وحی ہوتی ہے، اس کی پیروی کرو" (واتبع ما یوحٰی الیک من ربک)۔

اور اچھی طرح خبردار رہو کہ "جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے" (ان اللہ کان بما تعملون خبیرًا)۔

اس بناء پر پہلے عفریت کو دل وجان سے نکالیں تاکہ اس میں فرشتہ آسکے۔ کانٹوں کو ختم کریں تاکہ پھولوں کی تخم ریزی ہو سکے۔

طاغوت کو دور کرکے اس سے خود کو پاک کرنا چاہیئے تاکہ اللہ کی حکومت اور نظام الٰہی اس کی جگہ لے سکے۔

اور چونکہ اس راہ پر چلنے کے لیے مصائب ومشکلات بہت زیادہ ہیں، سازشوں کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ قدم قدم پر روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ لہٰذا چوتھے حکم کو اس شکل میں صادر کرتا ہے۔ "خدا پر توکل کرو اور ان لوگوں کی سازشوں سے نہ ڈرو" (وتوکل علی اللہ)۔

"اور یہی کافی ہے کہ خدا انسان کا ولی ومحافظ اور مدافع وحامی ہے" (وکفٰی باللہ وکیلًا)۔

اگر ہزار دشمن بھی آپ کو شہید کرنے کا ارادہ کرلیں، لیکن چونکہ میں آپ کا دوست اور یاور ہوں لہٰذا دشمنوں سے کبھی ہراساں نہ ہوں۔

اگرچہ ان آیات میں مخاطب پیغمبر کی ذات ہے، لیکن واضح ہے کہ یہ تمام مومنین اور تمام عالم اسلام کے لیے یکساں حکم ہے، یہ ہر دور اور ہر زمانہ کے لیے نجات بخش نسخہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے "یا ایھا" کا خطاب ان موارد کے ساتھ مخصوص ہے جہاں مقصد سب لوگوں کی توجہ کو کسی مطلب کی طرف مبذول کرنا ہو اگرچہ مخاطب ایک ہی شخص ہو بخلاف "یا" کے خطاب کے جس کا عام طور پر اطلاق ایسے موارد میں ہوتا ہے، جہاں مراد مخاطب کی ذات ہوتی ہے۔ [1]

اور چونکہ زیر بحث آیات میں "یا ایھا" سے خطاب شروع ہوا ہے لہٰذا ان آیات کے مقصد کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔

عمومیت (سب) کے لیے ہونے کا ایک اور شاہد یہ ہے کہ "ان اللہ کان بما تعملون خبیرا" کا جملہ جمع کی صورت میں آیا ہے یعنی "خدا تم سب کے اعمال سے آگاہ ہے" اگر صرف پیغمبر مخاطب ہوتے تو کہا جاتا کہ خدا تیرے عمل سے آگاہ ہے (غور کیجئے گا)

کچھ کہے بغیر واضح ہے کہ پیغمبر کو یہ حکم دینے کا مقصد یہ نہیں کہ آنجناب تقوٰی کے بارے میں یا کفار و منافقین کی اطاعت ترک کرنے کے مسئلہ میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام لیتے تھے، بلکہ اس قسم کے احکام جہاں ایک طرف پیغمبر کے وظائف اور ذمہ داریوں کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، وہاں پر تمام مومنین کے لیے درس بھی ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۵ صفحہ ۱۹۰ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۴- مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ○

۵- اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

۶- اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰۗىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ○

ترجمہ

۴۔ خدا نے کسی شخص کے لیے دو دل اس کے وجود میں خلق نہیں کیے اور اس نے ہرگز تمھاری بیویوں کہ جنہیں تم محل "ظہار" قرار دیتے ہو، تمھاری مائیں قرار نہیں دیا اور (نیز) تمھارے منہ بولے بیٹوں کو بھی حقیقی بیٹا قرار نہیں دیا۔ یہ ایسی بات ہے کہ جو تم صرف اپنی زبان سے کہتے ہو (جھوٹی اور بغیر ثبوت کے بات ہے) لیکن خدا حق بات کرتا ہے اور راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔

۵۔ انھیں ان کے باپوں کے نام کے ساتھ پکارا کرو، کیونکہ یہ کام خدا کے نزدیک زیادہ صاف ہے اور اگر تم ان کے باپوں کو پہچانتے تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں، تمھارے موالی ہیں، لیکن تم پر ان خطاؤں میں کوئی گناہ نہیں (جو ایسے موقع پر) تم سے سرزد ہوتی ہیں (اور بغیر توجہ کے تم دوسروں کے نام سے انھیں پکارتے ہو) لیکن جو کچھ تم جان بوجھ کر کہتے ہو (اس کا ضرور حساب لے گا) اور خدا غفور و رحیم ہے۔

۶۔ پیغمبر مؤمنین کی نسبت خود ان سے اولیٰ ہیں اور پیغمبر کی بیویاں ان (مؤمنین) کی مائیں شمار ہوتی ہیں اور رشتہ دار مومنین اور مہاجرین میں سے جو چیز خدا نے مقرر کی ہے، اس میں سے ہر ایک دوسرے سے اولیٰ نہیں، لیکن اگر تم چاہو کہ اپنے دوستوں کی نسبت نیکی کرو (اور اپنے اموال کا ایک

حصہ انھیں دے دو تو) یہ حکم، کتاب خدا میں لکھا ہوا ہے۔

تفسیر

فضول دعوے:

گذشتہ آیات کے بعد جو پیغمبر کو حکم دیتی تھیں کہ صرف وحی الٰہی کی اتباع کریں، نہ کہ کفار و منافقین کی، تو زیر بحث آیات میں ان کی پیروی کے نتیجہ کو بیان کرتا ہے۔ ان کی پیروی انسان کو بڑی حد تک خرافات، باطل اور بے راہ روی کی دعوت دیتی ہے۔ جن میں سے تین موارد تو پہلی زیر بحث آیت میں بیان ہوئے ہیں۔

ابتدا میں فرماتا ہے "خدا نے کسی شخص کے لیے بھی دو دل اس کے وجود میں قرار نہیں دیئے": (ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ)۔

مفسرین کی ایک جماعت نے آیت کے اس حصہ کے شان نزول میں لکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں "جمیل بن معمر" نامی ایک شخص تھا جو بلا کا حافظہ رکھتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ میرے اندر "دو دل" ہیں جن میں سے ہر ایک سے محمد کی نسبت بہتر سمجھ رکھتا ہے۔ اس لیے مشرکین قریش اسے "ذوالقلبین" (دو دل رکھنے والے) کا نام دیتے تھے۔

جنگ بدر کے دن جب مشرکین بھاگ کھڑے ہوئے تو جمیل بن معمر بھی ان کے درمیان تھا۔ ابوسفیان نے اسے اس حالت میں دیکھا کہ اس کا ایک جوتا اس کے پاؤں میں تھا اور دوسرا ہاتھ میں لے کر بھاگ رہا تھا تو ابوسفیان نے اس سے کہا، کیا بات ہے؟ اس نے کہا لشکر بھاگ گیا ہے۔ ابوسفیان نے پوچھا، پھر ایک جوتا ہاتھ میں اور دوسرا پاؤں میں کیوں کیے ہو؟ اس نے کہا سچ مچ میں تو اس طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ سمجھتا تھا کہ دونوں جوتے میرے پاؤں میں ہیں (معلوم ہوتا ہے کہ ان سب دعووں کے باوجود اس طرح اپنے ہاتھ پاؤں گم کر چکا تھا کہ ایک دل کی مقدار بھی کوئی چیز نہیں سمجھتا تھا۔ البتہ ایسے مواقع پر دل سے مراد عقل ہوتی ہے[1]

بہر حال کفار و منافقین کی پیروی اور وحی الٰہی کی اتباع کو ترک کرنا انسان کو اس قسم کے بے ہودہ اور فضول مطالب کی طرف دعوت دیتا ہے۔

لیکن اس سے قطع نظر اس جملہ کا ایک نہایت ہی عمیق اور گہرا معنی بھی ہے اور یہ کہ انسان ایک سے زیادہ دل نہیں رکھتا اور یہ دل ایک معبود کے عشق کے علاوہ کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ وہ لوگ جو شرک اور متعدد معبودوں کی دعوت دیتے ہیں ان کے متعدد

---

[1] "مجمع البیان" ذیل آیہ محل بحث اور "تفسیر قرطبی"۔

دل ہونے چاہئیں تاکہ ہر ایک کو ایک معبود کے عشق کا مرکز بنائیں۔

اصولی طور پر انسان کی شخصیت ایک صحیح و سالم واحد انسانی شخصیت ہے اور اس کی فکری لائن بھی ایک ہے۔ تنہائی اور اجتماع میں ظاہر و باطن میں اندرون و بیرون میں فکر و عمل میں غرض کہ سب میں ایک ہے اور اُسے ایسا ہونا چاہیئے۔ ہر قسم کا نفاق و دوگانگی انسان کے وجود پر ایک مسلط شدہ امر ہے اور اس کی طبیعت اور مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

چونکہ انسان ایک سے زیادہ دل نہیں رکھتا لہٰذا اسے چاہیئے کہ اس کی مہر و محبت کا مرکز بھی ایک ہو اور ایک ہی قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔

ایک ہی معشوق و محبوب کی الفت دل میں رکھتا ہو۔

ایک ہی مقررہ راستے پر زندگی کے سفر کو جاری رکھے۔

ایک گروہ اور ایک ہی جماعت سے ہم آہنگ ہو ورنہ یہ افتراق اور مختلف راستے اور پراگندہ مقاصد اسے ایک فطری راستہ سے ہٹا کر بے ہودگی اور انحراف کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے۔

اس لیے ایک حدیث میں امیرالمومنین حضرت علیؑ سے اس آیت کی تفسیر میں ہم پڑھتے ہیں۔

آپ نے فرمایا:

"لا یجتمع حبنا وحب عدونا فی جوف انسان، ان اللہ لم یجعل لرجل قلبین فی جوفہ، فیحب بھذا ویبغض بھذا فاما محبنا فیخلص الحب لنا کما یخلص الذھب بالنار لا کدر فیہ فمن اراد ان یعلم فلیمتحن قلبہ فان شارک فی حبنا حب عدونا فلیس منا ولسنا منہ"

ہماری دوستی اور ہمارے دشمن کی دوستی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتی، کیونکہ خدا نے ایک انسان کے لیے دو دل قرار نہیں دیئے ہیں کہ ایک کے ساتھ کسی کو دوست رکھے اور دوسرے کے ساتھ کسی کو دشمن! ہمارے دوست ہماری محبت میں خالص ہیں۔ جیسا کہ سونا کھٹالی سے نکل کر کندن بن جاتا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو جاننا چاہتا ہے وہ اپنے دل کی آزمائش کرے۔ اگر ہمارے دشمنوں کی محبت کا کچھ حصہ اس کے دل میں ہماری محبت کے ساتھ ملا ہوا ہے تو نہ وہ ہم سے ہے اور نہ ہم اس سے۔[1]

اس بناء پر ایک دل ایک ہی اعتقاد کا مرکز ہے اور وہ بھی ایک ہی عملی پروگرام پر عمل درآمد کرتا ہے کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ انسان حقیقتاً کسی چیز کا معتقد تو ہو لیکن عملی شکل میں اس سے جدا ہو اور یہ جو بعض لوگ ہمارے زمانہ میں اپنے لیے متعدد شخصیتوں کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے فلاں عمل سیاسی لحاظ سے انجام دیا اور فلاں دینی لحاظ سے اور فلاں کام اجتماعی نقطۂ نظر سے، اس طرح سے وہ اپنے متضاد اعمال کی توجیہ کرتے ہیں۔ تو وہ بدکردار منافق ہیں جو چاہتے ہیں کہ قانون آفرینش و خلقت کو

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۴۴۔

روند ڈالیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں لیکن ان سب پر ایک ہی قانون حاکم ہونا چاہیئے۔

قرآن اس کے بعد زمانہ جاہلیت کی ایک اور بے ہودہ رسم اور خرافات کو بیان کرتا ہے اور وہ "ظہار" کی خرافات ہے۔

مرد جس وقت اپنی بیوی سے ناراض ہو جاتے اور چاہتے کہ اس سے نفرت کا اظہار کریں تو اس سے کہتے (انت علی کظھر امی) "تو میرے لیے میری ماں کی پشت کی طرح ہے" اور اس [1] کے ساتھ وہ اسے اپنی ماں کی طرح سمجھنے لگتے اور اس بات کو طلاق کے مانند خیال کرتے۔

قرآن اس آیت کے آخر میں کہتا ہے "خدا نے ہرگز تمہاری بیویوں کو جنہیں تم محل ظہار قرار دیتے ہو، تمہاری مائیں قرار نہیں دیا ہے اور ماؤں والے احکام ان کے لیے مقرر نہیں کیے: (وما جعل ازواجکم اللائی تظاھرون منھن امھاتکم)

اسلام نے اس زمانہ جاہلیت کے پروگرام کو صرف مسترد ہی نہیں کیا بلکہ اس کے لیے سزا بھی مقرر کی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص یہ بات کہے وہ ضروری کفارہ ادا کیے بغیر اپنی بیوی کے پاس نہیں جا سکتا اور اگر کفارہ بھی ادا نہ کرے اور بیوی کے پاس بھی نہ جائے تو بیوی "حاکم شریعت" کے ذریعہ سے اسے دو کاموں میں سے ایک کو قبول کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ یا تو باقاعدہ طور پر اور قانون اسلام کے مطابق اسے طلاق دے کر اس سے الگ ہو جائے۔ یا کفارہ ادا کر کے حسب سابق اپنی ازدواجی زندگی کو جاری رکھے [2]

آخر یہ کیا بات ہوئی کہ انسان اپنی بیوی سے یہ جملہ کہنے سے کہ "تو میری ماں کی طرح ہے" اس کو ماں کے حکم میں لے آئے؟ ماں اور بیٹے کا ایک فطری رابطہ ہوتا ہے جو لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس لیے سورۂ مجادلہ کی آیت ۲ میں صراحت سے کہتا ہے: "ان امھاتھم الا اللائی ولدنھم وانھم لیقولون منکرا من القول وزورا"۔

"ان کی مائیں تو وہ ہیں، جنہوں نے انھیں جنم دیا ہے اور وہ بُری اور باطل بات کہتے ہیں"۔

یہ بات کہنے سے اگر ان کا مقصد بیوی سے جدائی اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا کہ اس سے طلاق کا کام لیتے تھے تو عورت سے علیحدگی اس غلط اور ناشائستہ قول کی محتاج نہیں ہے۔ کیا ایک درست اور صحیح تعبیر کے ساتھ علیحدگی کے مسئلہ کو بیان نہیں کیا جا سکتا؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ظہار زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے سے جدائی کا سبب نہیں ہوتا تھا بلکہ عورت کو مطلق سرگردان کی حالت میں قرار دیتا ہوتا تھا اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو یہ گھناؤنا اور تکلیف دہ فعل بن جاتا ہے کیونکہ ایک بے معنی لفظ کے کہنے سے میاں بیوی کا باہمی رابطہ منقطع ہو جانا اور بغیر اس کے کہ عورت مطلقہ ہو، شوہر اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے [3]

پھر زمانۂ جاہلیت کی تیسری بے ہودہ اور فضول چیز کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "خدا تمہارے مُنہ بولے بیٹوں کو تمہارے حقیقی بیٹے قرار نہیں دیتا: (وما جعل ادعیائکم ابنائکم)۔

---

[1] "ظہار" سے مربوط مسائل کے بارے میں مزید وضاحت انشاء اللہ سورۂ مجادلہ کی اس سے مناسب آیات کے ذیل میں آئے گی۔

[2] "تفسیر فی ظلال" جلد نمبر ۷، ص ۳۴۳۲ (ذیل آیت زیر بحث)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں معمول تھا کہ کچھ لوگ چھوٹے بچوں کو اولاد کے طور پر انتخاب کر لیتے اور انہیں اپنا بیٹا کہہ کر پکارتے تھے اور ایسا کرنے کے بعد تمام وہ حقوق جو ایک بیٹے کے کسی باپ پر ہوتے ہیں، اس کے قائل ہو جاتے تھے۔ وہ مُنہ بولے باپ کے وارث ہوتے اور منہ بولے ان کے وارث ہوتے۔ ایسے باپ کی بیوی بیٹے پر اور ایسے بیٹے کی بیوی باپ پر حرام ہو جاتی۔

اسلام نے غیر منطقی اور بے ہودہ قواعد وضوابط کو سختی سے مسترد کر دیا جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ پیغمبر نے اس غلط طور طریقے کی سرکوبی کے لیے اپنے مُنہ بولے بیٹے "زید بن حارثہ" کی بیوی سے مطلقہ ہونے کے بعد نکاح کر لیا تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ کھوکھلے الفاظ حقائق کو دگرگوں نہیں کر سکتے کیونکہ باپ بیٹے کا باہمی رابطہ ایک طبیعی اور فطری رابطہ ہوتا ہے جو الفاظ، عہد و پیمان اور نعرہ بازی سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ بعد میں ہم بتائیں گے کہ پیغمبر کا زید کی مطلقہ بیوی سے شادی کرنے کے باعث دشمنان اسلام نے ایک بہت بڑا جنجال کھڑا کر دیا اور ان کے غلط پروپیگنڈے کے لیے ایک دستاویز بن گیا، لیکن یہ سب کچھ زمانہ جاہلیت کی اس غلط رسم کو مٹانے کے لیے مہنگا ثابت نہیں ہوا۔

اس لیے قرآن اس جملے کے بعد کہتا ہے: "یہ ایسی بات ہے کہ جو تم زبان سے کہتے ہو" (ذالکم قولکم بافواھکم)۔

تم کہتے ہو فلاں میرا بیٹا ہے حالانکہ دل میں جانتے ہو کہ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ آواز کی یہ لہریں صرف تمہارے مُنہ کی فضا میں گھوم پھر کر باہر نکل جاتی ہیں اور کسی بھی صورت میں یہ دل کی آواز نہیں ہوتی۔

یہ غلط اور فضول باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ "لیکن خدا حق بات کہتا ہے اور راہ راست کی ہدایت کرتا ہے" (واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل)۔

حق بات اسے کہا جاتا ہے جو واقعیت عین کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو یا اگر کوئی طے شدہ معاملہ ہے تو وہ ہر لحاظ سے اس معاملہ کی تمام مصلحتوں سے ہم آہنگ ہو اور معلوم ہے کہ زمانہ جاہلیت میں "ظہار" ایسا ناپسندیدہ مسئلہ یا "مُنہ بولا بیٹا" جو دوسروں کی اولاد کے حقوق کو بڑی حد تک پامال کرتا تھا، نہ تو واقعیت عین رکھتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا طے شدہ معاملہ تھا جس میں مصلحت عامہ کو مدنظر رکھا گیا ہو۔

اس کے بعد قرآن مزید تاکید اور اسلام کے صحیح اور منطقی خط کو واضح کرنے کے لیے یوں اضافہ کرتا ہے: "انہیں ان کے باپوں کے نام سے پکارا کرو کیونکہ یہ کام خدا کے نزدیک زیادہ عادلانہ ہے" (ادعوھم لآبائھم ھو اقسط عند اللہ)۔

"اقسط" (زیادہ منصفانہ) کی تعبیر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اگر انہیں مُنہ بولے باپ کے ساتھ پکارو تو یہ منصفانہ فعل ہے اور حقیقی باپ کے نام سے پکارو تو زیادہ منصفانہ ہے، بلکہ جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ "افعل التفضیل" کا صیغہ کبھی ایسے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے کہ طرف مقابل میں صفت کا بالکل وجود نہیں ہوتا۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

"انسان احتیاط کرے اور اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے تو بہتر ہے" تو اس بات کا یہ مفہوم نہیں کہ جان کو خطرے میں نہ ڈالنا اچھا ہے لیکن احتیاط کرنا اس سے بہتر اور زیادہ اچھا ہے، بلکہ مراد "اچھے" اور "برے" کا ایک دوسرے سے تقابل اور موازنہ ہے۔

اور "بہانے" کو دُور کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "اگر ان کے باپوں کو تم نہیں پہچانتے تو وہ تمہارے دینی بھائی اور موالی ہیں:" (فان لم تعلموا آباءهم فاخوانكم في الدين ومواليكم)۔

یعنی ان کے باپوں کو نہ پہچاننا اس چیز کی دلیل نہیں بنتا کہ دوسرے شخص کا نام "باپ" کے عنوان سے اس پر رکھ دیں بلکہ انھیں دینی بھائی کے عنوان سے یا دوست اور آشنا کے طور پر خطاب کرو۔

"موالی" "مولا" کی جمع ہے اور مفسرین نے اس کے لیے متعدد معانی ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اسے یہاں دوست کے معنی میں اور بعض نے آزاد شدہ غلام کے معنی میں لیا ہے۔ (کیونکہ بعض مُنہ بولے بیٹے غلام تھے جنہیں خرید کر آزاد کر دیا جاتا اور چونکہ وہ اپنے آقا کی توجہ کا مرکز ہوتے لہٰذا انھیں اپنے بیٹے کے طور پر پکارتے تھے)۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ "مولا" کی تعبیر اس قسم کے موارد میں کہ جہاں مقابلے میں آزاد شدہ غلام ہوں، اس وجہ سے تھی کہ وہ آزادی کے بعد اپنا رابطہ اپنے مالک کے ساتھ برقرار رکھتے ایسا رابطہ جو قانونی لحاظ سے کئی ایک جہات میں رشتہ داری کا جانشین ہو جاتا اور "ولاء عتق" سے تعبیر کرتے۔

اس لیے اسلامی روایات میں ہے کہ "زید بن حارثہ" کو پیغمبر اکرمؐ کے آزاد کرنے کے بعد بھی "زید بن محمدؐ" کے عنوان سے پکارا جاتا، یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا اور اوپر والا حکم لایا۔ اس کے بعد پیغمبرؐ نے اس سے فرمایا تو "زید بن حارثہ" ہے۔ تو اب اسے لوگ "مولی رسول اللہ" (رسول اللہ کا آزاد کردہ) کہہ کر پکارتے تھے۔[1]

نیز علماء نے کہا ہے کہ ابوحذیفہ کا سالم نامی ایک غلام تھا جسے انھوں نے آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا جس وقت اوپر والی یہ آیت نازل ہوئی تو اسے "سالم" مولی حذیفہ کا نام دیا گیا۔[2]

لیکن چونکہ انسان کبھی گذشتہ عادت کے ماتحت یا سبقت لسانی کی بناء پر یا بعض افراد کے نسبت میں اشتباہ کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس کے باپ کے علاوہ کسی اور سے نسبت دے دے اور یہ چیز انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ لہٰذا خداوند عادل و حکیم ہے۔ ایسے شخص کو سزا نہیں دے گا۔ اس لیے آیت کے ذیل میں اضافہ کرتا ہے۔ "جس وقت اس موقع پر غلطی کے مرتکب ہو جاؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے:" (وليس عليكم جناح فيما اخطأتم به)۔

لیکن جو کچھ تم جان بوجھ کر اور اپنے ارادہ و اختیار سے کہتے ہو، اس پر ضرور سزا دی جائے گی:" (ولكن ما تعمدت قلوبكم)۔[3]

---

[1] "روح المعانی" جلد ۲۱ ص ۱۳۱ ذیل آیہ محل بحث۔

[2] "روح البیان" ذیل آیہ محل بحث۔

[3] مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ "ما" یہاں "موصولہ" ہے اور اعراب کے لحاظ سے "مبتداء" ہے اور اس کی خبر "البقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"اور خدا ہمیشہ غفور و رحیم ہے" (وکان اللہ غفورًا رحیمًا)۔

تمہارے گذشتہ گناہوں کو بخش دے گا اور سہو و نسیان اور خطاؤں کو معاف کر دے گا۔ لیکن اگر اس حکم کے نازل ہونے کے بعد تم نے عمدًا اس کی مخالفت کی اور افراد کو ان کے باپوں کے نام کے بغیر پکارا اور "منہ بولے بیٹے" اور منہ بولے باپ والی رسم کو جاری رکھا تو خدا تمہیں نہیں بخشے گا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ موضوع خطا ایسے موارد کو بھی شامل ہوگا جب انسان محبت کی بناء پر کسی سے کہتا ہے "میرے بیٹے"! یا احترام سے کہتا ہے "میرے باپ"!

البتہ یہ بات صحیح ہے کہ تعبیرات گناہ نہیں ہے۔ لیکن خطا کے عنوان سے نہیں بلکہ اس بناء پر کہ اس قسم کی تعبیرات کنایہ و مجاز کا پہلو رکھتی ہیں اور عام طور پر ان کا قرینہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہذا قرآن یہاں پر حقیقی تعبیرات کی نفی کرتا ہے نہ کہ مجازی کی۔

بعد والی آیت ایک اور اہم مسئلہ یعنی اس کے نظام "مواخات" کے ابطال کو پیش کرتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جس وقت مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اسلام نے ان کا تعلق مشرک رشتے داروں کے ساتھ کہ جو مکہ میں تھے، کلی طور پر توڑ دیا اور پیغمبرؐ نے حکم خدا سے مسئلہ اخوت و پیمان برادری ان کے درمیان کیا۔

اس طرح سے کہ "مہاجرین" و "انصار" کے درمیان دو دو کر کے پیمان اخوت و برادری باندھا گیا اور وہ دو حقیقی بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے وارث بنے لیکن یہ حکم عارضی اور صرف موجودہ سخت ترین حالات سے مخصوص تھا اور جس وقت اسلام نے وسعت پیدا کی ہے اور گذشتہ روابط تدریجًا برقرار ہوئے تو اب اس حکم کو باقی اور جاری رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

اوپر والی آیت نازل ہوئی اور "نظام مواخات" کو جو نسب کا جانشین تھا باطل کیا۔ اور اث وغیرہ کے حکم کو حقیقی رشتہ داروں کے ساتھ مخصوص کر دیا۔

اس بناء پر نظام اخوت و برادری اگرچہ ایک اسلامی نظام تھا (برخلاف منہ بولے بیٹے کے نظام کے جو ایک جاہلانہ نظام تھا) لیکن ضروری تھا کہ حد سے زیادہ خراب حالت کے برطرف ہونے کے بعد اسے باطل ہونا چاہیئے تھا اور ایسا ہی ہوا۔

البتہ زیر بحث آیہ میں اس نکتہ کے ذکر سے پہلے دو اور احکام یعنی "مؤمنین کی نسبت پیغمبرؐ کا اولیٰ ہونا" اور "پیغمبر کی بیویوں کا ماں کی مانند ہونا" مقدمہ کے طور پر ذکر ہوا ہے۔

فرماتا ہے "پیغمبر مؤمنین کی نسبت خود ان سے اولیٰ ہیں" (النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم)۔

"اور ان کی بیویاں مؤمنین کی مائیں شمار ہوتی ہیں" (وازواجہ امھاتھم)۔

باوجود اس کے کہ پیغمبر بمنزلہ باپ کے اور ان کی بیویاں بمنزلہ ماؤں کے ہیں، لیکن کبھی بھی ان سے میراث نہیں لیتے تو کس طرح توقع رکھی جا سکتی ہے کہ منہ بولے بیٹے وارث بنتے ہوں۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) محذوف ہے اور تقدیری طور پر اس طرح تھا "لکن ما تعمدت قلوبکم فانکم تؤاخذون بہ"۔

پھر مزید کہتا ہے "رشتہ دار ایک دوسرے کی نسبت مؤمنین و مہاجرین میں سے اس میں جو خدا نے مقرر کیا ہے اولیٰ ہیں" (و اولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ من المؤمنین والمھاجرین)۔

لیکن اس کے باوجود اس بناء پر کہ کلی طور پر مسلمانوں پر راستہ بند نہ کر دیں اور دوستوں کے لیے اور ان کے لیے جن کے ساتھ ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق یا لگاؤ ہو تو کوئی چیز بطور میراث چھوڑ سکتے ہیں۔ اگرچہ وصیت کے طریق سے تہائی مال کی بابت ہی سہی آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے "مگر یہ کہ تم چاہو کہ اپنے دوستوں کی نسبت کوئی نیک کام انجام دو" تو کوئی مانع نہیں ہے (الا ان تفعلوا الیٰ اولیائکم معروفاً)۔

اور آخری جملہ میں گذشتہ تمام احکام کی تاکید کے لیے یا آخری حکم کی تاکید کے لیے فرماتا ہے: "یہ حکم کتاب الٰہی میں (لوح محفوظ یا قرآن مجید میں) لکھا جا چکا ہے" (کان ذالک فی الکتاب مسطوراً)۔

یہ تھا خلاصہ اوپر والی آیت کی تفسیر کا۔ اب ہم ان مذکورہ چار احکام میں سے ہر ایک کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

الف:۔ مومنین کی نسبت پیغمبر کے اولیٰ ہونے سے کیا مراد ہے؟

قرآن نے اس آیت میں پیغمبر کے اولیٰ ہونے کو مسلمانوں کی نسبت مطلق طور پر ذکر کیا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام اختیارات جو "انسان" اپنی بابت رکھتا ہے، "پیغمبر" خود اس سے بھی اولیٰ ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "امور اجتماعی کی تدبیر" کے مسئلہ میں یا "اولویت مسئلہ قضاوت" میں یا "حکم و فرمان کی اطاعت" کے ساتھ تفسیر کی ہے، لیکن حقیقت واقع یہ ہے کہ ان تین امور میں سے کسی ایک تک محدود کرنے کی دلیل ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اسلامی روایات میں اولویت کی مسئلہ "حکومت" کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے تو درحقیقت اس اولویت کی ایک شاخ کو بیان کرنا مقصود ہے[1]

لہٰذا کہنا چاہیئے کہ پیغمبر اسلام اجتماعی مسائل میں اور انفرادی و خصوصی مسائل میں بھی، حکومت سے مربوط مسائل میں بھی قضاوت و دعوت سے متعلق مسائل میں بھی ہر انسان سے خود اس کی نسبت اولیٰ تھے اور آپ کا ارادہ اور خواہش خود اس کے ارادہ اور خواہش پر مقدم ہے۔

اور اس مسئلہ میں حیران ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پیغمبر معصوم ہوتا ہے اور خدا کا نمائندہ سوائے معاشرے اور فرد کی خیر و صلاح کے کچھ بھی مدنظر نہیں رکھتا اور کبھی بھی وہ ہوا و ہوس کا تابع نہیں ہوتا اور کسی وقت بھی اپنے مفادات کو دوسروں کے مفادات پر مقدم نہیں سمجھتا بلکہ اس کے برعکس مفادات کی کشش و تضاد اور ٹکراؤ کی صورت میں اس کا پروگرام ہمیشہ امت کے لیے ایثار و قربانی اور فداکاری کا ہوتا ہے۔

یہ اولویت حقیقت میں مشیت الٰہی کی اولویت کی ایک شاخ ہے کیونکہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی جانب سے ہے۔

---

[1] یہ روایات "اصول کافی" اور کتاب "علل الشرائع" میں آئی ہیں (تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۲۳۸، ۲۳۹ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

مزید برآں انسان اس وقت ایمان کی بلندی پر پہنچ سکتا ہے۔ جب اس کا مضبوط ترین تعلق اپنی ذات کے ساتھ عشق و محبتِ خدا کے تابع ہو اور اسی طرح اس کے نمائندوں کے ساتھ عشق و محبت کے تابع ہو۔

اس لیے تو ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

"لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعًا لما جئت بہ"

"تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک حقیقت ایمان تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک اس کی خواہش اس چیز کے تابع نہ ہو جسے میں خدا کی طرف سے لے کر آیا ہوں۔"[1]

نیز ایک اور حدیث میں آیا ہے:

"والذی نفسی بیدہ لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون احب الیہ من نفسہ ومالہ وولدہ والناس اجمعین"

"قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک حقیقت ایمان تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کے نزدیک خود اس سے، اس کے مال و اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔"[2]

نیز یہ بھی خود آنحضرتؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ما من مؤمن الا وانا اولی الناس بہ فی الدنیا والاٰخرۃ"

"کوئی مؤمن نہیں جب تک کہ میں دنیا و آخرت میں اس کے نزدیک خود اس کی نسبت اولیٰ نہ ہوں۔"[3]

قرآن بھی اسی سورہ احزاب کی آیت ۳۶ میں کہتا ہے:

"وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرًا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم"

"کسی با ایمان مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں تو پھر وہ اپنی طرف سے کوئی اختیار رکھتا ہو۔"

ہم ایک بار پھر یہ بات زور دے کر کہتے ہیں کہ اس بات کا یہ مقصد نہیں کہ خدا نے اپنے بندوں کو مکمل طور پر ایک فرد کی خواہشات کا پابند کر دیا ہے۔ بلکہ اس بات کے پیش نظر کہ پیغمبر مقام عصمت کا حامل ہوتا ہے اور "ما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحٰی" (نجم ۳-۴) کا مصداق ہونے کی بنا پر جو کچھ بھی کہتا ہے، سب خدا کا فرمان ہوتا ہے اور اس کی ہی

---

[1] "تفسیر فی ظلال" ذیل آیات محل بحث۔

[2] "تفسیر فی ظلال" ذیل آیات محل بحث۔

[3] "صحیح بخاری" جلد ۶ ص ۵۰ تفسیر سورہ احزاب؛ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۳۶۹۔

جانب سے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ باپ سے بھی زیادہ دل سوز اور مہربان ہے۔

یہ اولویت درحقیقت لوگوں کے مفاد اور ان کے حق میں ہے، حکومت اور اسلامی معاشرہ کو چلانے کی صورت میں بھی اور انسان کے شخصی اور انفرادی مسائل میں بھی۔

اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ اولویت پیغمبر کے کاندھوں پر عظیم مسئولیت اور ذمہ داری ہے۔ اسی لیے مشہور روایت میں کہ جو شیعہ اور اہل سنت کی کتب میں وارد ہوئی ہے، پیغمبرؐ نے فرمایا:

"انا اولی بکل مؤمن من نفسہ، ومن ترک مالا فللوارث ومن ترک دیناً او ضیاعاً فالیّ وعلیّ۔

"میں ہر مومن کے لیے اس کی نسبت اولیٰ ہوں، جو شخص اپنی طرف سے مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارث کے لیے ہے اور جو شخص قرض چھوڑ کر جائے یا اہل وعیال چھوڑ جائے تو ان کی کفالت میرے ذمہ ہے"[1]

(توجہ کرنا چاہیئے کہ یہاں پر "ضیاع" اہل وعیال کے معنی میں ہے جو سرپرست کے بغیر رہ گئے ہوں اور "دین" کی تعبیر اس سے پہلے بھی اس معنی پر واضح قرینہ ہے کیونکہ مراد مال کے بغیر قرض دار ہونا ہے)۔

ب:۔ دوسرا حکم پیغمبر کی بیویوں کے سلسلہ میں ہے کہ وہ تمام مومنین کے لیے (ماں کی حیثیت رکھتی ہیں البتہ معنوی اور روحانی مائیں ہیں جیسا کہ پیغمبر اُمت کے روحانی اور معنوی باپ ہیں۔

اس معنوی میں ربط اور رشتہ کی تاثیر صرف "حفظ احترام" اور پیغمبر کی بیویوں سے "ازدواج کی حرمت" کے سلسلہ میں ہے، جیسا کہ اسی سورہ کی آیات میں پیغمبر کی رحلت کے بعد ان کی ازواج سے نکاح کرنے کی تحریم کا صریح حکم آیا ہے۔ ورنہ مسئلہ میراث کے لحاظ سے اور اسی طرح دوسرے "نسبی" اور "سببی" محرمات کے لحاظ سے ذرہ برابر بھی اثر نہیں رکھتا، یعنی مسلمان حق رکھتے ہیں کہ پیغمبر کی بیٹیوں کے ساتھ شادی کریں[2]

حالانکہ کوئی شخص اپنی ماں کی بیٹی کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، نیز محرمیت کا مسئلہ اور پیغمبر کی بیویوں کی طرف نگاہ کرنا ان کے محارم کے سوا کسی شخص کے لیے بھی جائز نہیں تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بی بی عائشہ سے کہا "یا امّتہ" اے اماں۔ اس پر انھوں نے جواب دیا۔ میں تمھاری ماں نہیں ہوں، تمھارے مردوں کی ماں ہوں۔

---

[1] وسائل شیعہ جلد ۱۰ ص ۵۵۱ یہ بات امام صادق علیہ السلام سے پیغمبر گرامی اسلام سے نقل ہوئی ہے اور یہی مضمون مختصر سے فرق کے ساتھ تفسیر قرطبی اور روح المعانی میں زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے اور صحیح بخاری میں بھی ہے۔ دیکھو جلد ۶ ص ۴۰ (تفسیر سورہ احزاب) میں آیا ہے۔

[2] جیسا کہ حضرت علیؑ کی شادی آنحضرتؐ کی دختر سے ہوئی یا آپ کی نواسیوں کی شادیاں حضرت جعفر طیار کے بیٹوں سے ہوئیں۔

[3] "مجمع البیان" اور "روح المعانی" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس تعبیر کا مقصد نکاح کی حرمت ہے اور یہ صرف اُمت کے مردوں کے بارے میں صادق ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ مسئلہ ازدواج کے علاوہ احترام اور بزرگ سمجھنے کا موضوع بھی پیش نظر ہے۔ اسی لیے مسلمان عورتیں بھی پیغمبر کی بیویوں کے احترام کے طور پر اپنی ماں کہہ کر خطاب کریں۔

اسی بات کا شاہد خود قرآن ہے جبکہ کہتا ہے: "النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم"۔ پیغمبرؐ کی اولویت تمام عورتوں اور مردوں کی نسبت ہے اور بعد والے جملہ کی ضمیر بھی اسی عنوان کی طرف لوٹتی ہے جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اسی لیے عبارت میں جو "اُم سلمہ" (پیغمبرؐ کی ایک بیوی) سے نقل ہوا ہے کہ وہ فرماتی ہیں۔

"انا ام الرجال منکم والنساء"

"میں تمہارے مردوں اور عورتوں کی ماں ہوں"۔ [1]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ کہ کیا "ازواجہ امھاتھم" "پیغمبر کی بیویاں مومنوں کی مائیں شمار ہوتی ہیں" کی تعبیر اس کے ساتھ جو قبل کی چند آیات میں گزری ہے، تضاد نہیں رکھتی؟ کیونکہ وہاں فرماتا ہے: "وہ لوگ کہ جو کبھی اپنی بیویوں کو اپنی ماں کے منزلہ قرار دیتے ہیں، باطل بات کہتے ہیں۔ ان کی ماں صرف وہی ہے جس سے وہ متولد ہوئے ہیں"۔ اس حالت میں کس طرح پیغمبر کی بیویاں کہ جن سے مسلمان متولد نہیں ہوئے مائیں شمار ہوتی ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ کسی عورت کو ماں سے مخاطب کرنا یا تو جسمانی لحاظ سے ہوتا ہے یا روحانی لحاظ سے۔ جسمانی لحاظ سے تو یہ معنی صرف اس صورت میں واقعیت رکھتا ہے کہ انسان اس سے متولد ہوا ہو۔ اور یہ وہی چیز ہے جو گذشتہ آیات میں آئی ہے کہ انسان کی جسمانی ماں تو صرف وہ ہے کہ جس سے وہ پیدا ہوا ہے۔ لیکن روحانی ماں باپ تو وہ ہیں جو ایک قسم کا معنوی حق اس پر رکھتے ہوں جس طرح پیغمبرؐ جو اُمت کے روحانی باپ شمار ہوتے ہیں اور آپ ہی کی وجہ سے آپ کی بیویاں ماں کا احترام رکھتی ہیں۔

جو اعتراض زمانہ جاہلیت کے عربوں کی طرف "ظہار" کے بارے میں تھا، یہ تھا کہ جس وقت وہ اپنی بیویوں کو ماں کر کے مخاطب کرتے تو یقیناً ان کی مراد معنوی ماں نہ ہوتا۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی کہ وہ جسمانی ماں کی طرح ہیں، اس لیے ایک قسم کی طلاق شمار کرتے تھے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جسمانی صورت میں الفاظ کے کہہ دینے سے ماں نہیں بن جاتی بلکہ اس کی شرط تولد جسمانی ہے۔ اس بنا پر ان کا یہ قول جھوٹ اور باطل تھا۔ لیکن پیغمبرؐ کی بیویوں کے بارے میں اگرچہ وہ جسمانی مائیں نہیں ہیں لیکن پیغمبر کے احترام کی وجہ سے وہ روحانی مائیں تھیں اور ایک ماں ایسا احترام رکھتی تھیں۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن آئندہ کی آیات میں پیغمبر کی بیویوں سے شادی کرنے کو حرام قرار دیتا ہے، وہ بھی درحقیقت پیغمبر کے احترام کی قسموں میں سے ایک ہے جیسا کہ اس کی وضاحت آگے چل کر تفصیل کے ساتھ آئیگی۔ انشاء اللہ۔

البتہ اسلام میں ماں کی ایک اور قسم رضاعی ماں کے عنوان سے موجود ہے جس کی طرف سورۂ نساء کی آیت ۲۳ میں

---

[1] روح المعانی" ذیل آیات زیر بحث۔

اشارہ ہوا ہے کہ "وامھاتکم اللاتی ارضعنکم ....." تو درحقیقت وہ جسمانی ماں کی ایک قسم ہے۔

ج :۔ تیسرا حکم رشتہ داروں کی ایک دوسرے کی بابت میراث کے بارے میں اولویت کا مسئلہ ہے کیونکہ ابتداء اسلام میں کہ مسلمان ہجرت کی وجہ سے اپنا رشتہ اپنے اعزاء و اقارب سے کم کر چکے تھے تو میراث کا قانون "ہجرت" اور "مواخات" کی بنیاد پر منظم ہوا یعنی مہاجرین ایک دوسرے سے یا انصار سے جن سے برادری کا رشتہ جوڑ چکے تھے، میراث لیتے تھے۔ یہ ایک عارضی حکم تھا جو اسلام کے وسعت پانے اور بہت سے گذشتہ رشتہ داری کے روابط کے برقرار ہو جانے سے ان کے اسلام لانے کی بناء پر اب اس حکم کے جاری رکھنے کی ضرورت نہیں تھی (آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سورۂ احزاب ہجرت کے پانچویں سال جنگِ احزاب کے سال نازل ہوا)۔

اس لیے اوپر والی آیت نازل ہوئی اور "اولوا الارحام" (رشتہ داروں) کی اولویت کو محکم کر دیا۔

البتہ کچھ قرائن موجود ہیں کہ یہاں اولویت سے مراد الزامی اولویت ہے نہ کہ استحبابی، کیونکہ علماء اسلام کا اجماع بھی اس معنی پر ہے اور بہت سی روایات بھی جو اسلامی ماخذ میں وارد ہوئی ہیں، اس موضوع کو ثابت کرتی ہیں۔

یہاں اس نکتہ کی طرف بھی خوب غور کے ساتھ توجہ کرنا چاہیئے کہ یہ آیت غیروں کی نسبت رشتہ داروں کی اولویت کو بیان کر رہی ہے۔ نا کہ میراث کے تین طبقات کی ایک دوسرے کی نسبت اولویت کے بیان کے لیے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں "مفضل علیھم" مومنین و مہاجرین ہیں جو تمن قرآن میں آئے ہیں (من المؤمنین والمھاجرین)

اس بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا "بعض رشتہ دار دوسرے بعض سے میراث لینے میں غیر رشتہ داروں سے اولیٰ ہیں"۔ باقی رہا یہ کہ رشتہ دار کس طرح میراث لیتے ہیں؟ اور کس معیار اور ضابطہ کے تحت؟ تو قرآن یہاں اس بارے میں ساکت ہے! اگرچہ سورۂ نساء کی چند آیات میں اس کے بارے میں تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ [1]

د :۔ چوتھا حکم کہ اوپر والی آیت میں ایک استثناء کی شکل میں آیا ہے، دوستوں اور تعلق رکھنے والے افراد کو ان اموال سے بہرہ مند کرنا ہے۔ جنہیں یادگار کے طور پر چھوڑ رہا ہے جو (الا ان تفعلوا الیٰ اولیائکم معروفاً) مگر یہ کہ اپنے دوستوں کے ساتھ تم نیکی کرنا چاہو" کے جملہ سے بیان ہوا ہے اور اس کا واضح مصداق وہی حکم وصیت ہے کہ جسے انسان اپنے ثلثِ مال کے حصے میں جس شخص کے بارے میں چاہے انجام دے سکتا ہے۔

---

[1] اسی بناء پر بعض فقہاء طبقاتِ میراث میں ایک دوسرے سے اولویت کی تعبیر کا استدلال درست نظر نہیں آتا، معلوم ہوتا ہے کہ "اولیٰ ببعض" میں حرف "با" اس قسم کی غلط فہمی کا سبب ہوا اور بعض علماء نے گمان کر لیا ہے کہ یہاں پر "مفضل علیھم" (جن پر فضیلت دی گئی) بعض وارث ہیں، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ (مفضل علیہ) من المؤمنین والمھاجرین دیا ہے "البتہ اولوالارحام کی تعبیر صرف یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ رشتہ داری ہی میراث کا معیار ہے۔ اور جس قدر رشتہ داری کا درجہ بلند ہوگا اسے اتنا ہی حق تقدم حاصل ہوگا۔ (غور کیجئے گا)

اس طرح سے جب میراث کی عمارت رشتہ داری کی بنیاد پر استوار کی گئی اور گذشتہ رشتوں کی قائم مقام ہوئی، پھر بھی انسان کا رابطہ مکمل طور پر اپنے قلبی دوستوں اور مسلمان بھائیوں سے منقطع نہیں ہوتا۔ البتہ کیفیت وکمیت (مقدار اور تعداد) خود اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے، لیکن پھر بھی اس کی شرط یہ ہے کہ مال کی ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو، البتہ اگر انسان وصیت نہیں کرتا تو اس کے تمام اموال اس کے رشتہ داروں کے درمیان میراث کے قوانین کے مطابق تقسیم ہوں گے اور ان کے لیے ثلث یعنی ایک تہائی مقصود نہیں ہوگی [1]

ایک نکتہ:

بہت سی روایات ائمہ اہل بیت سے اوپر والی آیت کی تفسیر میں اولوا الارحام کے بارے میں نقل ہوئی ہیں کہ جن میں سے بعض میں یہ آیت "میراث مال" کے مسئلہ سے تفسیر ہوئی ہے جیسا کہ مفسرین کے درمیان مشہور ہے۔ جبکہ بعض دوسری روایات میں "خلافت وملوکیت کی میراث" خاندان پیغمبر اور ائمہ اہل بیتؑ کے لیے تفسیر ہوئی ہے۔

منجملہ ان کے ہم ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے پڑھتے ہیں، جس وقت آپ سے اس آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو امامؑ نے فرمایا:

"یہ فرزندان حسینؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے"

اور جب راوی نے سوال کیا کہ کیا یہ میراث اموال سے متعلق نہیں ہے؟ تو امامؑ نے ارشاد کیا:

"نہیں۔ یہ تو حکومت وولایت کے بارے میں ہے۔"

واضح ہے کہ ان احادیث سے مراد میراث اموال کے مسئلہ کی نفی نہیں ہے بلکہ مراد اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ میراث ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو میراث اموال کو بھی شامل ہے اور میراث خلافت وحکومت کو بھی۔

اور یہ توارث بادشاہوں کے سلسلہ میں توارث سلطنت کی طرح نہیں ہے۔ یہاں تو شائستگی اور لیاقت کی بناء

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ ہے "الا ان تفعلوا" کے جملہ میں جو استثناء ہے وہ استثناء منقطع ہے کیونکہ وصیت کا حکم میراث کے حکم سے علیحدہ ہے۔ لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اگر یہاں استثناء متصل ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ "اولوالارحام" کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ رشتہ داران مالوں کی بابت جو میت سے باقی رہ جاتے ہیں، غیروں کی نسبت اولی ہیں۔ لیکن اگر وصیت کی ہو تو اس صورت میں "موصی لہ" تہائی ترکہ کی حدود تک رشتہ داروں سے اولی اور زیادہ حق رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت میں اس استثناء کے مشابہ ہے جو آیات میراث میں "من بعد وصیۃ ..." میں آیا ہے۔

[2] ان احادیث کو مرحوم سید ہاشم بحرانی نے تفسیر برہان جلد ۳ ص ۲۹۲ اور ۲۹۳ میں نقل کیا ہے۔ منجملہ ان کے اوپر والی حدیث ہے اور سولہویں حدیث بھی اسی سلسلہ احادیث میں سے ہے۔

پر توارث ہے۔ اسی لیے ائمہ کی اولاد میں سے صرف ان افراد کی حالت کو شامل ہے جو اس شائستگی کے حامل ہیں بنظیر اسی طرح جس طرح حضرت ابراہیم اپنی اولاد کے لیے خدا سے چاہتے ہیں اور خدا ان سے کہتا ہے کہ امامت وولایت تیری اولاد میں سے اس گروہ تک نہیں پہنچے گی جو ظالموں کی صف میں قرار پاتے ہیں۔ بلکہ ان میں پاکیزہ افراد سے مخصوص ہے۔

نیز اس چیز کے مشابہ ہے جو زیارات میں شہداء راہ خدا منجملہ امام حسین کی قبر کے سامنے کھڑے ہوکر ہم کہتے ہیں۔ آپ پر سلام ہو اے حسینؑ کہ آپ آدمؑ کے وارث، نوحؑ کے وارث، ابراہیمؑ کے وارث، موسیٰؑ کے وارث وعیسیٰؑ ومحمدؐ کے وارث ہیں... یہ میراث تو اعتقادی، اخلاقی معنوی اور روحانی پہلوؤں کے لحاظ سے میراث ہے۔

۷۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ

۸۔ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۧ

ترجمہ

۷۔ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور تجھ سے اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے اور ان سب سے ہم نے محکم پیمان لیا (کہ تبلیغ و رسالت اور رہبری کی ادائیگی کے فرائض میں کوتاہی نہ کریں)۔

۸۔ تاکہ خدا سچوں کی صداقت کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر

خدا کا محکم عہد و پیمان:

چونکہ گذشتہ آیات میں پیغمبر اسلامؐ کے وسیع اختیارات "النبی اولی بالمومنین من انفسھم" کے عنوان کے تحت بیان ہوئے۔ زیر بحث آیات میں پیغمبر اسلامؐ اور باقی عظیم انبیاءؑ کے زبردست اور سنگین فرائض کو بیان کرتا ہے

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمیشہ اختیارات اور ذمہ داریاں لازم اور ملزوم ہوتے ہیں اور جس جگہ "حقوق" موجود ہوں، وہاں فرائض بھی ہوتے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتے۔ اس بناء پر اگرچہ پیغمبر اسلام وسیع حق رکھتے ہیں تو اس کے مقابلہ میں اُن پر بھاری ذمہ داریاں بھی قرار دی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے "یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا۔ اسی طرح تجھ سے اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے بھی ہاں ان سب سے ہم نے محکم پیمان لیا۔" (واذ اخذنا من النبیین میثاقھم ومنک ومن نوح وابراھیم ومُوسیٰ وعیسی ابن مریم واخذنا منھم میثاقًا غلیظًا۔

اس طرح سے پہلے تو تمام انبیاءؑ کو مسئلہ میثاق میں پیش کرتا ہے۔ پھر پانچ اولوالعزم پیغمبروں کے نام لیے ہیں کہ سب سے پہلے پیغمبر اسلام کی ذات کا ذکر ان کی شرافت و عظمت کی وجہ سے جو وہ رکھتے ہیں آیا ہے۔ اس کے بعد چار دوسرے اولوالعزم پیغمبر زمانۂ ظہور کی ترتیب کے ساتھ (نوح، ابراہیم، مُوسیٰ، اور عیسیٰ) ذکر ہُوئے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ عہد و پیمان سب کے لیے عمومی تھا، جو تمام انبیاء سے لیا گیا جبکہ اولوالعزم زیادہ تاکید کے ساتھ اس پیمان کے پابند تھے۔ ایسا پیمان جو "اخذنا منھم میثاقًا غلیظًا" کے جُملہ کے ساتھ حد سے زیادہ تاکید کو ظاہر کرتا ہے۔[1]

اہم بات یہ ہے کہ یہاں ہم جانیں کہ وہ کونسا تاکیدی عہد و پیمان تھا جس کے تمام پیغمبرؑ زیر بار ہیں؟ مفسرین نے اس مقام پر مختلف قسم کی گفتگو کی ہے۔ مجموعی طور پر جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب ایک اصل کلی کی مختلف شاخیں ہیں اور وہ پیمان تمام مراحل میں فریضہ تبلیغ و رسالت کی ادائیگی، لوگوں کی قیادت اور ہدایت کے فرائض کو پورا کرنا ہے۔

وہ پابند تھے اور ان کے فرائض میں شامل تھا کہ تمام انسانوں کو ہر چیز سے پہلے توحید کی دعوت دیں۔

نیز اس کے بھی پابند تھے کہ ایک دوسرے کی تائید کریں اور پہلے انبیاء اپنی امتوں کو پیغمبروں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کریں جیسا کہ بعد والے پیغمبر سابقہ انبیاء کی دعوت کی تصدیق و تائید کریں۔

خلاصہ یہ کہ سب کی دعوت کا رُخ ایک ہو اور سب ایک ہی حقیقت کی تائید کریں اور امتوں کو ایک ہی پرچم کے گرد جمع کریں۔

اس بات کی شہادت باقی آیاتِ قرآن میں بھی مل سکتی ہے سورۂ آل عمران کی آیت ۸۱ میں ہم پڑھتے ہیں: (واذ اخذ اللہ میثاق النبیّٖن لما اٰتیتکم من کتاب و حکمۃ ثُم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ قال ءاقررتم واخذتم علی ذالکم

---

[1] "میثاق" جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے، ایسے تاکیدی پیمان کے معنی میں ہے جو قسم و عہد سے توأم ہو اس بناء پر "غلیظًا" کا ذکر اس معنی پر مزید تاکید ہے۔

اصری قالوا اقررنا قال فاشهدوا وانا معکم من الشاهدین)۔

(اس وقت کو یاد کرو) جب خدا نے پیغمبروں (اور ان کے پیروکاروں) سے پختہ عہد و پیمان لیا کہ جس وقت میں تمھیں کتاب و حکمت دوں اور پھر تمہاری طرف ایک پیغمبر آئے گا جو اس چیز کی تصدیق کرے گا جو تمہارے ساتھ ہے تو اس پر ایمان لے آنا اور اس کی نصرت بھی کرنا۔ پھر (خدا نے) ان سے کہا کیا تم نے اس موضوع کا اقرار کر لیا اور اس پر پختہ عہد و پیمان باندھ لیا ہے؟ تو انھوں نے کہا ہاں ہم نے اقرار کیا! تو خدا نے ان سے فرمایا (اس مقدس عہد و پیمان پر) گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

اس طرح ایک اور معنی سورۂ آل عمران کی آیت ۱۸۷ میں بھی آیا ہے۔ جس میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے اہل کتاب سے عہد و پیمان لیا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے آیات الٰہی کو بیان کریں اور انھیں ہرگز نہ چھپائیں۔

اسی طرح سے خدا نے انبیاء سے بھی محکم عہد و پیمان لیا ہے کہ لوگوں کو توحید خدا، دین حق اور ادیان آسمانی کی وحدت کی طرف دعوت دیں، اور علماء اہل کتاب سے بھی کہ وہ جتنا ہو سکے دین الٰہی کو بیان کرنے کی کوشش کریں اور اسے چھپانے سے مکمل پرہیز کریں۔

بعد والی آیت بعثت انبیاء اور اس پختہ عہد و پیمان کے مقصد کو جو ان سے لیا گیا ہے اس طرح بیان کرتی ہے: "غرض یہ ہے کہ خدا سچوں کی صداقت کے بارے میں پوچھے اور کفار کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے"! لیسئل الصادقین عن صدقهم واعد للکافرین عذابا الیما)۔

یہاں "صادقین" سے کون لوگ مراد ہیں؟ اور یہ سوال کیسا سوال ہے؟ مفسرین نے اس کی بہت سی تفاسیر بیان کی ہیں، لیکن جو کچھ ان آیات اور قرآن کی دوسری آیات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مومنین ہیں جو اپنے دعووں کی سچائی میں عملی ثبوت پیش کریں۔ دوسرے لفظوں میں آزمائش کے میدان اور خدائی امتحان میں سرخرو اور سرفراز ہوں۔

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ:

(۱) "صادقین" کا کلمہ یہاں پر "کافرین" کے مقابلہ میں آیا ہے اور مقابلہ کے قرینہ سے یہ معنی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

ثانیاً: اسی سورہ (احزاب) کی آیت ۲۳ میں یوں پڑھتے ہیں،

"من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه"

"مومنین میں سے ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اس عہد و پیمان میں سچے ہیں جو انہوں نے خدا کے ساتھ باندھا ہے اور اس عہد پر کاربند ہیں۔

پھر فوراً ہی آیت نمبر ۲۴ میں فرماتا ہے،

"لیجزی الله الصادقین بصدقهم ویعذب المنافقین ان شاء او یتوب علیهم"

"مقصد یہ ہے کہ صادقین کو ان کے صدق کے بدلے اجر و جزا دے اور جب چاہے منافقین کو عذاب کرے یا ان کی توبہ قبول کرے۔"

ثالثاً: سورہ حجرات کی آیت پندرہ اور سورۂ حشر کی آیت آٹھ میں "صادقین" کا اچھے طریقے سے تعارف ہوا ہے۔

چنانچہ سورہ حجرات میں ہے:

"انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اولٰئک ھم الصادقون"

"واقعی مومن وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے اور جنہوں نے جان و مال کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کیا۔ یہی صادقین ہیں۔"

اور سورۂ حشر میں فرماتا ہے:

"للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ اولٰئک ھم الصادقون"

"وہ مال غنیمت جو جنگ کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے، مہاجر فقراء کے لیے ہے، وہی جو اپنے گھروں اور مالوں سے باہر نکالے گئے ہیں، اس حالت میں کہ وہ پروردگار کے فضل و کرم اور اس کی رضا کے طالب ہیں، جو خدا اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں وہی "صادقین" ہیں۔"

اس طرح سے واضح ہو گیا کہ "صادقین" سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین خدا کی حمایت کے میدان میں جہاد، اور مشکلات کے سامنے استقامت اور ایستادگی، اور جان و مال کے خرچ کرنے میں اپنی صداقت اور راستگوئی کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔[1]

رہا یہ سوال کہ "صادقین سے صدق کے متعلق سوال کرنے" سے کیا مراد ہے؟ تو جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اگر اس کی طرف توجہ کی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ آیا وہ اپنے اعمال میں خلوص نیت کو اور اپنے دعوے کی صداقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتے ہیں یا نہیں؟ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں، جہاد میں، مشکلات کے مقابلہ میں، صبر و

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے آیت کے معنی میں ایک اور احتمال بھی دیا ہے کہ "صادقین" سے مراد یہاں پر خود انبیاء علیہم السلام ہیں، اور ان سے قیامت کے دن سوال ہوگا کہ انھوں نے کس حد تک اپنے عہد و پیمان پر عمل کیا ہے؟ لیکن مذکورہ بالا تینوں شواہد اس تفسیر کی نفی کرتے ہیں۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے جس سے انبیاء اور غیر انبیاء دونوں مراد ہیں۔ لیکن جو تفسیر اوپر ذکر کی گئی ہے وہ اس سورہ کی آیات اور قرآن پاک کی دوسری آیتوں کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

شکیبائی میں خصوصاً میدان جنگ کی سختیوں میں۔

یہ سوال کہاں اُٹھایا جائے گا اور کہاں صورت پذیر ہوگا ؟ آیت کا ظاہر تو یہ بتاتا ہے کہ یہ سوال بروز قیامت پروردگار عالم کی دادگاہ عدل میں ہوگا ! قرآن کی متعدد آیات بھی قیامت کے دن اس قسم کے سوال کے تحقق کی کلی طور پر خبر دیتی ہیں ۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہ سوال عملی سوال کی حیثیت رکھتا ہو اور دُنیا میں ہی صورت پذیر ہو۔ کیونکہ انبیاء کی بعثت کے ساتھ ہی تمام اہل ایمان مسئول قرار پاتے ہیں اور ان کا عمل اس سوال کا جواب ہے کہ کیا وہ اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

۹۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ۚ

۱۰۔ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝

۱۱۔ هُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا ۝

ترجمہ

۹۔ اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو، اس وقت کہ جب (عظیم) لشکر تمہاری طرف آئے۔ لیکن ہم نے سخت آندھی اور طوفان ان پر بھیجا اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھ سکے (اور اس طرح سے انہیں درہم برہم کر دیا) اور جسے تم انجام دیتے ہو، خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

۱۰۔ اس وقت کو یاد کرو، جب وہ تمہارے (شہر کے) اوپر اور نیچے سے وارد ہوئے (اور مدینہ کا محاصرہ کر لیا) اور اس وقت کو جب کہ آنکھیں شدتِ وحشت سے خیرہ ہو گئی تھیں اور جان لبوں تک پہنچ چکی تھی اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کر رہے تھے۔

۱۱۔ وہاں مومنین کی آزمائش کی گئی اور وہ سختی سے ہل گئے۔

تفسیر

میدان احزاب میں کڑی آزمائش:

یہ اور چند بعد والی آیات جو مجموعی طور پر سترہ آیات بنتی ہیں اور "مومنین" اور "منافقین" کے بارے میں خدا کی کڑی آزمائش اور عمل کے سلسلہ میں ان کے صدق گفتار کے امتحان کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، جس کے متعلق گذشتہ آیات میں بحث ہو چکی ہے۔

یہ آیات تاریخ اسلام کے ایک اہم ترین حادثے یعنی جنگ احزاب کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، ایسی جنگ جو تاریخ اسلام میں ایک اہم تاریخی موڑ ثابت ہوئی اور اسلام و کفر کے درمیان طاقت کے موازنے کے پلڑے کو مسلمانوں کے حق میں جھکا دیا اور اس کی کامیابی آئندہ کی عظیم کامیابیوں کے لیے کلیدی حیثیت اختیار کر گئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں دشمنوں کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد وہ کوئی خاص قابل ذکر کارنامہ انجام دینے کے قابل نہ رہ سکے۔

"یہ جنگِ احزاب" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، تمام اسلام دشمن طاقتوں اور ان مختلف گروہوں کی طرف سے ہر طرح کا مقابلہ تھا کہ اس دین کی پیش رفت سے ان لوگوں کے ناجائز مفادات خطرے میں پڑ گئے تھے۔

جنگ کی آگ کی چنگاری "بنو نضیر" یہودیوں کے ایک گروہ کی طرف سے بھڑکی جو مکہ میں آئے اور قبیلہ "قریش" کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ لڑنے پر اکسایا اور ان سے وعدہ کیا کہ آخری دم تک ان کا ساتھ دیں گے۔ پھر قبیلہ "غطفان" کے پاس گئے اور انہیں بھی کارزار کے لیے آمادہ کیا۔

ان قبائل نے اپنے ہم پیمان اور حلیفوں مثلاً قبیلہ "بنی اسد" اور "بنی سلیم" کو بھی دعوت دی اور چونکہ یہ سب قبائل خطرہ محسوس کیے ہوئے تھے، لہٰذا اسلام کا کام ہمیشہ کے لیے تمام کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تاکہ وہ اس طرح سے پیغمبرؐ کو شہید، مسلمانوں کو سرکوب، مدینہ کو غارت اور اسلام کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیں۔

مسلمانوں نے جب اپنے آپ کو ایک عظیم گروہ کے مقابلہ میں دیکھا تو حکم رسالت پناہؐ سے مشورہ کرنے بیٹھ گئے اور سب سے پہلے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی پیش کش پر مدینہ کے اطراف میں خندق کھودی گئی تاکہ دشمن اسے آسانی کے ساتھ عبور نہ کر سکے اور شہر لوٹ مار سے بچ جائے (اسی بناء پر اس جنگ کا ایک نام "جنگِ خندق" بھی ہے)۔

مسلمانوں پر بہت سخت اور خطرناک لمحات گزر رہے تھے۔ جانیں لبوں تک آئی ہوئی تھیں، منافقین لشکرِ اسلام کے درمیان زبردست تگ و دو میں پڑے ہوئے تھے۔ دشمن کا انبوہ کثیر اور اس کے مقابلہ میں لشکرِ اسلام کی کمی

(لشکر کفر کی تعداد دس ہزار اور لشکر اسلام کی تین ہزار لکھی ہے) دشمن کی تیاری، جنگی ساز و سامان اور ضروری وسائل کی فراہمی ایک سخت اور دردناک مستقبل کو مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے مجسم کر رہے تھے۔

لیکن خدا چاہتا تھا کہ یہاں پیکر کفر پر آخری ضرب پڑے اور منافقین کو مسلمانوں کی صفوں سے جدا کر دے، سازشی عناصر کا بھانڈا پھوڑ دے اور سچے مسلمانوں کو آزمائش کی بھٹی میں ڈالے۔

آخر کار یہ جنگ جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آئے گی، مسلمانوں کی کامیابی پر منتج ہوئی، حکم خدا سے سخت آندھی چلی جس نے کفار کے خیمے، طنبو اور تمام لباس زندگی کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ ان کے دلوں میں زبردست رعب و وحشت ڈال دی اور فرشتوں کی غیبی طاقتیں مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیجیں۔

عمرو بن عبدود کے مقابلہ میں حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی قدرت نمائی جیسی عجیب و غریب خدائی طاقتوں کے مظاہرے کا اضافہ ہوا اور مشرکین کوئی کارنامہ سرانجام دیئے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اوپر والی سات آیات میں مشرکین کی سرکوبی کرنے والا تجزیہ و تحلیل پیش کیا گیا ہے اور اسلام کی فیصلہ کن کامیابی اور منافقین کی سرکوبی کو احسن انداز میں بیان فرمایا ہے۔

یہ تھی جنگ احزاب کی ایک جھلک جو ہجرت کے پانچویں سال واقع ہوئی۔[1]

یہاں سے ہم آیات کی تفسیر کی طرف جاتے ہیں اور اس جنگ کی دیگر تفصیلات اور نکات کو بحث کے لیے اٹھائے رکھتے ہیں۔

قرآن اس ماجرا کو پہلے تو ایک ہی آیت میں خلاصہ کرتا ہے۔ پھر دوسری ۱۶ آیات میں اس کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو اپنے اوپر خدا کی عظیم نعمت کو یاد کرو، اس موقع پر جب کہ عظیم لشکر تمہاری طرف آئے" (یا ایھا الذین امنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جاءتکم جنود)۔

"لیکن ہم نے ان پر آندھی اور طوفان بھیجے اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھتے تھے۔ اور اس ذریعہ سے ہم نے ان کی سرکوبی کی اور انہیں تتر بتر کر دیا" (فارسلنا علیھم ریحا وجنودا لم تروھا)۔

"اور خدا ان تمام کاموں کو جنہیں تم انجام دیتے ہو دیکھ رہا ہے" اور وہ کام بھی جو ہر گروہ نے اس عظیم میدان میں انجام دیئے) بصیر اور بینا ہے" (وکان اللہ بما تعملون بصیرا)۔

---

[1] جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس تفصیل کا ایک اجمالی خاکہ ہے جسے اسلامی مؤرخین نے منجملہ "ابن اثیر" "کامل" میں درج کیا ہے۔

چند قابل غور مطلب:

۱۔ "اذکروا" کی تعبیر بتاتی ہے کہ یہ آیات، جنگ کے ختم ہونے اور کچھ وقت گزر جانے کے بعد نازل ہوئیں یعنی اب مسلمانوں کے لیے موقع تھا کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا تھا، اس کا اپنی فکر و نظر کے مطابق تجزیہ و تحلیل کریں تاکہ اس کا گہرا اثر ہو۔

۲۔ "جنود" کی تعبیر زمانۂ جاہلیت کے مختلف گروہ اور قبائل کی طرف اشارہ ہے (مثلاً قریش، غطفان، بنی سلیم، بنی اسد، بنی فزارہ، بنی اشجع اور بنی مرہ) جن میں مدینہ کے اندر رہنے والا یہودیوں کا قبیلہ بھی ہے۔

۳۔ "جنودا لم تروھا" سے مراد جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کے لیے آئے تھے، وہی فرشتے تھے جن کا مومنین کی جنگ بدر میں مدد کرنا بھی صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ سورۂ انفال کی آیہ ۹ کے ذیل میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ نظر نہ آنے والا فرشتوں کا خدائی لشکر باقاعدہ طور پر میدان میں داخل ہوا اور وہ جنگ میں بھی مصروف ہوا ہو بلکہ ایسے قرائن موجود ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ وہ صرف مومنین کے حوصلے بلند کرنے اور ان کا دل گرمانے کے لیے نازل ہوئے تھے۔[1]

بعد والی آیت جو جنگِ احزاب کی بحرانی کیفیت، دشمنوں کی عظیم طاقت اور بہت سے مسلمانوں کی شدید پریشانی کی تصویر کشی کرتے ہوئے یوں کہتی ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب وہ تمھارے شہر کے اُوپر اور نیچے سے داخل ہو گئے۔ (اور مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا) اور اس وقت کو جب آنکھیں شدت وحشت سے پتھرا گئی تھیں اور جان لبوں تک آئی ہوئی تھی اور خدا کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے تھے:" (اذ جاءوکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا)

بہت سے مفسرین اس آیت میں لفظ "فوق" کو مدینہ کی مشرقی جانب کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ قبیلہ "غطفان" ادھر سے وارد ہوا تھا۔ اور "اسفل" (نیچے) کو مغرب کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ "قریش اور ان کے ساتھی وہیں سے داخل ہوئے تھے۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مکہ ٹھیک مدینہ کی جنوبی سمت میں واقع ہے لہٰذا مشرکین مکہ کے قبائل کو جنوب سے آنا چاہیئے لیکن شاید شہر مدینہ میں داخل ہونے کے راستے کی کیفیت کچھ اس طرح تھی کہ انھوں نے شہر کا تھوڑا سا چکر لگایا اور مغرب کی طرف سے شہر کے اندر آ گئے۔ صورت حال خواہ کچھ بھی ہو، اوپر والا جملہ اسلام کے مختلف دشمنوں کی طرف سے اس شہر کے محاصرہ کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۷ ص میں مذکورہ آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔

"زاغت الابصار" کے جملہ میں "لفظ" زاغت " " زیغ " کے مادہ سے ایک طرف جھکاؤ کے معنی میں ہے جو ایسی حالت کی طرف اشارہ ہے جو زبردست خوف اور وحشت کی صورت میں انسان پر طاری ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی آنکھیں ہر طرف سے ہٹ کر ایک معین نقطہ پر ٹھہر جاتی ہیں اور خیرہ ہو جاتی ہیں۔

"بلغت القلوب الحناجر" (دل، حلق تک پہنچ چکے تھے) کا جملہ ایک عمدہ جملہ ہے۔ جس طرح فارسی زبان میں بھی ہے کہ (اس کی جان لبوں تک پہنچ گئی) ورنہ دل جس کا ایک مخصوص معنی ہے یعنی جو خون کی تقسیم کا مرکز ہے کسی بھی صورت میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا اور نہ ہی کبھی حلق تک پہنچتا ہے۔

اور "تظنون باللہ الظنونا" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کیفیت سے مسلمانوں کی ایک جماعت کے لیے غلط قسم کے گمان پیدا ہو گئے تھے کیونکہ وہ ابھی تک ایمانی قوت کے لحاظ سے کمال کے مرحلہ تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ وہ شدت سے متزلزل ہوئے۔

شاید ان میں سے کچھ لوگ گمان کرتے تھے کہ آخر کار ہم شکست کھا جائیں گے اور اس قدرت و قوت کے ساتھ دشمن کا لشکر کامیاب ہو جائے گا، اسلام کے زندگی کے آخری دن آپہنچے ہیں اور پیغمبرؐ کا کامیابی کا وعدہ کبھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

البتہ یہ افکار و نظریات ایک عقیدہ کی صورت میں نہیں بلکہ ایک وسوسہ کی شکل میں بعض لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہو گئے تھے بالکل ویسے ہی جیسے جنگِ اُحد کے سلسلہ میں قرآن مجید ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "وطائفۃ قد اھمتھم انفسھم یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ" یعنی تم میں سے ایک گروہ جنگ کے ان بحرانی لمحات میں صرف اپنی جان کی فکر میں تھا اور جاہلیت کے دور کے گمانوں کی مانند خدا کے بارے میں غلط گمان رکھتے تھے۔ (آل عمران آیہ ۱۵۴)

البتہ محل بحث آیت میں مخاطب یقیناً مسلمان ہیں اور "یا ایھا الذین اٰمنوا" کا جملہ جو اس سے قبل کی آیت میں ہے اس معنی کی دلیل ہے اور جنھوں نے اس کا مخاطب منافقین کو سمجھا ہے گویا انھوں نے یا تو اس نکتہ کی طرف توجہ نہیں کی یا پھر خیال کیا کہ اس قسم کی بدگمانی ایمان اور اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ حالانکہ اس قسم کے افکار کا وسوسہ کی حد تک ظاہر ہونا اور وہ بھی سخت بحرانی حالات میں ایک فطری اور معمول کے مطابق بات ہے۔[1]

یہی وہ منزل تھی کہ خدائی امتحان کی بھٹی سخت گرم تھی جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے کہ "وہاں مومنین کو آزمایا گیا اور وہ سخت ہل گئے تھے": (ھنالک ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالاً شدیداً)۔

فطری امر ہے کہ جب انسان فکری طوفانوں میں گھر جاتا ہے تو اس کا جسم بھی ان طوفانوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، بلکہ

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں "ظنون" کا عمومی معنی اچھے اور بُرے گمان لیا ہے لیکن اس آیت میں اور اس سے بعد والی آیت میں موجود قرائن بتاتے ہیں کہ مراد بُرے گمان ہیں۔

وہ بھی اضطراب اور تزلزل کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ جب لوگ ذہنی طور پر پریشان ہوتے ہیں تو وہ جہاں بھی بیٹھے ہوتے ہیں اکثر بے چین رہتے ہیں، ہاتھ ملتے رہتے ہیں اور اپنے اضطراب اور پریشانیوں کو اپنی حرکات سے ظاہر کرتے رہتے ہیں

اس شدید پریشانی کے شواہد میں سے ایک یہ بھی تھا جسے مورخین نے بھی نقل کیا ہے کہ عرب کے پانچ مشہور جنگجو پہلوان جن کا سرخیل عمرو بن عبد ود تھا، جنگ کا لباس پہن کر اور مخصوص غرور اور تکبر کے ساتھ میدان میں آئے اور "ھل من مبارز" (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟) کی آواز لگانے لگے۔ خاص کر عمرو بن عبد ود رجز پڑھ پڑھ کر جنت اور آخرت کا مذاق اڑا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "کیا تم یہ نہیں کہتے ہو کہ تمہارے مقتول جنت میں جائیں گے؟ تو کیا تم میں سے کوئی بھی جنت کے دیدار کا شوقین نہیں ہے؟ لیکن اس کے ان نعروں کے مقابلہ میں لشکر پر بڑی طرح خاموشی طاری تھی اور کوئی بھی مقابلے کی جرأت نہیں رکھتا تھا سوائے علی بن ابی طالبؑ کے جو مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو عظیم کامیابی سے ہم کنار کر دیا۔ اس کی تفصیل نکات کی بحث میں آئے گی۔

جی ہاں! جس طرح فولاد کو گرم بھٹی میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ نکھر جائے اسی طرح اوائل کے مسلمان بھی جنگِ احزاب جیسے معرکوں کی بھٹی سے گزریں تاکہ کندن بن کر نکلیں اور حوادثات کے مقابل میں جرأت اور پامردی کا مظاہرہ کر سکیں۔

۱۲۔ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ○

۱۳۔ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ؕ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ○

۱۴۔ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ○

۱۵۔ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ○

۱۶۔ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

۱۷۔ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○

ترجمہ

۱۲۔ اس وقت کو یاد کرو جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی، کہتے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے ہمیں جھوٹے وعدوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔

۱۳۔ اس وقت کو بھی یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا، اے اہلِ یثرب (مدینہ والو!) یہاں تمھارے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ۔ اور ان میں سے ایک گروہ پیغمبر سے واپس پلٹ جانے کی اجازت لیتا اور کہتا تھا، ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے بلکہ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ (جنگ سے) بھاگ جائیں۔

۱۴۔ وہ تو ایسے لوگ تھے کہ اگر دشمن مدینہ کے اطراف و جوانب سے ان پر وارد ہوتے اور ان کو شرک کی طرف لوٹ جانے کی پیشکش کرتے تو وہ ضرور قبول کر لیتے اور سوائے تھوڑی سی مدّت کے اس راہ کے انتخاب کرنے سے دریغ نہ کرتے۔

۱۵۔ انھوں نے اس سے پہلے خدا سے عہد کیا تھا کہ وہ دشمن کی طرف پشت نہیں کریں گے۔ اور خدا کے عہد و پیمان کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا (اور وہ اس کے سامنے جواب دِہ

ہول گے)۔

۱۶۔ کہہ دیجئے کہ اگر موت یا مارے جانے سے فرار کرتے ہو تو وہ تمہارے لیے سودمند نہیں ہے اور اس وقتی زندگی کے تھوڑے سے فائدہ کے سوا تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔

۱۷۔ کہہ دیجئے کہ خدا کے ارادے کے مقابلہ میں کون تمہاری حفاظت کر سکے گا؟ اگر اس نے تمہارے لیے مصیبت یا رحمت کا ارادہ کر لیا ہے؟ اور خدا کے علاوہ تمھیں کوئی بھی سرپرست اور یار و یاور نہیں ملے گا۔

تفسیر

منافقین اور ضعیف الایمان میدانِ احزاب میں:

ہم کہہ چکے ہیں کہ امتحان کی بھٹی جنگِ احزاب میں گرم ہوئی اور سب کے سب اس عظیم امتحان میں گھر گئے۔ واضح رہے کہ اس قسم کے بحرانی دور میں جو لوگ عام حالات میں ظاہراً ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں، کئی صفوں میں بٹ جاتے ہیں۔ یہاں پر بھی مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک جماعت سچے مومنین کی تھی، ایک گروہ ہٹ دھرم اور سخت قسم کے منافقین کا تھا اور ایک گروہ اپنے گھر بار، زندگی اور بھاگ کھڑا ہونے کی فکر میں تھا۔ اور کچھ لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ دوسرے لوگوں کو جہاد سے روکیں۔ اور ایک گروہ اس کوشش میں مصروف تھا کہ منافقین کے ساتھ اپنے رشتہ کو محکم کریں۔

خلاصہ یہ کہ ہر شخص نے اپنے باطنی اسرار اس عجیب "عرصۂ محشر" اور "یوم البروز" میں آشکار کر دیئے۔

گذشتہ آیات میں ضعیف الایمان مسلمانوں کی جماعت کے بارے میں اور بُرے وسوسوں اور بدگمانیوں کے بارے میں جو انھیں لاحق تھیں گفتگو ہو رہی تھی۔ اور قرآن پہلی زیرِ بحث آیت میں منافقین اور دل کے بیمار لوگوں کے بارے میں گفتگو کو بیان کر رہا ہے۔ فرماتا ہے۔ "اس وقت کو یاد کرو جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل بیمار تھے، کہتے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے سوائے جھوٹے وعدوں کے ہمیں کچھ نہیں دیا" (واذ یقول المنافقون والذین فی

قلوبھم مرض ما وعدنا اللہ ورسولہ الا غرورا)۔

جنگِ احزاب کی تاریخ میں آیا ہے کہ خندق کھودنے کے دوران میں جب ہر ایک مسلمان خندق کے ایک حصہ کو کھودنے میں مصروف تھا تو ایک مرتبہ پتھر کے ایک سخت اور بڑے ٹکڑے سے ان کا سامنا ہوا کہ جس پر کوئی ہتھوڑا کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی تو آنحضرت بنفس نفیس خندق میں تشریف لے گئے اور اس پتھر کے پاس کھڑے ہو کر اور ہتھوڑا لے کر پہلی مرتبہ ہی اُس کے دل پر ایسی مضبوط چوٹ لگائی کہ اس کا کچھ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور اس سے ایک چمک نکلی جس پر آپؐ نے فتح و کامرانی کی تکبیر بلند کی۔ آپ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔

آپؐ نے ایک اور سخت چوٹ لگائی تو اس کا کچھ حصہ اور ٹوٹا اور اس سے بھی چمک نکلی۔ اس پر بھی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی آپ کے ساتھ تکبیر کہی آخر کار آپ نے تیسری چوٹ بھی لگائی جس سے بجلی کوندی اور باقی ماندہ پتھر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس موقع پر جناب سلمان فارسیؓ نے اس ماجرہ کے بارے میں دریافت کیا تو سرکارِ رسالت مآبؐ نے فرمایا: "پہلی چمک میں میں نے "حیرہ" کی سرزمین اور ایران کے بادشاہوں کے قصور و محلات دیکھے ہیں اور جبرائیل نے مجھے بشارت دی ہے کہ میری اُمت ان پر کامیابی حاصل کرے گی۔

دوسری چمک میں "شام اور روم" کے سُرخ رنگ کے محلات نمایاں ہوئے اور جبرائیل نے پھر بشارت دی کہ میری اُمت ان پر فتح یاب ہوگی۔ تیسری چمک میں مجھے "صنعا و یمن" کے قصور و محلات دکھائی دیئے اور جبرائیلؑ نے نوید دی کہ میری اُمت ان پر بھی کامیابی حاصل کرے گی۔ اے مسلمانو! تمھیں خوشخبری ہو!!

منافقین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا کیسی عجیب و غریب باتیں ہیں اور کیا ہی باطل اور بے بنیاد پروپیگنڈا ہے؟ مدینہ سے حیرہ اور مدائن کسریٰ کو تو دیکھ کر تمہیں ان کے فتح ہونے کی خبر دیتا ہے حالانکہ اس وقت تم چند عربوں کے چنگل میں گرفتار ہو (اور خود دفاعی پوزیشن اختیار کیے ہوئے ہو) تم تو بیت الخذر (خوف کی جگہ) تک نہیں جا سکتے کیا ہی خیال خام اور گمان باطل ہے)؟

تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور کہا کہ یہ منافق اور دل کے مریض کہتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے سوائے دھوکہ فریب کے ہمیں کوئی وعدہ نہیں دیا۔ (وہ پروردگار کی بے انتہا قدرت سے بے خبر ہیں)۔[1]

اس وقت اس قسم کی بشارت اور خوشخبری سوائے آگاہ اور باخبر مؤمنین کی نظر کے (باقی لوگوں کے لیے) دھوکا اور فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن پیغمبر کی ملکوتی آنکھیں ان آتشیں چنگاریوں کے درمیان سے جو کدالوں اور ہتھوڑوں کے

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۰۱۔ سیرۃ ابن ہشام میں بھی یہی واقعہ مختصر سے فرق کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور وہ یہ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا، بجلی کی پہلی کوند میں میں نے فتح یمن کو دیکھا اور دوسری کوند میں فتح شام و مغرب اور تیسری چمک میں مشرق (سرزمین ایران) کی فتح کو مشاہدہ کیا ہے۔ تاریخی لحاظ سے بھی ان تینوں علاقوں کی فتح ترتیبی طور پر برسرِ جنگ ہے۔

خندق کھودنے کے لیے زمین پر لگنے سے نکلتی تھیں، ایران، روم اور یمن کے بادشاہوں کے قصور و محلات کے دروازوں کے کھلنے کو دیکھ سکتے تھے اور اپنی جان کو ہتھیلی پر لیے ہوئے بھی اُمت کو بشارت دے سکتے تھے اور آئندہ کے اسرار و رموز سے پردے بھی اُٹھا سکتے تھے۔

شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ "الذین فی قلوبھم مرض" سے مراد وہ منافقین ہی تو ہیں اور اس جملہ کا ذکر درحقیقت "منافقین" کے لفظ کی وضاحت ہے جو پہلے آچکا ہے۔ نفاق کی بیماری سے بڑھ کر اور کونسی بیماری ہو سکتی ہے؟ کیونکہ صحیح و سالم اور خدائی فطرت رکھنے والے انسان کا صرف ایک ہی چہرہ ہوتا ہے، دو یا دو سے زیادہ چہروں والا انسان بیمار ہوتا ہے جو ہمیشہ اضطراب، تضاد اور تناقض کا شکار ہوتا ہے۔

اس بات کی گواہ وہ آیت ہے جو سورۂ بقرہ کی ابتداء میں آئی ہے اور منافقین کے بارے میں کہتی ہے:

"فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا" (بقرہ۔ ۱۰)

ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور خدا ان کے اعمال کی بنا پر ان کی بیماری میں اضافہ کرتا ہے۔

بعد والی آیت میں منافقین اور دل کے بیمار لوگوں میں سے ایک خطرناک گروہ کے حالات تفصیل سے بیان کرتا ہے جو دوسروں کی نسبت زیادہ خبیث اور آلودہ گناہ ہیں۔ چنانچہ کہتا ہے "اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا اے یثرب (مدینہ) کے رہنے والو! یہاں تمہارے رہنے کی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ"؛ (واذ قالت طائفۃ منھم یا اھل یثرب لا مقام لکم فارجعوا)۔

خلاصہ یہ کہ دشمنوں کے اس انبوہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اپنے آپ کو معرکہ کارزار سے نکال کر لے جاؤ اور اپنے آپ کو ہلاکت کے اور بیوی بچوں کو قید کے حوالے نہ کرو۔

اس طرح سے وہ چاہتے تھے کہ ایک طرف سے تو وہ انصار کے گروہ کو لشکرِ اسلام سے جُدا کر لیں اور دوسری طرف سے "انہی منافقین کا ٹولہ جن کے گھر مدینہ میں تھے، نبی اکرمؐ سے اجازت مانگ رہے تھے کہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنی اس واپسی کیلئے حیلے بہانے بنا رہے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے گھروں کے در و دیوار ٹھیک نہیں ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا، اس طرح سے وہ میدان کو خالی چھوڑ کر فرار کرنا چاہتے تھے"؛ (ویستأذن فریق منھم النبی یقولون ان بیوتنا عورۃ وما ھی بعورۃ ان یریدون الا فرارا)۔

لفظ "عورہ" "عار" سے ہے اور عورۃ اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے ظاہر کرنا ننگ و عار کا باعث ہو۔ وہ شگاف جو گھر کی دیوار میں ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح سرحدوں کے نازک اور خطرناک مقامات اور وہ چیزیں جن سے انسان خوف کھاتا ہو، سب اسی زمرے میں آتے ہیں، اور یہاں مراد وہ گھر ہیں جن کے قابلِ اطمینان در و دیوار نہ ہوں اور ہر وقت دشمن کے حملے کا خوف طاری رہتا ہو۔

منافقین اس قسم کا عذر پیش کر کے یہ چاہتے تھے کہ وہ میدان جنگ چھوڑ کر اپنے گھروں میں جا کر پناہ لیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ قبیلہ "بنی حارثہ" نے کسی شخص کو حضور رسالت پناہؐ کی خدمت میں بھیجا اور کہا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور انصار میں سے کسی کا گھر بھی ہمارے گھروں کی طرح نہیں اور ہمارے اور قبیلہ "غطفان" کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو

مدینہ کی مشرقی جانب سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اجازت دیجیئے تاکہ ہم اپنے گھروں کو پلٹ جائیں اور جاکر اپنے بیوی بچوں کا دفاع کریں تو سرکار رسالتؐ نے انھیں اجازت عطا فرمادی۔

جب یہ بات انصار کے سردار "سعد بن معاذ" کے گوش گذار ہوئی تو انھوں نے پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں عرض کیا "سرکار! انہیں اجازت نہ دیجیئے، بخدا آج تک جب بھی کوئی مشکل درپیش آئی تو ان لوگوں نے یہی بہانہ تراشا، یہ جھوٹ بولتے ہیں"۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ واپس آجائیں۔

"یثرب" مدینہ کا قدیمی نام ہے، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس شہر کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے تک اس کا نام "یثرب" رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا نام "مدینۃ الرسولؐ" (پیغمبر کا شہر) پڑ گیا جس کا مخفف "مدینہ" ہے۔

اس شہر کے کئی ایک نام اور بھی ہیں۔ سید مرتضیٰ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ان دو ناموں (مدینہ اور یثرب) کے علاوہ اس شہر کے گیارہ اور نام بھی ذکر کیے ہیں منجملہ ان کے "طیبہ" "طابہ" "سکینہ" "محبوبہ" "مرحومہ" اور "قاصمہ" ہیں۔ [1] اور بعض لوگ اس شہر کی زمین کو "یثرب" کا نام دیتے ہیں)[2]

چند ایک روایات میں آیا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "اس شہر کو یثرب نہ کہا کرو" شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یثرب اصل میں "ثرب" (بروزن حرب) کے مادہ سے ملامت کرنے کے معنی میں ہے اور آپؐ اس قسم کے نام کو اس بابرکت شہر کے لیے پسند نہیں فرماتے تھے۔

بہرحال منافقین نے اہل مدینہ کو "یا اہل یثرب" کے عنوان سے جو خطاب کیا ہے وہ بلا وجہ نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس نام سے نفرت ہے۔ یا چاہتے تھے کہ اسلام اور "مدینۃ الرسولؐ" کے نام کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کریں۔ یا لوگوں کو زمانۂ جاہلیت کی یاد تازہ کرائیں۔

بعد والی آیت میں خداوند عالم اس گروہ کے ایمان کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ اسلام کے اظہار میں اس قدر ضعیف اور ناتواں ہیں کہ اگر دشمن مدینہ کے اطراف وجوانب سے اس شہر میں داخل ہو جائیں اور مدینہ کو فوجی کنٹرول میں لے کر انہیں پیش کش کریں کہ کفر و شرک کی طرف پلٹ جائیں تو جلدی سے اس کو قبول کرلیں گے اور اس راہ کے انتخاب کرنے میں ذرا سا بھی توقف نہیں کریں گے"۔ (ولو دخلت علیھم من اقطارھا ثم سئلوا الفتنۃ لاٰتوھا وما تلبثوا بھا الا یسیرا)۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قدر ضعیف، کمزور اور غیر مستقل مزاج ہوں کہ نہ تو دشمن سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہوں اور نہ ہی راہ خدا میں شہادت قبول کرنے کے لیے ایسے لوگ بہت جلد ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اپنی راہ فوراً بدل لیتے ہیں۔

اسی بنا پر فتنہ کی لفظ سے مراد یہاں پر کفر و شرک ہی ہے جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات مثلاً سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۹۳ جیسی آیات میں آیا ہے۔

---

[1] مجمع البیان ج ۸ ص ۳۴۶۔

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں "فتنہ" سے مراد مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے کہ اگر اس منافق ٹولے کو پیش کش کی جائے تو وہ فوراً اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے فتنہ پردازوں کے ساتھ تعاون کرنے لگ جائیں۔

لیکن یہ تفسیر "ولو دخلت علیھم من اقطارھا . . . ." (کہ اگر مدینہ کے اطراف سے ان پر حملہ آور ہو جائیں . . .) کے ظاہری جملہ سے سازگار نہیں ہے اور شاید اسی بناء پر اکثر مفسرین نے اس سے پہلے معنی کو منتخب کیا ہے۔

پھر قرآن اس منافق ٹولے کو عدالت کے کٹہرے میں لاکر کہتا ہے: "انھوں نے پہلے سے خدا کے ساتھ عہد و پیمان باندھا ہوا تھا کہ دشمن کی طرف پشت نہیں کریں گے اور اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے ہوئے توحید، اسلام اور پیغمبرؐ کے لیے دفاع میں کھڑے ہوں گے۔ کیا وہ جانتے نہیں کہ خدا سے کیے گئے عہد و پیمان کے بارے میں سوال کیا جائے گا؟" (ولقد کانوا عاھدوا اللہ من قبل لا یولون الادبار وکان عھد اللہ مسئولاً)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس پیمان سے مراد وہی معاہدہ ہے جو "بنی حارثہ" نے جنگ اُحد کے دن خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کیا تھا جب کہ انھوں نے میدان سے پلٹنے کا ارادہ کیا تھا اور بعد میں پشیمان ہو گئے تھے اور عہد کیا تھا کہ پھر کبھی ان امور کے پیچھے نہیں جائیں گے۔ لیکن وہی لوگ جنگِ احزاب کے میدان میں دوبارہ عہد شکنی کی فکر میں پڑ گئے۔[1]

بعض نے اس عہد کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو جنگِ بدر میں یا ہجرتِ پیغمبرؐ سے پہلے عقبہ میں آنحضرتؐ سے باندھا تھا۔[2]

لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوپر والی آیت ایک ایسا وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ان کے ان معاہدوں کو بھی شامل ہے اور دوسرے معاہدوں کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

اصولی طور پر جو شخص ایمان لاتا اور رسولِ اسلامؐ کی بیعت کرتا ہے، درحقیقت وہ آپؐ سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اسلام اور قرآن کا جان کی حد تک دفاع کرے گا۔

یہاں پر عہد و پیمان پر زیادہ تر زور اس لیے دیا گیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عرب تک بھی کیے گئے عہد و پیمان کا احترام کرتے تھے۔ تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے بعد اپنے معاہدہ کو پامال کر ڈالے؟

جب خدا نے منافقین کی نیت کو فاش کر دیا کہ ان کا مقصد گھروں کی حفاظت کرنا نہیں، بلکہ میدانِ جنگ سے فرار کرنا ہے تو انہیں دو دلیلوں کے ساتھ جواب دیتا ہے۔

پہلے تو پیغمبرؐ سے فرماتا ہے۔ "کہہ دیجیے کہ اگر موت یا قتل ہونے سے فرار کرتے ہو تو یہ فرار تمھیں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ اور تم دنیاوی زندگی کے چند دن سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھاؤ گے"۔ (قل لن ینفعکم الفرار ان فررتم من الموت او القتل واذاً لا تمتعون الا قلیلاً)۔

فرض کرو کہ تم جان بچا کر فرار کر بھی گئے تو یہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو تمھاری اجل اور حتمی موت کا وقت آن پہنچا ہے

---

[1] تفسیر "قرطبی" اور "تفسیر فی ظلال القرآن" زیرِ بحث آیات کے ضمن میں۔

[2] "آلوسی" نے روح البیان میں اس قول کو نقل کیا ہے۔

تو تم جہاں بھی ہو گے، موت تمہارے دامن گیر ہو کر رہے گی۔ حتیٰ کہ خود تمہارے اپنے ہی گھروں میں اور تمہارے بیوی بچوں کے پاس بھی تمہیں موت آکر رہے گی۔ اندر یا باہر کا حادثہ تمہاری زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔ اور اگر اجل نہیں آئی تو ذلت، خواری اور رسوائی کے ساتھ یہ چار روزہ دنیاوی زندگی بسر کرنے اور دشمن کے چنگل میں اسیر ہو جانے کے بعد عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

درحقیقت یہ بیان اس بیان سے ملتا جلتا ہے جو جنگِ اُحد میں کمزور اساس منافقین کے ایک اور گروہ سے خطاب کی صورت میں نازل ہوا کہ:

"قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الیٰ مضاجعھم"

یعنی! کہہ دیجئے کہ اگرچہ تم اپنے گھروں میں بھی ہو، پھر بھی وہ لوگ جن کے لیے قتل ہو جانا مقدر ہو چکا ہے تو ان کے بستروں تک پہنچ کر انہیں تہہ تیغ کر دیں گے۔ (آل عمران - ۱۵۴)

دوسرا یہ کہ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارا سارا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے اور تم اس کی قدرت و مشیت کے دائرہ اختیار سے ہرگز بھاگ نہیں سکتے۔

"اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ دیجئے کون شخص خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں تمہاری حفاظت کر سکتا ہے، اگر وہ تمہارے لیے مصیبت یا رحمت چاہتا ہے؟" (قل من ذا الذی یعصمکم من اللہ ان اراد بکم سوءًا او اراد بکم رحمۃ)۔

جی ہاں! "وہ خدا کے علاوہ کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں پائیں گے؟" (ولا یجدون لھم من دون اللہ ولیًا ولا نصیرًا)۔

اب جبکہ تمام تقدیریں اس کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا جہاد کے سلسلہ میں اس کا فرمان جو دنیا میں بھی اور اللہ کی بارگاہ میں بھی باعثِ عزت و سرفرازی ہے، دل و جان سے قبول کرو۔ یہاں تک کہ اگر تمہیں اس راہ میں شہادت بھی نصیب ہو جائے تو اس کا خندہ پیشانی سے استقبال کرو۔

۱۸۔ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

۱۹۔ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۚ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

۲۰۔ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ۚ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۝

ترجمہ

۱۸۔ خدا ان افراد کو اچھی طرح جانتا ہے جو لوگوں کو جنگ سے روکتے ہیں اور ان کو بھی جو اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ ہماری طرف

آؤ (اور اپنے آپ کو معرکۂ جنگ سے باہر نکالو) وہ (کمزور افراد ہیں۔ اور) سوائے تھوڑی سی مقدار کے جنگ نہیں کرتے۔

۱۹۔ وہ تمہارے بارے میں ہر چیز میں بخیل ہیں اور جس وقت خوف اور بحران کے لمحات پیش آتے ہیں، تو آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کی طرف اس طرح سے دیکھتے ہیں اور ان کی آنکھوں کے ڈھیلے یوں چکر لگاتے ہیں، گویا (اپنے قالب کو چھوڑ رہے ہیں اور) ان پر موت کی غشی طاری ہے۔ لیکن جب خوف اور وحشت کی یہ حالت ختم ہو جاتی ہے تو وہ تمہارے خلاف غیظ و غضب سے لبریز تیز اور تند زبانیں کھولتے ہیں۔ (اور مالِ غنیمت سے اپنے حصّے کا مطالبہ کرتے ہیں) حالانکہ وہ اس میں بھی حریص اور بخیل ہیں وہ ہرگز ایمان نہیں لائے۔ لہٰذا خدا نے ان کے اعمال کو حبط اور نابود کر دیا اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے۔

۲۰۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ ابھی احزاب کا لشکر نہیں گیا اور اگر پلٹ آئیں تو یہ دوست رکھتے ہیں کہ بادیہ نشین بدوؤں کے درمیان منتشر اور مخفی ہو جائیں اور تمہاری خبریں حاصل کرتے رہیں اور اگر تمہارے درمیان رہیں تو سوائے تھوڑی سی دیر کے جنگ و پیکار نہ کریں۔

تفسیر

روکنے والا ٹولہ:

اس کے بعد منافقین کے اس گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جنگِ احزاب کے میدان سے خود بھی کنارہ کش ہوا اور دوسروں کو بھی کنارہ کشی کی دعوت دیتا تھا۔ فرماتا ہے "خدا تم میں سے اس گروہ کو جانتا ہے جو کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کو جنگ سے منحرف کردیں" (قد یعلم اللہ المعوقین منکم)۔

اور اسی طرح سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ ہماری طرف آؤ" اور اس خطرناک جنگ سے دستبردار ہو جاؤ" (والقائلین لاخوانھم ھلم الینا)۔

وہی لوگ جو اہلِ جنگ نہیں ہیں اور سوائے کم مقدار کے اور وہ بھی بطور جبر و اکراہ یا دکھاوے کے جنگ کے لیے نہیں جاتے" (ولا یأتون البأس الا قلیلا)۔

"معوقین" "عوق" (بروزن شوق) کے مادہ سے کسی چیز سے روکنے اور باز رکھنے کے معنی میں ہے۔ اور "باس" اصل میں سختی کے معنی میں ہے اور یہاں پر اس سے مراد "جنگ" ہے۔

اوپر والی آیت احتمالی صورت میں دو گروہوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک منافقین کے گروہ کی طرف جو مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھا ("منکم" کی تعبیر اس امر کی گواہ ہے) اور ان کی کوشش تھی کہ ضعیف الایمان مسلمانوں کو جنگ سے روکے رکھیں، یہ وہی "معوقین" تھے۔

دوسرے منافقین یا یہودیوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو میدان سے باہر بیٹھے ہوئے تھے اور جس وقت اسلام کے مجاہد سپاہیوں سے آمنا سامنا ہوتا تو کہتے کہ ہمارے پاس آجاؤ اور اپنے آپ کو اس معرکہ سے نکال لو۔ (یہ وہی لوگ ہیں جن کی طرف دوسرے جملہ میں اشارہ ہوا ہے)۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ شاید یہ آیت ایک ہی گروہ کی دو مختلف حالتوں کا بیان ہو۔ وہ لوگ جب دوسروں کے درمیان ہوتے ہیں تو انھیں جنگ سے روکتے ہیں اور جب ایک طرف ہو جاتے ہیں تو دوسروں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں۔

ہم ایک روایت میں پڑھتے ہیں کہ ایک صحابیٔ رسولؐ کسی ضرورت کے تحت میدانِ "احزاب" سے شہر میں آیا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو دیکھا کہ اس نے اپنے سامنے روٹی، بھنا ہوا گوشت اور شراب رکھے ہوئے تھے، تو صحابی نے کہا تم تو یہاں عیش و عشرت میں مشغول ہو اور رسولِ خدا نیزوں اور تلواروں کے درمیان مصروف پیکار ہیں۔ اس نے جواب میں کہا، اے بے وقوف! تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور مزے اڑاؤ۔ اس خدا کی قسم جس کی محمدؐ قسم کھاتا ہے وہ

اس میدان سے ہرگز پلٹ کر واپس نہیں آئے گا۔ اور یہ عظیم لشکر جو جمع ہو چکا ہے اسے اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ سن کر وہ صحابی کہنے لگے تو جھوٹ بکتا ہے، خدا کی قسم میں ابھی رسول اللہ کے پاس جا کر تمہاری اس گفتگو سے باخبر کرتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے بارگاہِ رسالت میں پہنچ کر تمام ماجرا بیان کیا تو اوپر والی آیت نازل ہوئی۔

اس شانِ نزول کی بناء پر "اخوانھم" (ان کے بھائی) کا لفظ ہو سکتا ہے کہ حقیقی بھائی کے معنی میں ہو یا پھر ہم مسلک کے معنی میں ہو جیسا کہ سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) کی آیت ۲۷ میں اسراف اور فضول خرچی کرنے والوں کو شیطانوں کے بھائی کا نام دیا گیا ہے: "ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین"

بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "ان تمام رکاوٹوں کا باعث یہ ہے کہ وہ تمہاری بابت تمام چیزوں میں بخیل ہیں" (اشحۃ علیکم)[1]

نہ صرف میدان جنگ میں جان قربان کرنے میں بلکہ وسائل جنگ مہیا کرنے کے لیے مالی امداد اور خندق کھودنے کے لیے جسمانی امداد حتی کہ فکری امداد مہیا کرنے میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں۔ ایسا بخل ہو حرص سے تو أم ہوتا ہے اور ایسا حرص جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ان کے بخل اور ہر قسم کے ایثار سے دریغ کرنے کے بیان کے بعد ان کے ان دوسرے اوصاف کو جو ہر عہد اور ہر دور کے تمام منافقین کے لیے تقریباً عمومیت کا درجہ رکھتے ہیں، بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "جس وقت خوفناک اور بحرانی لمحات آتے ہیں تو وہ اس قدر بزدل اور ڈرپوک ہیں کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ ان کی آنکھوں میں ڈھیلے بے اختیار گردش کر رہے ہیں، اس شخص کی طرح جو جاں کنی میں مبتلا ہو" (فاذا جاء الخوف رأیتھم ینظرون الیک تدور اعینھم کالذی یغشی علیہ من الموت)۔

چونکہ وہ صحیح ایمان کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہی زندگی میں ان کا کوئی مستحکم سہارا ہے، جس وقت کسی سخت حادثہ سے دوچار ہوتے ہیں تو کلی طور پر اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں گویا چاہتے ہیں کہ ان کی رُوح قبض ہو جائے۔

پھر مزید کہتا ہے: "لیکن یہی لوگ جس وقت کہ طوفان رُک جاتا ہے اور حالات معمول پر آجاتے ہیں تو تمہارے پاس یہ توقع لے کر آتے ہیں کہ گویا جنگ کے اصل فاتح یہی ہیں اور قرض خواہوں کی طرح پکار پکار کر اور سخت اور درشت الفاظ کے ساتھ مال غنیمت سے اپنے حصہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس میں سخت گیر، بخیل اور حریص ہیں (فاذا ذھب الخوف سلقوکم بالسنۃ حداد اشحۃ علی الخیر)۔

---

[1] "اشحۃ" "شح" کے مادہ سے "شحیح" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ایسا بخل جس سے حرص ملا ہوا ہو۔ اور یہ لفظ اکثر مفسرین کے بقول یہاں اصل اعراب کے لحاظ سے "حال" واقع ہو رہا ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بیان علت کے مقام میں حال ہو۔ (غور کیجئے گا)

"سلقوکم" "سلق" (بروزن خلق) کے مادہ سے کسی چیز کو غیظ وغضب سے کھولنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چاہے ہاتھ کا کھولنا ہو یا زبان کا۔ یہ تعبیر ان لوگوں کے بارے میں استعمال ہوئی ہے جو آمرانہ اور تحکمانہ لب ولہجے میں چیخ وپکار کر کسی چیز کو طلب کرتے ہیں۔

"السنۃ حداد" تیز وتند زبانوں کے معنی میں ہے اور یہاں پر سختی کے ساتھ بات کرنے سے کنایہ ہے۔

آیت کے آخر میں ان کی آخری صفت کی طرف جو واقع میں ان کی تمام بدبختیوں کی جڑ اور بنیاد ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "وہ ہرگز ایمان نہیں لائے" (اولئک لم یؤمنوا)۔

"اور اسی بنا پر خدا نے ان کے اعمال نیست ونابود کر دیئے ہیں" (فاحبط اللہ اعمالھم)۔

کیونکہ ان کے اعمال ہرگز خدا کی منشا اور ان کے خلوص پر مبنی نہیں ہیں اور "یہ کام خدا کے لیے بہت ہی آسان ہے" (وکان ذالک علی اللہ یسیرا)۔

مجموعی طور پر ہم اس طرح نتیجہ نکالتے ہیں کہ "معوقین" (بازر کھنے والے) ایسے منافق تھے جن کی یہ صفات تھیں،

۱۔ بہت ہی کم تعداد کے علاوہ باقی کوئی بھی اہل جنگ وجہاد نہیں تھے۔

۲۔ وہ کبھی جان ومال کے لحاظ سے اہل ایثار وقربانی نہیں تھے۔ اور تھوڑی سے تھوڑی پریشانی کے متحمل بھی نہیں ہوتے تھے۔

۳۔ طوفانی اور بحرانی لمحات میں شدتِ خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو کلی طور پر کھو بیٹھتے تھے۔

۴۔ کامیابی کے موقع پر اپنے آپ کو تمام اعزازات کا وارث سمجھتے تھے۔

۵۔ چونکہ وہ بے ایمان تھے لہٰذا ان کے اعمال بھی بارگاہِ الٰہی میں بے قدر وقیمت تھے۔

یہی حال ہر دور اور زمانہ کے ہر معاشرہ کے منافقین کا رہا ہے۔

قرآن مجید نے ان کی کیسی ظریفانہ انداز میں صفات بیان کی ہیں، جن کے ذریعہ ان کے ہم فکر لوگوں کو پہچانا جا سکتا ہے اور موجودہ دور میں ہم اس کے کتنے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں!!

بعد والی آیت اس گروہ کی بزدلی اور خوف کی زیادہ فصیح انداز میں تصویر کشی کرتے ہوئے کہتی ہے۔ "وہ اس قدر وحشت زدہ ہو چکے ہیں کہ احزاب اور دشمن کے لشکروں کے پراگندہ ہو جانے کے بعد بھی یہ تصور کرتے ہیں کہ ابھی وہ نہیں گئے" (یحسبون الاحزاب لم یذھبوا)۔

وحشتناک اور بھیانک تصور نے ان کی فکر پر سایہ ڈالا ہوا ہے۔ گویا کفر کی افواج پے در پے ان کی آنکھوں کے سامنے قطار در قطار جاری ہیں، ننگی تلواریں لیے اور نیزے تانے ان پر حملہ کر رہی ہیں۔

یہ بزدل، جھگڑالو، ڈرپوک منافق اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں، جب کسی گھوڑے کے ہنہنانے یا کسی اونٹ کے بلبلانے کی آواز سنتے ہیں تو مارے خوف کے لرزنے لگتے ہیں کہ شاید احزاب کے لشکر واپس آ رہے ہیں۔

آگے چل کر کہتا ہے "اگر احزاب دوبارہ پلٹ کر آ جائیں تو وہ اس بات پر تیار ہیں کہ بیابان کا رُخ کر لیں اور بادیہ نشین بدوؤں

کے درمیان منتشر ہو کر پنہاں ہو جائیں:" (وان یأت الاحزاب یودوا لو انھم بادون فی الاعراب)۔

ہاں، ہاں وہ چلے جائیں اور وہاں جا کر رہیں اور ہمیشہ تمہاری خبروں کے جویا رہیں:" (یسئلون عن انبآئکم)۔

ہر مسافر سے تمہاری ہر ہر پل کی خبر کے جویا رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں احزاب ان کی جگہ کے قریب آجائیں اور ان کا سایہ ان کے گھر کی دیواروں پر آپڑے اور تم پر یہ احسان جتلائیں کہ وہ ہمیشہ تمہاری حالت اور کیفیت کے متلاشی تھے۔

اور آخری جملہ میں کہتا ہے کہ" بالفرض وہ فرار بھی نہ کرتے اور تمہارے درمیان ہی رہتے، پھر بھی سوائے تھوڑی سی جنگ کے وہ کچھ نہ کرتے:" (ولو کانوا فیکم ما قاتلوا الا قلیلاً)۔

نہ ان کے جانے سے تم پریشان ہونا اور نہ ہی ان کے موجود رہنے سے خوشی منانا، کیونکہ نہ تو ان کی قدر و قیمت ہے اور نہ ہی کوئی خاص حیثیت، بلکہ ان کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہے۔

ان کی یہی تھوڑی سی جنگ بھی خدا کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی سرزنش اور ملامت کے خوف اور ظاہرداری یا ریاکاری کے لیے ہے کیونکہ اگر خدا کے لیے ہوتی تو اس کی کوئی حد و انتہا نہ ہوتی اور جب تک جان میں جان ہوتی وہ اس میدان میں ڈٹے رہتے۔

۲۱۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝

۲۲۔ وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝

۲۳۔ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝

۲۴۔ لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

۲۵۔ وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ۝

ترجمہ

۲۱۔ تم لوگوں کے لیے رسول خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ تھا ان لوگوں کے لیے جو

رحمتِ خدا اور روزِ جزاء کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

۲۲۔ جب مؤمنین نے احزاب کے لشکر کو دیکھا تو کہا یہ وہی ہے جس کا خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور خدا اور اس کے رسول نے سچ فرمایا ہے اور اس چیز نے سوائے ان کے ایمان اور تسلیم کے کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا۔

۲۳۔ مؤمنین میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ سے باندھے گئے عہد و پیمان پر صدقِ دل سے قائم ہیں، بعض اپنے عہد کو پورا کر گئے اور انہوں نے اس کی راہ میں شربت شہادت نوش کر لیا، اور کچھ انتظار میں ہیں اور انہوں نے ہرگز اپنے عہد و پیمان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔

۲۴۔ مقصد یہ ہے کہ خدا سچوں کو ان کی سچائی کی بناء پر اجر دے اور جب چاہے منافقین کو عذاب دے۔ یا (اگر توبہ کریں تو) ان کی توبہ قبول کرے کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے۔

۲۵۔ خدا نے کافر احزاب کا منہ پھیر دیا وہ جلتے کڑھتے نامراد لوٹ گئے اور خدا نے اس میدان میں مؤمنین کو جنگ سے بے نیاز کر دیا۔ (انہیں فتح عطا کی) اور خدا طاقت ور اور ناقابلِ شکست ہے۔

تفسیر

جنگ احزاب میں سچّے مومنین کا کردار:

اب تک مختلف گروہوں اور ان کے جنگِ احزاب میں کارناموں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی جن میں ضعیف الایمان مسلمان، منافق لوگ، کفر و نفاق کے سرغنے اور جہاد سے روکنے والے شامل ہیں۔

قرآن مجید اس گفتگو کے آخر میں "سچّے مومنین" ان کے بلند حوصلوں، پامردوں، جرأتوں اور اس عظیم جہاد میں ان کی دیگر خصوصیات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

اس بحث کی تمہید کو پیغمبر اسلامؐ کی ذات سے شروع کرتا ہے جو مسلمانوں کے پیشوا، سردار اور اسوۂ کامل تھے، خدا کہتا ہے: "تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی اور (میدانِ احزاب میں) ان کا کردار ایک اچھا نمونہ اور اسوہ تھا، ان لوگوں کے لیے جو رحمتِ خدا اور روزِ قیامت کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں" (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیرا)۔

تمہارے لیے بہترین اسوہ اور نمونہ، نہ صرف اس میدان میں بلکہ ساری زندگی پیغمبر اسلامؐ کی ذات والا صفات ہے۔ آپ کے بلند حوصلے، صبر و استقامت، پائمردی، زیرکی، دانائی، خلوص، خدا کی طرف توجہ، حادثات پر کنٹرول، مشکلات اور مصائب کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرنا، غرضکہ ان میں سے ہر ایک چیز مسلمانوں کے لیے نمونہ کامل اور اسوۂ حسنہ ہے۔

وہ ایسا عظیم ناخدا ہے کہ جب اس کی کشتی سخت ترین طوفانوں میں گھر جاتی ہے تو ذرہ برابر بھی کمزوری، گھبراہٹ اور سراسیمگی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ وہ کشتی کا ناخدا بھی ہے اور اس کا قابل اطمینان لنگر اور چراغ ہدایت بھی۔ وہ اس میں بیٹھنے والوں کے لیے آرام و سکون کا باعث بھی ہے اور ان کے لیے راحت جان بھی۔

وہ دوسرے مومنین کے ساتھ مل کر کدال ہاتھ میں لیتا ہے اور خندق کھودتا ہے، بیلچے کے ساتھ پتھر اکٹھا کر کے خندق سے باہر ڈال آتا ہے، اپنے اصحاب کے حوصلے بڑھانے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کے لیے ان سے مزاح بھی کرتا ہے، ان کے قلب و روح کو گرمانے کے حربی اور جوش و جذبہ دلانے والے اشعار پڑھ کر انھیں ترغیب بھی دلاتا ہے، ذکرِ خدا کرنے پر مسلسل اصرار کرتا ہے اور انھیں درخشاں مستقبل اور عظیم فتوحات کی خوشخبری دیتا ہے۔ انہیں منافقوں کی سازشوں سے متنبہ کرتا ہے اور ان سے ہمیشہ خبردار رہنے کا حکم دیتا ہے۔

صحیح حربی طریقوں اور بہترین فوجی چالوں کو انتخاب کرنے سے لمحہ بھر بھی غافل نہیں رہتا۔ اس کے باوجود مختلف طریقوں

سے دشمن کی صفوں میں شگاف ڈالنے سے بھی نہیں چوکتا۔

جی ہاں! وہ مومنین کا بہترین مقتدا رہے اور ان کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس میدان میں بھی اور دوسرے تمام میدانوں میں بھی۔

"اسوہ" (بروزن "عروہ") دراصل اس حالت کے معنی میں ہے جو انسان دوسرے کی پیروی کے وقت اپناتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی کی تأسی اور اقتدار کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس بناء پر اس کا معنی مصدری ہوگا نا کہ وصفی اور "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے لیے پیغمبر خدا کی ذات میں اچھی اقتدار اور پیروی ہے۔ ان کی اقتداء کرنے سے اپنی راہوں کی اصلاح اور "صراطِ مستقیم" کو اختیار کر سکتے ہو۔

جاذب نظر یہ امر ہے کہ قرآن زیر بحث آیت میں اس اسوۂ حسنہ کو ان اشخاص کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے جو تین خصوصیات کے حامل ہوں یعنی اللہ اور روز قیامت کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

حقیقت میں مبدأ اور معاد پر ایمان اس بات کا سبب ہے اور ذکرِ خدا اس کو دوام بخشتا ہے کیونکہ اس میں شک نہیں کہ جس کا دل اس قسم کے ایمان سے سرشار نہ ہو، وہ پیغمبر کے نقش قدم پر چل نہیں سکتا۔ نیز اس راہ پر چلتے ہوئے بھی اگر ہمیشہ ذکرِ خدا نہ کرے اور شیاطین کو اپنے سے نہ دھتکارے تو تأسی اور اقتدار کو جاری و ساری نہیں رکھ سکے گا۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام باوجود اس جواں مردی اور شجاعت کے جو جنگ کے تمام میدانوں میں ان سے دیکھنے میں آئی تھی اور جس کی ایک زندہ مثال اسی جنگِ احزاب میں بھی دیکھنے میں آئی، کہ جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا، ایک گفتگو میں فرماتے ہیں:

"کنا اذا احمر البأس اتقینا برسول اللہ فلم یکن احد منا اقرب الی العدو منہ"

"جب بھی جنگ کی آگ شعلہ ور ہوتی تو ہم رسول اللہؐ کی طرف پناہ لیتے اور ہم سے کوئی شخص بھی ان سے زیادہ دشمن کے قریب نہ ہوتا۔" [1]

اس مقدمے اور تمہید کے بعد سچے مومنین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے قرآن یوں فرماتا ہے: "جس وقت مومنین نے احزاب کے لشکروں کو دیکھا تو نہ صرف یہ کہ ان پر گھبراہٹ طاری نہ ہوئی بلکہ کہا کہ یہ وہی چیز ہے جس کا خدا اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا اور جس کی پہلی کرن آشکار ہو چکی ہے اور خدا اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا ہے اور اس واقعے نے ان کے ایمان اور جذبۂ تسلیم کے علاوہ کسی اور چیز میں اضافہ نہیں کیا:" (ولما رأ المؤمنون الاحزاب قالوا ھذا ما وعدنا اللہ ورسولہ وصدق اللہ ورسولہ وما زادھم الا ایمانا وتسلیما)۔

یہ کونسا وعدہ تھا جو خدا اور پیغمبر اکرمؐ نے کیا تھا؟

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، فصل غ، حرف ہمزہ۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ اس گفتگو کی طرف اشارہ ہے جو پہلے پیغمبر اکرمؐ نے کی تھی کہ عنقریب قبائل عرب اور تمہارے مختلف دشمن ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر تمہاری طرف آئیں گے۔ لیکن جان لو کہ آخر کار فتح تمہاری ہوگی۔

مؤمنین نے جب احزاب کے ہجوم کو دیکھا تو یقین کر لیا کہ یہ پیغمبر کا وہی وعدہ ہے اور کہا کہ اب جبکہ وعدے کا پہلا حصہ وقوع پذیر ہو چکا ہے تو دوسرا حصہ یعنی فتح و کامرانی بھی یقیناً اس کے پیچھے پیچھے آئے گی۔ لہٰذا ان کے ایمان اور جذبۂ تسلیم میں اضافہ ہو گیا۔

دوسرا یہ کہ خدا نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۴ میں مسلمانوں سے فرمایا تھا:

"کیا تم گمان کرتے ہو کہ آسانی کے ساتھ بہشت میں داخل ہو جاؤ گے، بغیر اس کے کہ کچھ حوادث مثل گذشتہ لوگوں کے حوادث کے تمہارے لیے ظاہر ہوں، وہی لوگ جو شدید پریشانیوں میں مبتلا ہوئے اور اس طرح سے ان کا عرصہ حیات ان کے لیے تنگ ہوا کہ انہوں نے کہا کہ خدا کی مدد کہاں ہے"؟

خلاصہ یہ کہ ان سے کہا گیا تھا کہ تم آزمائش کی سخت کٹھالیوں میں آزمائے جاؤ گے۔ اور وہ احزاب کو دیکھ کر خدا اور رسولؐ کی گفتگو کی صداقت کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا گیا۔

البتہ ان دونوں تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ ایک تو اصل میں خدا کا وعدہ ہے اور دوسرا اس کے پیغمبر کا وعدہ ہے اور یہ دونوں چیزیں زیر بحث آیت میں اکٹھی آئی ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو جمع کرنا نہایت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بعد والی آیت مومنین کے ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر اکرمؐ کی اقتداء میں سب سے زیادہ پیش قدمی کرتے تھے وہ خدا سے کیے ہوئے اپنے اس عہد و پیمان پر قائم تھے کہ وہ آخری سانس اور آخری قطرۂ خون تک فداکاری اور قربانی کے لیے تیار ہیں۔ فرمایا گیا ہے: "مومنین میں ایسے بھی ہیں جو اس عہد و پیمان پر قائم ہیں جو انھوں سے خدا سے باندھا ہے ان میں سے کچھ نے تو میدانِ جہاد میں شربتِ شہادت نوش کر لیا ہے اور بعض انتظار میں ہیں": (من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه فمنهم من قضی نحبه ومنهم من ینتظر)۔

"اور انھوں نے اپنے عہد و پیمان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔" اور نہ ہی ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی ہے: (وما بدلوا تبدیلاً)۔

منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے برعکس کہ جنہیں طوفان حوادث اِدھر سے اُدھر پھینک دیتے ہیں اور جو روزانہ اپنے ناتواں دماغ میں نت نئے اور ناپاک منصوبے پروان چڑھاتے رہتے ہیں، یہ ثابت الایمان مؤمن پہاڑ کی طرح محکم اور استوار ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ جو عہد و پیمان انہوں نے اس کے ساتھ باندھا ہے، وہ ہرگز ٹوٹنے والا نہیں ہے۔"

لفظ "نحب" (بروزن "عہد") عہد، نذر اور پیمان کے معنی میں ہے اور کبھی موت یا خطرے یا تیز چلنے یا بلند آواز سے گریہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔[1] {(۱) کا حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے}

مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ آیت کن افراد کے بارے ہے۔

اہل سنت کے مشہور عالم، حاکم ابوالقاسم حسکانی سند کے ساتھ حضرت علیؑ علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

"فینا نزلت (رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه) فانا والله المنتظر و ما بدلت تبدیلا"

آیۂ "رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه" ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے اور بخدا میں ہی وہ شخص ہوں جو شہادت کا، انتظار کر رہا ہوں (اور قبل ازیں ہم میں سے حمزہ سید الشہداء جیسے لوگ مردانہ وار شربتِ شہادت نوش کر چکے ہیں) اور میں نے ہرگز اپنی روش اور اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی نہیں کی اور اپنے کیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم ہوں۔ [1]

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ "من قضی نحبه" کا جملہ شہداء بدر و احد کی طرف اشارہ ہے اور "منهم من ینتظر" کا جملہ دوسرے سچے مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے جو فتح یا شہادت کے انتظار میں تھے۔

"انس بن مالک سے بھی نقل ہوا ہے کہ ان کے چچا "انس بن نضر" جنگِ بدر کے دن حاضر نہیں تھے۔ جنگ کے خاتمے پر جب انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے سخت افسوس کیا کہ وہ اس جہاد میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ تو اس وقت خدا کے ساتھ عہد کیا کہ اگر کوئی جنگ پیش آئی تو اس میں ضرور شریک ہوں گے اور جب تک جان میں جان ہے، میدان میں ڈٹے رہیں گے۔ لہٰذا انھوں نے دوسری جنگ احد میں شرکت کی اور جس وقت کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تو وہ ڈٹے رہے۔ بڑی بے جگری کے ساتھ لڑنے کے بعد مجروح ہوئے اور آخرکار درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ [2]

ابن عباس سے بھی منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

"منهم من قضی نحبه" کا جملہ حمزہ بن عبدالمطلب، باقی شہداء احد اور انس بن نضر اور ان کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے۔ [3]

ان تفسیروں کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ آیت کا ایک وسیع مفہوم ہے جو تمام ان شہداء اسلام پر محیط ہے جو جنگِ احزاب سے پہلے شربتِ شہادت نوش فرما چکے تھے۔ اور منتظرین بھی تمام وہ لوگ ہیں، جو فتح و کامرانی اور شہادت کے انتظار میں زندہ رہے ہیں۔ اور پہلے گروہ کے سردار حضرت حمزہؓ اور دوسرے کے سردار

(بقیہ صفحہ سابقہ)

[1] مفردات راغب، مجمع البیان اور لسان العرب (نحب)

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] مجمع البیان آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] تفسیر قرطبی، فی ظلال القرآن اور مجمع البیان (مختصر سے فرق کے ساتھ)

[3] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

جناب علی بن ابی طالبؑ قرار پاتے ہیں۔

اسی لیے تفسیر صافی میں آیا ہے:

"ان اصحاب الحسین بکربلا کانوا کل من اراد الخروج ودع الحسین وقال: السلام علیک یابن رسول اللہ! فیجیبہ وعلیک السلام ونحن خلفک، ویقرء فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر"

اصحاب امام حسینؑ میں سے جو بھی کربلا میں میدان کی طرف جانا چاہتا تو امام عالی مقام سے الوداع کرتا اور کہتا آپؑ پر سلام ہو اے فرزند رسول! (سلام وداع کرتا) تو امام بھی انہیں جواب دیتے اور پھر اس آیت کی تلاوت کرتے: "فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر"۔ [1]

کتب مقاتل سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے دوسرے شہداء، مثلاً مسلم بن عوسجہ کے جنازہ کے پاس بھی اور جس وقت "عبداللہ بن یقطر" کی خبر شہادت آپ کو ملی، اس وقت بھی اس آیت کو تلاوت فرمایا۔ [2]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت اس قسم کا وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ہر زمانے کے تمام سچے مومنین پر محیط ہے، چاہے وہ ہوں، جنہوں نے جامہ شہادت زیب تن کیا اور چاہے وہ ہوں جو بغیر کسی قسم کے تنزل کے اپنے خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جہاد و شہادت پر آمادہ رہے۔

بعد والی آیت میں مؤمنین اور منافقین کے اعمال کے نتیجے اور آخری ہدف کو ایک مختصر سے جملے میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ "مقصد یہ ہے کہ خدا سچوں کو ان کی سچائی کی وجہ سے جزائے خیر دے اور منافقین کو جب چاہے عذاب دے۔ اور (اگر وہ توبہ کریں) تو انہیں بخش دے اور ان کی توبہ قبول کرے۔ کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے"۔ (لیجزی اللہ الصادقین بصدقھم ویعذب المنافقین ان شاء او یتوب علیھم ان اللہ کان غفورا رحیما)۔

نہ تو مخلص مومنین کی سچائی اور وفاداری بغیر جزائے خیر کے رہے گی اور نہ ہی منافقین کی کمزوری اور تخریب کاری بغیر عذاب اور سزا کے رہے گی۔

قرآن توبہ کے دروازے اور بازگشت کی راہیں منافقین تک کے لیے کھلی رکھتا ہے، لہٰذا "او یتوب علیھم" کے جملہ کے ساتھ ان پر توبہ کے دروازے کھولتا ہے اور "غفور رحیم" کے ساتھ اپنی توصیف کرتا ہے تاکہ ایمان، صدق اور شرعی فرائض پر عمل درآمد کا جذبہ ان میں بیدار کیا جائے۔

---

[1] تفسیر صافی آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۴ ص ۲۵۹۔

چونکہ یہ جملہ منافقین کے غلط اعمال کے نتیجے کے طور پر ذکر ہوا ہے لہذا بعض بزرگ مفسرین نے اس سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ ممکن ہے بعض اوقات ایک عظیم گناہ آمادہ دلوں میں حق وحقیقت کی طرف حرکت، انقلاب اور بازگشت کا ذریعہ بن جائے اور وہ ایسی برائی بن جائے جو ایک خیر اور نیکی کا نقطۂ آغاز ٹھہرے۔[1]

زیر بحث آخری آیت جنگ احزاب کے سلسلہ میں حرفِ آخر کی صورت میں اس بحث کو ختم کرتی ہے۔ مختصر سی عبارتوں میں اس ماجرے کو واضح طور پر سمیٹے ہوئے کہتی ہے۔ "خدا نے کافروں کو ایسی حالت میں واپس لوٹایا کہ ان کے دل غیظ وغضب سے لبریز تھے وہ غم وغصہ میں چل رہے تھے اور وہ کسی ایسے نتیجے پر نہ پہنچ سکے جو ان کے پیشِ نظر تھا" (ورد اللہ الذین کفروا بغیظھم لم ینالوا خیرا)۔

"غیظ" کا معنی غصہ ہے۔ اور کبھی غم اور اندوہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں پر دونوں معانی مراد ہیں۔ لشکر احزاب، لشکرِ اسلام پر اپنی آخری فتح کا امیدوار تھا لیکن ناکام رہا اور غم وغصہ کی حالت میں اپنے علاقوں کی طرف لوٹ گیا۔

یہاں پر "خیر" سے مراد جنگ میں کامیابی ہے۔ البتہ لشکر کفر کی کامیابی کبھی بھی خیر نہیں تھی لیکن قرآن ان کی سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے اسے "خیر" سے تعبیر کرتا ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اس میدان میں کسی بھی قسم کی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "خیر" سے مراد "مال" ہے کیونکہ یہ لفظ کئی دوسرے مقامات پر بھی مال کے لیے بولا گیا ہے جن میں سے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۰ بھی ہے جسے آیۂ وصیت کہتے ہیں، اس میں ہے: "ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین"۔

کیونکہ لشکر کفر کے حملے کے اصل مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مدینہ کی غنیمتوں کو حاصل کریں اور اس سرزمین کو غارت کریں۔

لیکن "خیر" کے مفہوم کو یہاں "مال" کے معنی میں محدود کرنے پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ یہاں پر اس سے ہر قسم کی کامیابی مراد ہے جسے وہ مدنظر رکھے ہوئے تھے اور مال بھی ان سے ایک تھا جس سے وہ محروم رہے۔

بعد والے جملہ میں قرآن مزید کہتا ہے۔ "خدا نے اس میدان میں مؤمنین کو جنگ سے بے نیاز کر دیا" (وکفی اللہ المؤمنین القتال)۔

اس قسم کے اسباب وعوامل فراہم کیے کہ کسی قسم کی ایسی سختی پیش نہ آئی جس سے مومنین کا زیادہ نقصان ہوتا اور جنگ ختم ہوگئی، کیونکہ ایک طرف سے تو شدید طوفان اور سردی نے مشرکین کو درہم برہم کر دیا اور دوسری طرف خدا کے نظر نہ آنے والے لشکر کے ذریعے رعب، خوف اور وحشت کو ان کے دلوں میں ڈال دیا اور تیسری طرف سے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ضرب دشمن کے سب سے بڑے پہلوان عمرو بن عبدود پر پڑی جس سے وہ دیارِ عدم میں

---

[1] تفسیر المیزان آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

جا پہنچا۔ اس سے ان کی امیدوں اور آرزوؤں کی عمارت دھڑام سے نیچے آگری۔ یہ امر اس بات کا سبب ہوا کہ وہ مدینہ کا محاصرہ ترک کر کے اپنے اپنے قبائل کی طرف ناکام واپس پلٹ گئے۔

آیت کے آخری جملہ میں فرمایا گیا ہے۔ "خدا قوی اور ناقابل شکست ہے" (وکان اللہ قویا عزیزا)۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ "قوی" تو ہوں لیکن "عزیز" یعنی ناقابل شکست نہ ہوں یعنی ان پر زیادہ قوی شخص کامیاب ہوجائے۔ لیکن "ناقابل شکست طاقتور" صرف اور صرف خدا ہے جس کی طاقت اور قدرت لامتناہی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اس قسم کے بہت سخت اور خطرناک میدان میں اس قسم کی کامیابی مومنین کے نصیب کی کہ لڑائی، جنگ اور جان دینے تک کی نوبت بھی نہ آئی۔

جنگِ احزاب کے چند اہم پہلو:

۱۔ جنگ کی اہمیت: جنگِ احزاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں تمام قبائل اور مختلف اسلام دشمن طاقتیں نوخیز اسلام کی سرکوبی کے لیے متحد ہوگئی تھیں۔

جنگ احزاب کفر کی آخری کوشش، ان کے ترکش کا آخری تیر اور شرک کی قوت کا آخری مظاہرہ تھا۔ اسی بنا پر جب دشمن کا سب سے بڑا پہلوان عمرو بن عبدود عالم اسلام کے دلیر مجاہد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مقابلے میں آیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"برز الایمان کلہ الی الشرک کلہ"

"سارے کا سارا ایمان سارے کے سارے (کفر اور) شرک کے مقابلہ میں آگیا ہے"۔ [1]

کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی دوسرے پر فتح کفر کی ایمان پر یا ایمان کی کفر پر مکمل کامیابی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ فیصلہ کن معرکہ تھا جو اسلام اور شرک کے مستقبل کا تعین کر رہا تھا۔ اسی بنا پر دشمن کی اس عظیم جنگ اور کارزار میں کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے اقتدار عمل مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔

دشمن کا ستارۂ اقبال غروب ہوگیا اور اس کی طاقت کے ستون ٹوٹ گئے۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت رسولِ گرامی نے جنگِ احزاب کے خاتمے پر فرمایا:

"الان نغزوھم ولا یغزوننا"

"اب ہم ان سے جنگ کریں گے اور ان میں ہم سے جنگ کی سکت نہیں ہے"۔ [2]

۲۔ لشکروں کی تعداد: بعض مؤرخین نے لشکر کفار کی تعداد دس ہزار سے زیادہ لکھی ہے۔ مقریزی اپنی کتاب "الامتاع" میں لکھتے ہیں:

---

[1] بحار الانوار کی جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۵ میں یہ حدیث "کراجکی" سے نقل کی گئی ہے۔

[2] تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۹۴۔

"صرف قریش نے چار ہزار جنگ جوؤں، تین سو گھوڑوں اور پندرہ سو اونٹوں کے ساتھ خندق کے کنارے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ قبیلہ بنی سلیم سات سو افراد کے ساتھ "مر الظہران" کے علاقہ میں ان سے آ ملا۔ قبیلہ بنی فزارہ ہزار افراد کے ساتھ، بنی اشجع اور بنی مرہ کے قبائل میں سے ہر ایک چار چار سو افراد کے ساتھ پہنچ گیا۔ اور دوسرے قبائل نے بھی اپنے آدمی بھیجے جن کی مجموعی تعداد دس ہزار سے بھی زیادہ بنتی ہے۔"

جبکہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ انہوں نے مدینہ کے قریب "سلع" نامی پہاڑی کے دامن کو جو ایک بلند جگہ تھی اپنے اصلی لشکر گاہ کے طور پر منتخب کیا تھا جو خندق پر اس طرح سے حاوی تھی کہ وہ اپنے تیر اندازوں کے ذریعہ خندق سے آنے جانے والوں پر کنٹرول کر سکتے تھے۔

بہر حال لشکر کفر نے مسلمانوں کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا اور ایک روایت کے مطابق بیس دن دوسری کے مطابق پچیس دن اور بعض روایات کے مطابق ایک ماہ تک محاصرہ جاری رہا۔[1]

باوجودیکہ دشمن مسلمانوں کی نسبت مختلف پہلوؤں سے برتری رکھتا تھا لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، آخر کار ناکام ہو کر واپس پلٹ گیا۔

۳۔ خندق کی کھدائی: جیسا کہ معلوم ہے کہ خندق کے کھودنے کا سلسلہ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے وقوع پذیر ہوا۔ خندق اس زمانے میں ملک ایران میں دفاع کا مؤثر ذریعہ تھا اور جزیرۃ العرب میں اس وقت تک اس کی مثال نہیں تھی اور عرب میں اس کا شمار نئی ایجادات میں ہوتا تھا۔ اطراف مدینہ میں اس کا کھودنا فوجی لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ خندق دشمن کے حوصلوں کو پست کرنے اور مسلمانوں کو روحانی تقویت کا بھی ایک مؤثر ذریعہ تھی۔

خندق کے کوائف اور جزئیات کے بارے میں صحیح طور پر معلومات تک رسائی تو نہیں ہے البتہ مورخین نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ اس کا عرض اتنا تھا کہ دشمن کے سوار جست لگا کر بھی اس کو عبور نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی گہرائی یقیناً اتنی تھی کہ اگر کوئی شخص اس میں داخل ہو جاتا تو آسانی کے ساتھ دوسری طرف باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ علاوہ ازیں مسلمان تیر اندازوں کا خندق والے علاقہ پر اتنا تسلط تھا کہ اگر کوئی شخص خندق کو عبور کرنے کا ارادہ کرتا تو ان کے لیے ممکن تھا کہ اسے خندق کے اندر ہی تیر کا نشانہ بنا لیتے۔

رہی اس کی لمبائی تو مشہور روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس، دس افراد کو چالیس ہاتھ (تقریباً ۲۰ میٹر) خندق کھودنے پر مامور کیا تھا اور مشہور قول کے پیش نظر کہ لشکر اسلام کی تعداد تین ہزار تھی تو مجموعی طور پر اس کی لمبائی اندازاً بارہ ہزار ہاتھ (چھ ہزار میٹر) ہوگی۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۰ صفحہ ۲۲۔

اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس زمانے میں نہایت ہی ابتدائی وسائل کے ساتھ اس قسم کی خندق کھودنا بہت ہی طاقت فرسا کام تھا خصوصاً جب کہ مسلمان خوراک اور دوسرے وسائل کے لحاظ سے بھی سخت تنگی میں تھے۔

یقیناً خندق کھودی بھی نہایت کم مدت میں گئی۔ یہ امر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ لشکرِ اسلام پوری ہوشیاری کے ساتھ دشمن کے حملہ آور ہونے سے پہلے ضروری پیش بندی کر چکا تھا اور وہ بھی اس طرح سے کہ لشکرِ کفر کے مدینہ پہنچنے سے تین دن پہلے خندق کی کھدائی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

۴۔ بہت بڑی آزمائش کا میدان: جنگ احزاب عام مسلمانوں اور ان لوگوں کے لیے جو اسلام کے دعوے دار تھے، آزمائش کی عجیب کسوٹی تھی۔ اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی جو کبھی کبھار دعوے تو غیر جانبدار ہونے کا کرتے تھے، لیکن باطنی طور پر دشمنانِ اسلام سے ملے ہوئے تھے۔

اس جنگ سے تینوں گروہ (سچے مومنین، ضعیف الایمان اور منافقین) کا موقف ان کے اعمال و کردار کے ذریعے مکمل طور پر نمایاں ہو گیا اور اسلامی اقدار پورے طور پر آشکار ہو گئیں۔ ان تینوں نے جنگِ احزاب کی گرم بھٹی میں اپنے مخلص ہونے یا نہ ہونے کو ثابت کر دیا۔

اس حادثے کا طوفان اس قدر تند اور تیز تھا کہ کوئی بھی شخص جو کچھ اس کے دل میں تھا چھپا نہ سکا اور جن مطالب کے ظاہر ہونے کے لیے معمولی حالات میں سالہا سال کی ضرورت تھی وہ ایک مہینہ سے بھی کم مدت میں الم نشرح ہو کر سامنے آ گئے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پیغمبرؐ نے ــ اپنے صبر و استقامت، دلیرانہ مزاحمت، حوصلے، خدا پر توکل اور اپنے آپ پر اعتماد کا عظیم مظاہرہ کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے خندق کھودنے میں ان کے ساتھ مواسات اور ہم کاری کر کے اور جنگ کے مشکلات برداشت کر کے آپؐ نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ جو کچھ آپ اس سے پہلے اپنی تعلیمات کی صورت میں لا چکے ہیں، ان پر آپؐ کو صدقِ دل سے یقین ہے اور آپ ان کے وفادار ہیں اور جو کچھ آپ لوگوں سے کہتے ہیں، اس پر پہلے خود عمل کرتے ہیں۔

۵۔ حضرت علیؑ کی تاریخی جنگ: اس جنگ کا ایک اہم واقعہ حضرت علیؑ کا دشمن کے لشکر کے نامی گرامی پہلوان عمرو بن عبدود کے ساتھ مقابلہ تھا۔ تاریخ میں آیا ہے کہ لشکرِ احزاب نے جن دلاورانِ عرب میں سے بہت طاقت ور افراد کو اس جنگ میں اپنی امداد کے لیے دعوت دے رکھی تھی، ان میں سے پانچ افراد زیادہ مشہور تھے: عمرو بن عبدود، عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرہ، نوفل اور ضرار۔ یہ لوگ دورانِ محاصرہ ایک دن دست بدست لڑائی کے لیے تیار ہوئے، لباسِ جنگ بدن پر سجایا اور خندق کے ایک کم چوڑے حصے سے، جو مجاہدینِ اسلام کے تیروں کی پہنچ سے کسی قدر دور تھا، اپنے گھوڑوں کے ساتھ دوسری طرف جست لگائی اور لشکرِ اسلام کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے عمرو بن عبدود زیادہ مشہور اور نامور تھا۔ اس کی "کوئی ہے بہادر" کی آواز میدانِ احزاب میں گونجی اور چونکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس کے مقابلے کے لیے تیار نہ ہوا لہٰذا وہ زیادہ گستاخ ہو گیا اور مسلمانوں کے عقاید اور نظریات کا مذاق اڑانے لگا اور کہنے لگا،

تم جو کہتے ہو کہ تمہارے مقتول جنت میں ہیں اور ہمارے مقتول جہنم میں تو کیا تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے میں بہشت میں بھیجوں یا وہ مجھے جہنم کی طرف روانہ کرے ؟

اور اس موقع پر اس نے اپنے یہ مشہور اشعار پڑھے :

ولقد بححت عن النداء بجمعکم هل من مبارز!
ووقفت اذجبن المشجع موقف البطل المناجز!
ان السماحة والشجاعة فی الفتی خیرا لغرائز !!

تمہارے اجتماع میں میں نے اتنا پکارا اور مبارز طلبی کی کہ میری آواز بیٹھ گئی۔
میں اس وقت ایسی جگہ پر کھڑا ہوں کہ بہادر نما بزدل شجاع اس کی جگہ پر کھڑا ہونے سے گھبراتے ہیں۔
جی ہاں! شرافت اور شجاعت جواں مردوں کی بہترین خصلتیں ہیں۔

اس موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص کھڑا ہو اور اس کے شر کو مسلمانوں کے سر سے دور کر دے۔ لیکن حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سوا کوئی بھی اس کے ساتھ جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوا تو آنحضرتؐ نے علی ابن ابی طالبؑ سے فرمایا: "یہ عمرو بن عبدود ہے" حضرت علیؑ نے عرض کی حضور! میں بالکل تیار ہوں خواہ عمرو ہی کیوں نہ ہو۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا۔ میرے قریب آؤ ! چنانچہ علی علیہ السلام آپ کے قریب گئے اور آنحضرتؐ نے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور اپنی مخصوص تلوار ذوالفقار انہیں عطا فرمائی اور ان الفاظ میں انھیں دعا دی :

" اللّٰهم احفظه من بین یدیه ومن خلفه وعن یمینه وعن شماله ومن فوقه ومن تحته۔

" خدایا ! علیؑ کے سامنے سے ، پیچھے سے ، دائیں اور بائیں سے اور اوپر اور نیچے سے حفاظت فرما۔

حضرت علی علیہ السلام بڑی تیزی سے عمرو کے مقابلہ میں یہ اشعار پڑھتے ہوئے میدان میں اترے۔

لاتعجلن فقد اتاک مجیب صوتک غیر عاجز!
ذو نیة و بصیرة والصدق منجی کل فائز
انی لارجوان اقیم علیک نائحة الجنائز!
من ضربة غلاء یبقی صوتها بعد الهزاهز

جلدی نہ کرو کیونکہ تیری پکار کا قوی اور طاقت ور جواب دینے والا اب آگیا ہے۔
وہ شخص جو پاک نیت ، شائستہ بصیرت اور فاتح انسان کے لیے نجات دینے والی صداقت رکھتا ہے۔
مجھے امید ہے کہ نوحہ کرنے والیوں کی نوحہ زاری تیرے جنازہ کے پاس بلند کراؤں گا۔
ایسی واضح ضربت سے کہ جس کی صدا جنگ کے میدانوں کے بعد بھی باقی رہے۔ اور ہر جگہ پہنچے۔

یہی وہ موقع تھا کہ پیغمبر ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا۔

"برز الایمان کلہ الی الشرک کلہ"

پورے کا پورا ایمان پورے کے پورے کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے۔[1]

امیر المومنین علی علیہ السلام نے پہلے تو اسے اسلام کی دعوت دی جسے اس نے قبول نہ کیا۔ پھر میدان چھوڑ کر چلے جانے کو کہا۔ اس پر بھی اس نے انکار کیا اور اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھا آپؑ کی تیسری پیشکش یہ تھی کہ گھوڑے سے اُتر آئے اور پیادہ ہو کر دست بدست لڑائی کرے۔

عمرو آگ بگولہ ہو گیا اور کہا کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ عرب میں سے کوئی بھی شخص مجھے ایسی تجویز دے گا۔ گھوڑے سے اُتر آیا اور علی علیہ السلام پر اپنی تلوار کا وار کیا۔ لیکن امیر المومنینؑ نے اپنی مخصوص مہارت سے اس وار کو اپنی سپر کے ذریعے روکا۔ مگر تلوار نے سپر کو کاٹ کر آپؑ کے سر مبارک کو زخمی کر دیا۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے ایک خاص حکمت عملی سے کام لیا۔ عمرو بن عبدود سے فرمایا، تو عرب کا زبردست پہلوان ہے، جب کہ میں تجھ سے تن تنہا لڑ رہا ہوں۔ لیکن تو نے اپنے پیچھے کن لوگوں کو جمع کر رکھا ہے۔ اس پر عمرو نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے عمرو کی پنڈلی پر تلوار کا وار کیا، جس سے وہ سرد قد زمین پر لوٹنے لگا۔ شدید گرد و غبار نے میدان کی فضا کو گھیر رکھا تھا۔ کچھ منافقین یہ سوچ رہے تھے کہ حضرت علیؑ، عمرو کے ہاتھوں شہید ہو گئے ہیں۔ لیکن جب انھوں نے تکبیر کی آواز سُنی تو علیؑ کی کامیابی ان پر واضح ہو گئی۔ اچانک لوگوں نے دیکھا کہ آپ کے سر مبارک سے خون بہہ رہا تھا۔ اور لشکر گاہ اسلام کی طرف خراماں خراماں واپس آ رہے تھے۔ جبکہ فتح کی مسکراہٹ آپؑ کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اور عمرو کا بے سر پیکر میدان کے کنارے ایک طرف پڑا ہوا تھا۔

عرب کے مشہور پہلوان کے مارے جانے سے لشکر احزاب اور ان کی آرزوؤں پر ضرب کاری لگی۔ ان کے حوصلے پست اور دل انتہائی کمزور ہو گئے۔ اس ضرب نے ان کی فتح کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کامیابی کے بارے میں حضرت علیؑ سے ارشاد فرمایا:

"لو وزن الیوم عملک بعمل جمیع امۃ محمد لرجع عملک علی عملھم وذلک انہ لم یبق بیت من المشرکین الا وقد دخل ذل بقتل عمرو ولم یبق بیت من المسلمین الا وقد دخل عز بقتل عمرو"

اگر تمہارے آج کل کے عمل کو ساری اُمت محمد کے اعمال سے موازنہ کریں تو وہ ان پر بھاری

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۵۔ ابن ابی الحدید: شرح نہج البلاغہ جلد نمبر ۳ صفحہ ۲۴۳۔ احقاق الحق جلد نمبر ۳ ۔ یہ روایت ان کتب کے حوالے سے درج کی گئی ہے۔

ہوگا۔ کیونکہ عمرو کے مارے جانے سے مشرکین کا کوئی ایسا گھر باقی نہیں رہا جس میں ذلت وخواری داخل نہ ہوئی ہو اور مسلمانوں کا کوئی بھی گھر ایسا نہیں ہے جس میں عمرو کے قتل ہو جانے کی وجہ سے عزت داخل نہ ہوئی ہو۔" [1]

اہلِ سُنّت کے مشہور عالم، حاکم نیشاپوری نے اس گفتگو کو نقل کیا ہے۔ البتہ مختلف الفاظ کے ساتھ اور وہ یہ ہے:

"لمبارزة علی بن ابی طالب لعمرو بن عبدود یوم الخندق افضل من اعمال اُمتی الی یوم القیامة" [2]

"یعنی علی ابن ابی طالب کی خندق کے دن عمرو بن عبدود سے جنگ میری امت کے قیامت کے اعمال سے افضل ہے۔"

آپ کے اس ارشاد کا فلسفہ واضح ہے، کیونکہ اس دن اسلام اور قرآن ظاہراً نابودی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، ان کے لیے زبردست بحرانی لمحات تھے۔ جس شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فداکاری کے بعد اس میدان میں سب سے زیادہ ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا، اسلام کو اس خطرے سے محفوظ رکھا، قیامت تک اس کے دوام کی ضمانت دے دی، اس کی فداکاری سے شجرِ اسلام کی جڑیں مضبوط ہوگئیں اور پھر اسلام عالمین پر پھیل گیا۔ لہٰذا سب لوگوں کی عبادتیں اس کی مرہون منت قرار پاگئیں۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مشرکین نے کسی آدمی کو پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ عمرو بن عبدود کے لاشے کو دس ہزار درہم میں خرید لائے (شاید ان کا یہ خیال تھا کہ مسلمان عمرو کے بدن کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو سنگدل ظالموں نے حضرت حمزہؓ کے بدن کے ساتھ جنگِ احد میں کیا تھا) لیکن رسول اکرمؐ نے فرمایا: اس کا لاشہ تمہاری ملکیت ہے۔ ہم مُردوں کی قیمت نہیں لیا کرتے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جس وقت عمرو کی بہن اپنے بھائی کے لاشے پر پہنچی اور اس کی قیمتی زرہ کو دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس کے بدن سے نہیں اتاری تو اس نے کہا:

"ما قتله الا کفو کریم"

"میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس کا قاتل کریم اور بزرگوار شخص ہی تھا۔" [3]

۶۔ پیغمبرِ اسلام کے فوجی اور سیاسی اقدام:

پیغمبر اکرمؐ کی اور مسلمانوں کی جنگِ احزاب میں کامیابی کے بہت سے عوامل تھے۔ مثلاً تائیدِ الٰہی جو آندھی اور شدید طوفان کے ذریعے

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۰۔

[2] مستدرک حاکم جلد نمبر ۳ صفحہ ۳۲۔

[3] اس حصے میں "احقاق الحق" جلد نمبر ۳، بحار الانوار جلد نمبر ۲۰، تفسیر المیزان جلد نمبر ۱۶، "حبیب السیر" جلد اول اور "فروغ ابدیت" جلد نمبر ۲ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ہوئی اور اس نے احزاب کی تمام بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ نیز پروردگار کے نظر نہ آنے والے لشکر ان کے علاوہ اور بھی فوجی اور سیاسی عوامل تھے جن میں سے اہم ترین عامل خدا کی ذات پر ایمان اور عقیدہ تھا۔ بعض عوامل یہ تھے:

① حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خندق کھودنے کی تجویز کو قبول کر کے عربوں کی جنگی تکنیک میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا جو اس زمانے تک موجود نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی تکنیک تھی جس سے لشکر اسلام کے حوصلے بلند ہوئے اور سپاہ کفر کے چھکے چھوٹ گئے۔

② عمرو بن عبد ود کا اسلام کے عظیم اور مایۂ ناز ہیرو علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ہاتھوں مارا جانا اور اس کی موت سے لشکر احزاب کی امیدوں اور آرزوؤں پر پانی پھر جانا۔

③ لشکر اسلام کے باقاعدہ سوچی سمجھی سکیم کے تحت بنائے گئے مورچے اور مناسب فوجی تکنیک اس بات کا سبب بن گئے کہ دشمن شہر مدینہ میں داخل نہ ہو سکا۔

④ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ کامیابی کا اہم ترین عامل ایمان اور اللہ کی ذات پاک پر توکل تھا۔ اس کا بیج مسلمانوں کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بویا تھا۔ اس طویل جنگ میں مسلسل آیات قرآن کی تلاوت ہوتی رہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دل نشیں باتیں اہل ایمان کے سینوں میں ایمان و توکل کی آبیاری کرتی رہیں۔

⑤ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز عمل آپ کی عظیم روح اور نفس پر اعتماد مسلمانوں کو قوت قلب اور تسکین خاطر عطا کر رہے تھے۔

⑥ اس پر مزید نعیم بن مسعود کی داستان لشکر احزاب میں تفرقہ ڈالنے اور اسے کمزور کرنے کا اہم اور موثر عامل تھی۔

۷۔ نعیم بن مسعود کی داستان اور دشمن کے لشکر میں پھوٹ:

نعیم جو تازہ مسلمان تھے اور ان کے قبیلہ غطفان کو لشکر اسلام کی خبر نہیں تھی، وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ آپ مجھے جو حکم بھی دیں گے، میں حتمی کامیابی کے لیے اس پر کاربند رہوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تمہارے جیسا شخص ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہے۔ اگر تم دشمن کے لشکر میں پھوٹ ڈال سکتے ہو تو ڈالو۔ کیونکہ جنگ پوشیدہ تدابیر کا مجموعہ ہے۔"

نعیم بن مسعود نے ایک عمدہ تدبیر سوچی اور وہ یہ کہ وہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس گیا۔ جن سے زمانہ جاہلیت میں ان کی دوستی تھی۔ ان سے کہا بنی قریظہ! تم جانتے ہو کہ مجھے تمہارے ساتھ محبت ہے۔

انھوں نے کہا آپ سچ کہتے ہیں: ہم آپ کو اس بارے میں ہرگز کوئی الزام نہیں دیتے۔

نعیم بن مسعود نے کہا: قبیلہ قریش اور غطفان تمہاری طرح نہیں ہیں۔ یہ تمہارا اپنا شہر ہے۔ تمہارا مال اولاد اور عورتیں یہاں پر ہیں اور تم ہرگز یہ نہیں کر سکتے کہ یہاں سے کوچ کر جاؤ۔

قریش اور قبیلہ غطفان محمدؐ اور ان کے اصحاب کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں اور تم نے ان کی حمایت کی ہے جبکہ ان کا شہر کہیں اور ہے اور ان کے مال اور عورتیں بھی دوسری جگہ پر ہیں۔ اگر انھیں موقع ملے تو لوٹ مار اور غارت گری کر کے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اگر کوئی مشکل پیش آجائے تو اپنے شہر کو لوٹ جائیں گے، لیکن تم نے اور محمدؐ نے تو اسی شہر میں رہنا ہے اور یقیناً تم اکیلے ان سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، تم اس وقت تک اسلحہ نہ اُٹھاؤ جب تک قریش سے کوئی معاہدہ نہ کرلو اور وہ اس طرح کہ وہ چند سرداروں اور بزرگوں کو تمھارے پاس گروی رکھ دیں تاکہ وہ جنگ میں کوتاہی نہ کریں۔

بنی قریظہ کے یہودیوں نے اس کو بہت سراہا۔

پھر نعیم مخفی طور پر قریش کے پاس گیا۔ ابوسفیان اور قریش کے چند سرداروں سے کہا کہ تم اپنے ساتھ میری دوستی کی کیفیت سے اچھی طرح آگاہ ہو۔ ایک بات میرے کانوں تک پہنچی ہے، جسے تم تک پہنچانا میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں تاکہ خیر خواہی کا حق ادا کرسکوں لیکن میری خواہش یہ ہے کہ یہ بات کسی اور کو معلوم نہ ہونے پائے۔

انہوں نے کہا کہ تم بالکل مطمئن رہو۔

نعیم کہنے لگے: تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہودی محمدؐ کے بارے میں تمھارے طرزِ عمل سے اپنی برات کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہودیوں نے محمدؐ کے پاس قاصد بھیجا ہے اور کہلوایا ہے کہ ہم اپنے کیے پر پشیمان ہیں اور کیا یہ کافی ہوگا کہ ہم قبیلہ قریش اور غطفان کے چند سردار آپ کے لیے یرغمال بنالیں اور ان کو بندھے ہاتھوں آپ کے سپرد کردیں تاکہ آپ ان کی گردن اڑادیں۔ اس کے بعد ہم آپ کے ساتھ مل کر ان کی بیخ کنی کریں گے؟ محمد نے بھی ان کی پیش کش کو قبول کرلیا ہے۔ اس بنا پر اگر یہودی تمھارے پاس کسی کو بھیجیں اور گروی رکھنے کا مطالبہ کریں تو ایک آدمی بھی ان کے سپرد نہ کرنا کیونکہ خطرہ یقینی ہے۔

پھر وہ اپنے قبیلہ غطفان کے پاس آئے اور کہا: تم میرے اصل اور نسب کو اچھی طرح جانتے ہو۔ میں تمھارا عاشق اور فریفتہ ہوں اور میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمھیں میرے خلوصِ نیت میں تھوڑا سا بھی شک و شبہ ہو۔

انھوں نے کہا، تم سچ کہتے ہو، یقیناً ایسا ہی ہے۔

نعیم نے کہا: میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں لیکن ایسا ہو کہ گویا تم نے مجھ سے نہیں سُنی۔

انھوں نے کہا، مطمئن رہو، یقیناً ایسا ہی ہوگا، وہ بات کیا ہے؟

نعیم نے وہی بات جو قریش سے کہی تھی، یہودیوں کے پشیمان ہونے اور یرغمال بنانے کے ارادے کے بارے میں حرف بحرف ان سے بھی کہہ دی اور انھیں اس کام کے انجام سے ڈرایا۔

اتفاق سے وہ (ماہ شوال ۵ھ ہجری کے) جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی رات تھی۔ ابوسفیان اور غطفان کے سرداروں نے ایک گروہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس بھیجا اور کہا: ہمارے جانور یہاں تلف ہو رہے ہیں اور یہاں ہمارے لیے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ کل صبح ہمیں حملہ شروع کرنا چاہیئے تاکہ کام کو کسی نتیجے تک پہنچائیں۔

یہودیوں نے جواب میں کہا: کل ہفتہ کا دن ہے اور ہم اس دن کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ علاوہ ازیں ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ اگر جنگ نے تم پر دباؤ ڈالا تو تم اپنے شہروں کی طرف پلٹ جاؤ گے اور ہمیں یہاں تنہا چھوڑ دو گے۔ ہمارے

تعاون اور ساتھ دینے کی شرط یہ ہے کہ ایک گروہ گروی کے طور پر ہمارے حوالے کر دو۔

جب یہ خبر قبیلہ قریش اور غطفان تک پہنچی تو انھوں نے کہا، خدا کی قسم نعیم بن مسعود سچ کہتا تھا۔ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔

لہٰذا انھوں نے اپنے قاصد یہودیوں کے پاس بھیجے اور کہا، بخدا ہم تو ایک آدمی بھی تمہارے سپرد نہیں کریں گے اور اگر جنگ میں شریک ہو تو ٹھیک ہے، شروع کرو۔

بنی قریظہ جب اس سے باخبر ہوئے تو انھوں نے کہا، واقعاً نعیم بن مسعود نے حق بات کہی تھی! یہ جنگ نہیں کرنا چاہتے بلکہ کوئی چکر چلا رہے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ لوٹ مار کر کے اپنے شہروں کو لوٹ جائیں اور ہمیں محمدؐ کے مقابلے میں اکیلا چھوڑ جائیں۔ پھر انہوں نے پیغام بھیجا کہ اصل بات وہی ہے جو ہم کہہ چکے ہیں۔ بخدا اب تک کچھ افراد گروی کے طور پر ہمارے سپرد نہیں کرو گے، ہم بھی جنگ نہیں کریں گے۔ قریش اور غطفان نے بھی اپنی بات پر اصرار کیا۔ لہٰذا ان کے درمیان بھی اختلاف پڑ گیا۔ اور یہ وہی موقع تھا کہ رات کو اس قدر زبردست سرد طوفانی ہوا چلی کہ ان کے خیمے اکھڑ گئے اور دیگیں چولہوں سے زمین پر آ پڑیں۔

یہ سب عوامل مل ملا کر اس بات کا سبب بن گئے کہ دشمن کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا اور فرار کو قرار پر ترجیح دینی پڑی۔ حتیٰ کہ میدان میں ان کا ایک آدمی بھی نہ رہا۔ [1]

۸۔ حذیفہ کا واقعہ: بہت سی تواریخ میں آیا ہے، حذیفہ یمانی کہتے ہیں کہ ہم جنگ خندق کے ایام میں بھوک اور تھکن، وحشت اور اضطراب سے اس قدر دوچار تھے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک رات (لشکر احزاب میں اختلاف پڑ جانے کے بعد) پیغمبرؐ نے فرمایا، کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو چھپ چھپا کر دشمن کی لشکر گاہ میں جائے اور ان کے حالات معلوم کر لائے تاکہ وہ جنت میں میرا رفیق اور ساتھی ہو۔

حذیفہ کہتے ہیں خدا کی قسم کوئی شخص بھی شدتِ وحشت، تھکن اور بھوک کے مارے اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حالت دیکھی تو مجھے آواز دی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا جاؤ اور میرے پاس ان لوگوں کی خبر لے آؤ۔ لیکن وہاں کوئی اور کام انجام نہ دینا یہاں تک کہ میرے پاس آجاؤ۔

میں ایسی حالت میں وہاں پہنچا جب کہ سخت آندھی چل رہی تھی اور طوفان برپا تھا اور خدا کا یہ لشکر انھیں تہس نہس کر رہا تھا۔ خیمے تیز آندھی کے سبب ہوا میں اڑ رہے تھے۔ آگ بیابان میں پھیل چکی تھی۔ کھانے پینے کے برتن الٹ پلٹ گئے تھے۔ اچانک میں نے ابوسفیان کا سایہ محسوس کیا کہ وہ اس تاریکی میں بلند آواز سے کہہ رہا تھا: اے قریش! تم میں سے ہر ایک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص کو اچھی طرح سے پہچان لے تاکہ یہاں کوئی بے گانہ نہ ہو، میں نے پہل کر کے فوراً ہی اپنے پاس بیٹھنے والے شخص سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا، میں فلاں ہوں، میں نے کہا بہت اچھا۔

پھر ابوسفیان نے کہا خدا کی قسم! یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، ہمارے اونٹ گھوڑے ضائع ہو چکے ہیں اور بنی قریظہ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۲۲۰ (تلخیص کے ساتھ)۔

نے اپنا پیمان توڑ ڈالا ہے اور اس طوفان نے ہمارے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔

پھر وہ بڑی تیزی سے اپنے اونٹ کی طرف بڑھا اور سوار ہونے کے لیے اسے زمین سے اُٹھایا۔ وہ اس قدر جلدی میں تھا کہ اونٹ کے پاؤں میں بندھی ہوئی رسی کو کھولنا بھول گیا۔ لہٰذا اونٹ تین پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوچا ایک ہی تیر سے اس کا کام تمام کر دوں ابھی تیر چلّہ کمان میں جوڑا ہی تھا کہ فوراً آنحضرت کا فرمان یاد آ گیا کہ جس آپ نے فرمایا تھا، کچھ کارروائی کئے بغیر واپس آجانا، تمہارا کام صرف وہاں کے حالات ہمارے پاس لانا ہے لہٰذا میں واپس پلٹ گیا اور جا کر تمام حالات عرض کیے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا،

"اللّٰھُمَّ انت منزل الکتاب، سریع الحساب، اھزم الاحزاب اللّٰھُمَّ اھزمھم وزلزلھم۔"

"خداوندا! تو کتاب کو نازل کرنے والا اور سریع الحساب ہے، تو خود ہی احزاب کو نیست و نابود فرما! خدایا! انھیں تباہ کر دے اور ان کے پاؤں نہ جمنے دے۔"[1]

۹۔ جنگِ احزاب کے نتائج:

جنگِ احزاب تاریخ اسلام میں ایک اہم موڑ اور سنگِ میل ثابت ہوئی جس میں فوجی اور سیاسی اعتبار سے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہو گیا۔

بطورِ خلاصہ اس جنگ کے مفید نتائج چند جملوں میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔

الف:۔ دشمن کی آخری کوششوں کا ناکام ہو جانا اور ان کی برتری کی آخری طاقت کا ٹوٹ جانا۔

ب:۔ منافقین کی سازش کا آشکار ہو جانا اور ان خطرناک داخلی دشمنوں کا مکمل طور پر بھانڈا پھوٹ جانا۔

ج:۔ جنگِ احد کی شکست کی تلخ یادوں کی تلافی۔

د:۔ دشمن کے دل میں مسلمانوں کی مزید طاقت اور ہیبت کا طاری ہو جانا۔

ھ:۔ جو معجزات مسلمانوں نے اس میدان میں دیکھے ان کی وجہ سے ان کے حوصلوں کا بلند ہو جانا۔

و:۔ مدینہ کے اندر اور باہر آنحضرتؐ کی حیثیت کا مسلّم ہو جانا۔

ز:۔ سرزمین مدینہ کا یہود بنی قریظہ کے شر سے صفایا کی راہ ہموار کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "اسوہ" اور "قدوہ" ہیں:

ہمیں معلوم ہے کہ لوگوں میں سے خدا کے بھیجے ہوئے افراد کا انتخاب اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ امتوں کے لیے عملی نمونہ بن سکیں، کیونکہ انبیاء کی عملی تبلیغ اور دعوت کا اہم اور مؤثر ترین حصہ ان کی عملی دعوت ہوتی ہے۔ اسی بناء پر علماء اسلام مقام نبوت کے لیے عصمت کو ایک لازمی شرط سمجھتے ہیں اور اس کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ انھیں لوگوں کے لیے "اسوہ" اور مخلوق کے لیے "قدوہ" ہونا چاہیے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۲۰ ص ۲۰۸۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء اور تاسی کا جو حکم آیا ہے وہ مطلق صورت میں ہے۔ جو آپ کی زندگی کے ہر شعبے کو اپنے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اگرچہ اس کی شانِ نزول جنگِ احزاب ہے لیکن شانِ نزول آیات کے مفاہیم کو کبھی بھی اپنے ساتھ محدود نہیں کرتی۔

اس لیے ہم اسلامی احادیث میں دیکھتے ہیں کہ پیروی کے سلسلے میں اہم سے اہم اور معمولی سے معمولی مسائل کا ذکر ہے۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان الصبر علی ولاۃ الامر مفروض لقول اللہ عزوجل لنبیہ (ص) فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل، وایجابہ مثل ذلک علی اولیائہ واھل طاعتہ، لقولہ، لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔"

"صبر و شکیبائی اسلامی حکام پر واجب ہے کیونکہ خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے، صبر کرو جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر و شکیبائی اختیار کی ہے اور اسی چیز کو آپ کے دوستوں اور اطاعت گزاروں پر آپ کی پیروی کرنے کے حکم کے ساتھ واجب فرمایا ہے۔" [1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز عشا پڑھتے تو وضو کا پانی اور اپنی مسواک اپنے سرہانے رکھ لیتے اور پانی کے برتن کو ڈھکنے سے ڈھانپ دیتے۔ ....."

پھر آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز تہجد کی کیفیت بیان فرمائی اور آخر میں فرمایا:

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔"

تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اسوۂ حسنہ ہے۔" [2]

واقعاً اگر ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو اپنے لیے اُسوہ قرار دے دیں، آپ کے ایمان و توکل خلوص و شجاعت، نظم و نظامت، زہد و تقویٰ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنالیں تو ہماری کایا پلٹ جائے اور ہماری زندگی روشن اور منور ہو جائے۔

آج سارے مسلمانوں پر خصوصاً باایمان اور پُرجوش نوجوانوں پر فرض ہے کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو حرف بحرف پڑھیں اور اسے دل میں جگہ دے کر ہر لحاظ سے اپنے لیے اسوہ و نمونہ قرار دیں، کیونکہ سعادت

---

[1] نورالثقلین ج ۴ ص ۲۶۵ بحوالہ احتجاج طبرسی۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱ ص ۴۵۶۔

کا اہم ترین وسیلہ اور کامیابی و کامرانی کی اصل کلید یہی ہے۔

خدا کو بہت یاد کرو:

خدا کو یاد کرنے کا حکم خصوصاً "ذکر کثیر" بارہا قرآنی آیات میں آیا ہے اور اسلامی روایات میں بھی اسے بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، یہاں تک کہ حضرت ابوذرؓ سے ایک حدیث ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے مجھ سے فرمایا:

"علیک بتلاوۃ کتاب اللہ وذکر اللہ کثیرًا فانہ ذکر لک فی السماء ونور لک فی الارض"

"تم پر قرآن کی تلاوت اور بہت یاد خدا لازم ہے کیونکہ اس کے سبب آسمانوں میں (فرشتے) تمہیں یاد کریں گے اور زمین میں تمہارے لیے نور ہوگا۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے:

"اذا ذکر العبد ربہ فی الیوم مأۃ مرۃ کان ذلک کثیرًا"

"جب انسان خدا کو دن میں سو مرتبہ یاد کرے تو یہ ذکر کثیر شمار ہوگا۔"[2]

نیز ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

"الا اخبرکم بخیر اعمالکم وازکاھا عند ملیکم وارفعھا فی درجاتکم وخیر لکم من الدینار والدرھم وخیر لکم من ان تلقوا عدوکم فتقتلونھم ویقتلونکم؟ قالوا: بلی یارسول اللہ! قال: ذکر اللہ کثیرًا"

"کیا میں تمہیں تمہارے پروردگار کے ہاں بہترین اعمال اور پاکیزہ ترین کاموں کے متعلق نہ بتاؤں؟ وہ عمل جو تمہارا بالاترین درجہ اور تمہارے لیے درہم و دینار سے بہتر ہو حتی کہ جہاد اور راہ خدا میں شہادت سے بھی بہتر ہے؟"

انہوں نے عرض کیا ضرور۔

فرمایا: خدا کو زیادہ یاد کرنا۔[3]

---

[1] نور الثقلین جلد نمبر ۴ ص ۲۵۰ بحوالہ خصال۔

[2] سفینۃ البحار، جلد ۱ ص ۴۸۴

[3] سفینۃ البحار، جلد ۱ ص ۴۸۴۔

لیکن ہرگز یہ تصور نہیں کرنا چاہیئے کہ ان تمام فضائل کے ساتھ ذکرِ پروردگار سے مراد صرف زبانی ذکر ہے بلکہ اسلامی روایات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اس سے مراد اس کے علاوہ قلبی اور عملی ذکر بھی ہے، یعنی جس وقت انسان کو کسی حرام کام کے ارتکاب کا سامنا ہو تو خدا کو یاد کر کے اسے ترک کر دے۔

مقصد یہ ہے کہ خدا انسان کی تمام زندگی میں حاضر و ناظر ہو اور نورِ پروردگار اس کی تمام زندگی میں جلوہ فگن ہو۔ ہمیشہ اس کی یاد میں مگن ہو اور اس کے فرمان کو نصب العین قرار دے۔

مجالس ذکر سے مراد وہ مجالس نہیں، جہاں پر جاہلوں کا ایک گروہ اکٹھا ہو جائے اور خود ساختہ ذکر و افکار کا ورد شروع کر دے اور بدعتوں کو پھیلانے میں مصروف رہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بادروا الی ریاض الجنۃ؟"

"جنت کے باغوں کی طرف جلدی بڑھو"[1]

تو صحابہ نے عرض کیا:

"وما ریاض الجنۃ؟"

"جنت کے باغات کیا ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"حلق الذکر"

"مجالس ذکر ہیں"[2]

اس سے مراد وہ مجالس ہیں جن میں علوم اسلامیہ کا احیاء ہو، تربیتی و اخلاقی پروگرام پیش ہوں جن میں انسانوں کی تربیت اور اصلاح کی جائے تاکہ گناہ بیگار گناہوں سے بچ جائیں اور راہ خدا پر چلیں۔[3]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۴۸۶۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۴۸۶۔

[3] "ذکر اللہ" کی اہمیت اور اس کے مفہوم کے سلسلہ میں، تفسیر نمونہ جلد ۱ صفحہ ۱۰۳ (اردو ترجمہ) میں بھی تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔

۲۶۔ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ

۲۷۔ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝

ترجمہ

۲۶۔ خدا نے اہل کتاب میں سے جن کی (مشرکین عرب کی طرف سے) حمایت کی تھی، انہیں ان کے محکم قلعوں سے نیچے کھینچا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا (اور ان کا معاملہ یہاں تک پہنچا کہ) ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے ہو۔

۲۷۔ اور ان کی زمینوں، ان کے گھروں اور ان کے مالوں کو تمہارے اختیار میں دے دیا۔ اور (اسی طرح) اس زمین کو بھی جس میں تم نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

ایک اور عظیم کامیابی:

مدینہ میں یہودیوں کے تین مشہور قبائل رہتے تھے، بنی قریظہ، بنی النضیر اور بنی قینقاع۔

تینوں گروہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ آپ کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیں گے، ان کے لیے جاسوسی نہیں کریں گے اور مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر امن و آشتی کی زندگی گزاریں گے لیکن قبیلہ بنی قینقاع نے ہجرت کے دوسرے سال اور قبیلہ بنی نضیر نے ہجرت کے چوتھے سال مختلف حیلوں بہانوں سے اپنا معاہدہ توڑ ڈالا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ آخر کار ان کی مزاحمت اور مقابلہ کی سکت ختم ہوگئی اور وہ مدینہ سے باہر نکال دیئے گئے۔

بنی قینقاع اذرعات شام کی طرف چلے گئے اور بنی نضیر کے کچھ لوگ تو خیبر کی طرف اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔[1]

اسی بناء پر ہجرت کے پانچویں سال جبکہ جنگ احزاب پیش آئی تو صرف قبیلہ بنی قریظہ مدینہ میں باقی رہ گیا تھا۔ اور جیسا کہ جنگ احزاب کی سترہ آیات کی تفسیر میں ہم نے کہا ہے، وہ بھی اس میدان میں اپنے معاہدہ کو توڑ کر مشرکین عرب کے ساتھ مل گئے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں تلواریں سونت لیں۔

جب جنگ احزاب ختم ہوگئی اور قریش، بنی غطفان اور دیگر قبائل عرب بھی رسوا کن شکست کے بعد مدینہ سے پلٹ گئے تو اسلامی روایات کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر لوٹ آئے اور جنگی لباس اتار کر نہانے دھونے میں مشغول ہو گئے تو اس موقع پر جبرائیل حکم خدا سے آپ پر نازل ہوئے اور کہا کیوں آپ نے ہتھیار اتار دیئے ہیں جبکہ فرشتے ابھی تک آمادہ پیکار ہیں۔ آپ فوراً بنی قریظہ کی طرف جائیں اور ان کا کام تمام کریں۔

واقعاً بنی قریظہ کا حساب چکانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں تھا۔ مسلمان اپنی کامیابی پر خوش و خرم تھے، بنی قریظہ شکست کی شدید وحشت میں گرفتار تھے اور قبائل عرب میں سے ان کے دوست اور حلیف تھکے ماندے اور بہت ہی پست حوصلوں کے ساتھ شکست خوردہ حالت میں اپنے اپنے شہروں اور علاقوں میں جا چکے تھے اور کوئی نہیں تھا جو ان کی حمایت کرے۔

بہر حال منادی نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ندا دی کہ نماز عصر پڑھنے سے پہلے بنی قریظہ

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۷۳ - ۱۳۷۔

کی طرف چل پڑو۔ مسلمان بڑی تیزی کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی بنی قریظہ کے محکم و مضبوط قلعوں کو مسلمانوں نے اپنے محاصرے میں لے لیا۔

پچیس دن تک محاصرہ جاری رہا۔ اس کے بعد جیسا کہ نکات کی بحث میں آئے گا، ان سب نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ ان میں سے کچھ کو قتل کر دیا گیا اور مسلمانوں کی کامیابیوں میں ایک اور فتح کا اضافہ ہوا اور سرزمین مدینہ ہمیشہ کے لیے ان منافق اقوام اور زبردست ہٹ دھرم اعداء کے ناپاک وجود سے پاک ہو گئی۔

زیر بحث آیات اس ماجرا کی طرف مختصر اور بلیغ اشارہ کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیات کامیابی کے حصول کے بعد نازل ہوئیں اور اس ماجرے کا تذکرہ خدا کی ایک عظیم نعمت اور عنایت کے طور پر ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے۔ "خدا نے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کو جنہوں نے مشرکین عرب کی حمایت کی تھی، ان کے محکم و مضبوط قلعوں سے نیچے کھینچا" (وانزل الذین ظاھروھم من اھل الکتاب من صیاصیھم)۔

"صیاصی" جمع ہے "صیصیۃ" کی جو مضبوط قلعوں کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں اس لفظ کا دفاع کے ہر ذریعے پر اطلاق ہونے لگا، جیسے بیل کے سینگ یا مرغے کی ٹانگ والا کانٹا۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہودیوں نے اپنے قلعے مدینہ کے پاس بلند اور اونچی جگہ پر بنا رکھے تھے اور ان کے بلند برجوں سے اپنا دفاع کرتے تھے "انزل" (نیچے لے آیا) کی تعبیر اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے۔ "خدا نے ان کے دلوں میں خوف اور رعب ڈال دیا" (وقذف فی قلوبھم الرعب)۔

آخر کار ان کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ "تم ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے کو اسیر بنا رہے تھے" (فریقا تقتلون وتأسرون فریقا)۔

"اور ان کی زمینیں، گھر اور مال و متاع تمہارے اختیار میں دے دیا" (واورثکم ارضھم ودیارھم واموالھم)۔

یہ چند جملے جنگ بنی قریظہ کے عام نتائج کا خلاصہ ہیں۔ ان خیانت کاروں میں سے کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے، کچھ قید ہو گئے اور بہت زیادہ مال غنیمت جس میں ان کی زمینیں، گھر، مکانات اور مال و متاع شامل تھا، مسلمانوں کو ملا۔

ان غنائم کو "ارث" سے تعبیر کرنا اس بناء پر ہے کہ مسلمانوں نے ان کے حاصل کرنے میں کوئی زیادہ زحمت نہیں اٹھائی بلکہ آسانی کے ساتھ وہ تمام مال ان کے ہاتھ آ گیا جو یہودیوں نے سالہا سال کے عرصے میں ظلم اور بیدادگری اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "اسی طرح وہ زمین بھی تمہارے اختیار میں دے دی، جس پر ہرگز تم نے قدم نہیں رکھا تھا" (وارضا لم تطئوھا)۔

"اور خدا ہر چیز پر قادر و توانا ہے" (وکان اللہ علی کل شیء قدیرا)۔

"ارضا لم تطئوھا" سے مراد کونسی زمین ہے؟ مفسرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے اسے سرزمین "خیبر" کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو بعد میں مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوئی۔

بعض نے سرزمین مکہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

بعض اسے سرزمین "روم و ایران" جانتے ہیں۔

اور بعض سب سرزمینوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو اس دن سے لے کر قیامت تک مسلمانوں کی قلمرو میں قرار پائیں گی۔

لیکن ان احتمالات میں سے کوئی بھی ظاہر آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ آیت فعل ماضی کے قرینہ سے جو اس میں آیا ہے یعنی "اورثکم" اس بات کی شاہد ہے کہ یہ سرزمین اسی جنگ بنی قریظہ کے واقعے میں مسلمانوں کے تصرف میں آئی تھی۔ علاوہ ازیں سرزمین مکہ ایسی نہیں تھی کہ جس میں مسلمانوں نے قدم نہ رکھا ہو جبکہ قرآن کہتا ہے کہ ایسی زمین تمہارے قبضہ میں دی کہ جس میں تم نے قدم نہیں رکھا تھا۔ ظاہرا یہ جملہ ان مخصوص باغات و اراضی کی طرف اشارہ ہے جو بنی قریظہ کے قبضے میں تھے اور کوئی بھی ان میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ یہود اپنے اموال کی حفاظت اور اس کا زبردست خیال رکھتے تھے۔

نیز اگر اس فتح و کامیابی کے ماضی میں ہونے سے صرف نظر کرلیں تو پھر زیادہ مناسب زمین خیبر سے تعلق رکھتی ہے جو بہت ہی مختصر عرصے میں یہودیوں سے لے لی گئی تھی اور مسلمانوں کے قبضے میں آگئی تھی۔ (جنگ خیبر ہجرت کے ساتویں سال وقوع پذیر ہوئی تھی)۔

چند اہم نکات

۱۔ جنگ بنی قریظہ کے علل و اسباب :

قرآن مجید اس چیز پر گواہ ہے کہ اس جنگ کا اصل سبب بنی قریظہ کے یہودیوں کی جنگ احزاب میں مشرکین عرب کی حمایت تھی، کیونکہ خدا فرماتا ہے:

"الذین ظاھروھم"

"وہ لوگ کہ جنہوں نے ان کی حمایت کی"....

اس کے علاوہ اصولی طور پر مدینہ کے یہودی دشمنان اسلام کا پانچواں ستون (FIFTH COLUMN) شمار ہوتے تھے۔ اسلام کے برخلاف پروپیگنڈے میں کوشاں رہتے تھے اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، کہ یہودیوں کے تین قبائل، بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ میں سے آخری گروہ جنگ

احزاب کے موقع پر مدینہ میں باقی رہ گیا تھا اور پہلا اور دوسرا گروہ بالترتیب ہجرت کے دوسرے اور چوتھے سال عہد شکنی کی وجہ سے مدینہ سے نکال دیئے گئے تھے۔

ضروری تھا کہ یہ تیسرا گروہ جنہوں نے سب سے زیادہ کھلی عہد شکنی کی تھی اور دشمنانِ اسلام سے الحاق کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، انہیں ان کے پست اعمال کی وجہ سے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

۲۔ جنگِ بنی قریظہ کے واقعات:

ہم بتا چکے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگِ احزاب ختم ہوتے ہی مامور ہو گئے کہ بنی قریظہ کے یہودیوں کا حساب چکا دیں۔ لکھا ہے کہ مسلمانوں نے بنی قریظہ کے قلعوں کی طرف اس قدر جلدی کی کہ بعض لوگ اپنی نمازِ عصر سے بھی غافل ہو گئے، اور مجبوراً انھیں بعد میں قضا بجا لانی پڑی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے قلعوں کا محاصرہ کا حکم صادر فرمایا۔ پچیس دن تک محاصرہ جاری رہا۔ قرآن کے فرمان کے مطابق خدا نے شدید رعب اور وحشت دشمنوں کے دلوں میں ڈال دی۔

کعب بن اسد کا شمار یہودیوں کے سرداروں میں ہوتا تھا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا، مجھے یقین ہے کہ محمدؐ ہمیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہم جنگ نہ کریں۔ لہٰذا میری تین تجاویز ہیں، ان میں سے کسی ایک کو قبول کر لو۔

پہلی تجویز تو یہ ہے کہ اس شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس پر ایمان لے آؤ اور اس کی پیروی اختیار کر لو۔ کیونکہ تم پر ثابت ہو چکا ہے کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے اور اس کی نشانیاں تمہاری کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو اس صورت میں تمہارے مال، جان اور اولاد اور عورتیں محفوظ ہو جائیں گی۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ہرگز حکمِ تورات سے دست بردار نہیں ہوں گے اور نہ ہی اس کا تبادل اختیار کریں گے۔

اس نے کہا: اگر یہ تجویز قبول نہیں کرتے تو پھر آؤ اور اپنے بچوں اور عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالو تاکہ ان کی طرف سے آسودہ خاطر ہو کر میدانِ جنگ میں کود پڑیں اور پھر دیکھیں کہ خدا کیا چاہتا ہے؟ اگر ہم مارے گئے تو اہل و عیال کی جانب سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی اور اگر کامیاب ہو گئے تو پھر عورتیں بھی بہت بچے بھی بہت۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ان بے چاروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دیں؟ ان کے بعد ہمارے لیے زندگی کی قدر و قیمت کیا رہ جائے گی؟

کعب بن اسد نے کہا: اگر یہ بھی تم نے قبول نہیں کیا تو آج چونکہ ہفتہ کی رات ہے، محمدؐ اور اس کے ساتھی یہ خیال کریں گے کہ ہم آج رات حملہ نہیں کریں گے انھیں اس غفلت میں ڈال کر ان پر حملہ کر دیں شاید کامیابی حاصل ہو جائے۔

وہ کہنے لگے کہ یہ کام بھی ہم نہیں کریں گے۔ کیونکہ ہم کسی بھی صورت میں ہفتہ کا احترام پامال نہیں کریں گے۔

کعب کہنے لگا: پیدائش سے لے کر آج تک تمہارے اندر عقل نہیں آسکی۔

اس کے بعد انھوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات کی کہ ابو لبابہ کو ان کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ ان سے صلاح مشورہ کریں۔

جس وقت ابو لبابہ ان کے پاس آئے تو یہودیوں کی عورتیں اور بچے ان کے سامنے گریہ وزاری کرنے لگے۔ اس

بات کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہم محمدؐ کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟ ابولبابہ نے کہا ہاں اور ساتھ ہی اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا، یعنی تم سب کو قتل کر دیں گے۔

ابولبابہ کہتے ہیں، جیسے ہی میں وہاں سے چلا تو مجھے اپنی خیانت کا شدید احساس ہوا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نہ گیا بلکہ سیدھا مسجد کی طرف چلا اور اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور کہا میں اپنی جگہ سے اس وقت تک حرکت نہیں کروں گا جب تک خدا میری توبہ قبول نہ کرلے۔

آخر کار خدا نے اس کا یہ گناہ اس کی صداقت کی بنا پر بخش دیا۔ اور اسی سلسلے میں یہ آیت " واٰخرون اعترفوا بذنوبھم .....؛ نازل ہوئی۔ (توبہ۔ ۱۰۲)

آخر کار بنی قریظہ کے یہودیوں نے مجبور ہو کر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سعد بن معاذ تمہارے بارے میں جو فیصلہ کر دیں کیا وہ تمہیں قبول ہے؟ وہ راضی ہو گئے۔

سعد بن معاذ نے کہا کہ اب وہ موقع آن پہنچا ہے کہ سعد کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو نظر میں رکھے۔ بغیر حکم خدا بیان کرے۔

سعد نے جس وقت یہودیوں سے دوبارہ یہی اقرار لے لیا تو آنکھیں بند کر لیں اور جس طرف پیغمبر کھڑے ہوئے تھے ادھر رُخ کر کے عرض کیا، آپ بھی میرا فیصلہ قبول کریں گے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ضرور! تو سعد نے کہا: میں کہتا ہوں کہ جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ تھے (بنی قریظہ کے مرد) انھیں قتل کر دینا چاہیئے۔ ان کی عورتیں اور بچے قید اور ان کے اموال تقسیم کر دیئے جائیں۔ البتہ ان میں سے ایک گروہ اسلام قبول کرنے کے بعد قتل ہونے سے بچ گیا۔[1]

۳۔ جنگ بنی قریظہ کے نتائج:

ظالم اور ہٹ دھرم گروہ پر فتح و کامرانی مسلمانوں کے لیے نہایت مفید نتائج کی حامل تھی۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

ا: مدینہ کا داخلی محاذ ختم ہو گیا اور یہودی جاسوسوں سے مسلمان آسودہ خاطر ہو گئے۔

ب: مدینہ کے اندر مشرکین عرب کے اڈے منہدم ہو گئے اور اندرونی شورش سے ان کی امیدیں ختم ہو گئیں۔

ج: جنگ سے حاصل ہونے والے مال غنیمت سے مسلمانوں کی مالی بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔

د: آئندہ کی کامیابیوں کے لیے راہ ہموار ہو گئی، خصوصاً خیبر کی فتح کے لیے۔

ہ: مدینہ کے اندر اور باہر دوستوں اور دشمنوں کی نگاہ میں حکومت اسلامی کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔

۴۔ آیات کی معنی خیز تعبیریں:

زیر نظر آیات میں مختلف تعبیریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ اس جنگ میں قتل ہونے والوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے " فریقا تقتلون

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۲۲۳ اور کامل ابن اثیر ج ۲ صفحہ ۱۹۵ کچھ تلخیص کے ساتھ۔

یعنی "فریقاً" کو "تقتلون" پر مقدم رکھا گیا ہے۔ حالانکہ قیدیوں کے بارے میں "فریقاً" کو اس کے فعل یعنی "تأسرون" سے مؤخر رکھا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس بارے میں کہا ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ قتل ہونے والے زیادہ تر یہودیوں کے سرغنے تھے۔ لیکن قید ہونے والے غیر معروف افراد تھے۔ علاوہ ازیں یہ تقدیم وتاخیر سبب ہوئی کہ قتل اور قید جو دشمن پر کامیابی کے دو اہم عامل تھے ایک دوسرے کے ساتھ آگئے ہیں اور ان کے درمیان تناسب اور تعلق کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

نیز پہلی زیرِ بحث آیت میں، یہودیوں کو ان کے قلعوں سے نیچے لانا "قذف فی قلوبھم الرعب" (خدا نے ان کے دلوں میں رعب ووحشت ڈال دی) سے پہلے ذکر کیا ہے۔ حالانکہ فطری ترتیب اس کے برخلاف ہے یعنی پہلے رعب پیدا ہوتا ہے اور پھر ان محکم قلعوں سے نیچے آنا ہوتا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیے زیادہ اہم اور مسرور کُن تھا اور ان کے اصل مقصد کو تشکیل دیتا تھا، وہ ان کے بہت ہی مستحکم قلعوں کا ٹوٹنا تھا۔

"اور تکم ارضھم ودیارھم" کی تعبیر بھی اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ تم بغیر اس کے کہ اس جنگ کے لیے کچھ بھی زحمت برداشت کرتے، خدا نے ان کی زمینیں، گھر اور مال ودولت سب کچھ تمہارے اختیار میں دے دیا۔

آخری آیت میں خدا کی لازوال قدرت کا ذکر ہے اور "وکان اللہ علی کل شئ قدیرا" اس طرف اشارہ ہے کہ اس نے ایک دن آندھی اور طوفان اور نظر نہ آنے والے لشکر کے ذریعہ احزاب کو شکست دی اور دوسرے دن رعب ووحشت کے لشکر سے ان کے حامیوں یعنی بنی قریظہ کے یہودیوں کا ستیاناس کر دیا۔

۲۸۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ○

۲۹۔ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ○

۳۰۔ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا ○

۳۱۔ وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِیْمًا ○

ترجمہ

۲۸۔ اے پیغمبرؐ! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے، اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں کچھ ہدیہ دے کر اچھے طریقے سے رخصت کر دوں۔

۲۹- اور اگر تم خدا، اس کے پیغمبر اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو خدا نے تم میں سے نیکو کاروں کے لیے عظیم اجر مہیا کر رکھا ہے۔

۳۰- اے نبی کی بیویو! جو کوئی تم سے صریح گناہ اور بُرے کام کی مرتکب ہو گی، اس کا عذاب دُگنا ہو گا اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔

۳۱- اور تم میں سے جو کوئی خدا اور اس کے رسول کے لیے خضوع و خشوع اختیار کرے گی اور عمل صالح بجا لائے گی، ہم اس کے اجر و جزاء کو دُگنا کریں گے اور اس کے لیے ہم نے باعظمت روزی فراہم کر رکھی ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کی کئی ایک شان نزول ذکر کی ہیں کہ جو تتبع کے لحاظ سے آپس میں قطعاً مختلف نہیں ہیں۔

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چند جنگوں کے بعد بڑی مقداریں غنیمتیں مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئیں تو ازواج پیغمبر نے آپ سے نفقہ میں اضافہ اور زندگی کے گوناگوں لوازم کے لیے مختلف تقاضے شروع کر دیئے۔ بعض تفاسیر کے مطابق حضرت اُمِ سلمہؓ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدمت گزاری کے لیے کنیز کا تقاضا کیا، میمونہؓ نے کوئی خاص لباس مانگا، زینب بنت جحش نے ایک خاص مینی کپڑے کی فرمائش کی، حفصہؓ نے مصری جامہ طلب کیا، جویریہؓ نے ایک عمدہ لباس چاہا، سودہؓ نے خیبری گھیم کی درخواست کی۔ خلاصہ یہ کہ ہر ایک نے الگ الگ فرمائش کی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ اس قسم کی فرمائشوں کے سامنے جھک جانا جو عام طور پر ختم ہونے والی نہیں ہوتیں، "ہیئت نبوت" کو کیسے انجام سے دوچار کر دیں گی لہٰذا آپ نے ان خواہشات کو پورا کرنے سے انکار کر دیا اور پورا ایک مہینہ ان سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔ یہاں تک کہ مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور دو ٹوک لیکن رحمت و رأفت کے لہجہ کے ساتھ انھیں خبردار کیا کہ اگر زیب و زینت سے آراستہ، دنیاوی زندگی چاہتی ہو تو تم پیغمبرؐ سے الگ ہو سکتی ہو اور جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو اور اگر خدا، رسول اور روزِ جزا سے وابستہ رہنا چاہتی ہو تو پیغمبرؐ کے گھر کی سادہ لیکن پُر افتخار زندگی پر قانع ہو جاؤ اور پروردگار کے عظیم اجر و ثواب سے حصہ لیتی رہو۔

اس طرح سے ازواج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توقع کا جو دامن پھیلایا ہوا تھا اس کے ضمن میں محکم اور دو ٹوک جواب دے دیا اور انھیں پیغمبرؐ کے گھر میں ٹھہرے رہنے اور الگ ہو جانے کے درمیان اختیار جیسی عنایت فرمادیا۔

تفسیر

سعادت ابدی یا دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ،

آپ بھولے نہیں ہوں گے کہ اس سورہ کی شروع کی آیات میں خداوند عالم نے عزت و افتخار کا تاج پیغمبرؐ کی بیویوں کے سر پر رکھا ہے اور ان کا "ام المومنین" کے عنوان سے تعارف کروایا ہے۔ واضح رہے کہ ہمیشہ حساس اور افتخار آفریں مراتب کے ساتھ بھاری ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ ازواج رسولؐ کیونکر امہات المومنین ہو سکتی ہیں جب کہ ان کی قلب و نظر دنیا کی زیب و زینت پر فریفتہ ہوں اور جب وہ یہ خیال کریں کہ اگر مسلمانوں کو مال غنیمت حاصل ہو تو بادشاہوں کی بیویوں کی طرح اس کا بہترین حصہ انہیں مل جائے اور شہداء کی جاں نثاری اور مقدس خون کے صدقہ میں جو چیز ہاتھ آئی ہے وہ ان کے حوالہ کی جائے۔ جبکہ کئی لوگ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہے ہوں؟

اس سے قطع نظر گذشتہ آیات کے مطابق نہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ ہیں بلکہ ان کے گھر والوں کو بھی دوسرے خاندانوں کے لیے اسوہ اور ان کی بیویوں کو دامن قیامت تک کی باایمان عورتوں کے لیے مقتدا رہنا چاہیئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی بادشاہ نہیں ہیں کہ ان کا شان و شوکت والا حرم سرا ہو اور ان کی بیویاں قیمتی جواہرات اور زیب و زینت کی دوسری چیزوں سے لدی پھندی ہوں۔

شاید ابھی تک مکہ کے کچھ مسلمان جو مہاجر ہو کر مکہ سے مدینہ آئے تھے صفہ (وہ مخصوص ٹھکانا کہ مسجد نبوی کے ساتھ تھا) میں راتیں بسر کرتے تھے۔ اس شہر میں ان کا کوئی خانہ و کاشانہ نہیں تھا۔ ان حالات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ آپ کی بیویاں آپؐ سے اس قسم کی توقعات رکھیں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بیویوں نے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سخت کلامی کی حد کر دی اور یہاں تک کہہ دیا:

"لعلك تظن ان طلقتنا لا نجد زوجا من قومنا غيرك"

"شاید آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ آپ ہمیں طلاق دے دیں تو ہمیں اپنی قوم قبیلے میں کوئی شوہر نہیں ملے گا"[1]

---

[1] کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۳۸۔

اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے حکم سے مامور ہوئے کہ وہ اس نظریہ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور ان کے سامنے ہمیشہ کے لیے پوزیشن واضح کردیں۔

بہرحال زیر بحث آیات میں سے پہلی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے:

"اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیاوی زندگی اور اس کی زینت کی طلب گار ہو تو آؤ میں کسی لڑائی جھگڑے کے بغیر کچھ ہدیہ دے کر تمھیں اچھے طریقے سے جدا کیے دیتا ہوں" یا ایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیاۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا جمیلا۔

"امتعکن" "متعہ" کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں کہہ چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ ہدیہ ہے جو عورت کے شایان شان ہوتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ مقررشدہ مہر پر مناسب ہدیہ دے دیں، اس قدر کہ وہ راضی اور خوش ہو جائیں اور ان کی علیحدگی دوستانہ ماحول میں ہو۔

"سراح" اصل میں "سرح" (بروزن شرح) ایسی نباتات کے معنی میں ہے جس کے پھل اور پتے ہوں، اور "سرحت الابل" کا معنی ہے "میں نے اونٹ کو چھوڑ دیا تاکہ وہ نباتات کے پتوں کو چرتا پھرے"۔ بعدازاں اس لفظ کا زیادہ وسیع معنی ہوگیا، یعنی ہر چیز اور ہر شخص کو ہر قسم کی رہائی دینا اور چھوڑ دینا۔ کبھی یہ لفظ طلاق دینے کیلئے کنایہ کے طور پر بھی آتا ہے۔ "تسریح الشعر" بالوں کو کنگھی کرنے کے لیے بولا جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی رہا کرنے اور چھوڑنے کا معنی پوشیدہ ہے۔

بہرحال زیر بحث آیت میں "سراح جمیل" سے مراد عورتوں کو اس انداز سے طلاق دینا ہے جس میں نیکی اور بھلائی ہو اور کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہو۔

اس ضمن میں اسلامی فقہا اور مفسرین نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے کہ آیت میں اس سے مراد کیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی ازواج کو باقی رہنے اور جدا ہو جانے کے بارے میں جو اختیار دیا تھا، اگر وہ جدائی اختیار کرلیتیں تو کیا خود یہی امر طلاق شمار ہوتا اور صیغۂ طلاق کے اجرا کی ضرورت نہ ہوتی؟ یا مراد یہ تھی کہ وہ ان دو راستوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرلیں۔ اگر جدائی کو انتخاب کرتیں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صیغۂ طلاق جاری کرتے ورنہ طلاق نہ ہوتی۔

اگر دیکھا جائے تو آیت ان دونوں امور میں سے کسی پر بھی دلالت نہیں کرتی اور بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت ازواج پیغمبرؐ کو گھر میں رہنے یا گھر چھوڑ کر چلے جانے کے بارے میں اختیار دے رہی ہے، اور یہ حکم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص ہے کیونکہ باقی لوگوں پر یہ حکم لاگو نہیں ہوتا۔ لیکن ان کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔

کیونکہ اس آیت اور آیاتِ طلاق کو جب باہم ملایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی جدائی طلاق کے ذریعہ ہوگی۔

بہرحال یہ مسئلہ شیعہ اور اہل سنت فقہاء کے درمیان اختلافی ہے اگرچہ دوسرا قول یعنی طلاق کے ذریعے جدا

ہوتا آیات کے ظاہری مفہوم کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں "سرحکن" (میں تمھیں آزاد کردوں) کی تعبیر ظاہر کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں جدا کرنے پر اقدام فرماتے، خصوصاً جب کہ یہ "تسریح" قرآن مجید میں ایک اور جگہ بھی طلاق کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (بقرہ ۲۲۹) [1]

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے۔ لیکن اگر تم خدا اور اس کے پیغمبر کو چاہتی ہو اور آخرت کے گھر کو، نیز مادی لحاظ سے سادہ زندگی (جس میں محرومیتیں بھی ہیں) پر قانع ہو تو خدا نے تم میں سے نیک خواتین کے لیے عظیم جزاء اور اجر تیار کر رکھا ہے" (وان کنتن ترردن اللہ ورسولہ والدار الاخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجرا عظیما)۔

درحقیقت ان چند جملوں میں ایمان کی تمام بنیادیں اور مومن کا لائحہ عمل بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو خدا، پیغمبر اور روز قیامت پر ایمان و اعتقاد کا ذکر ہے اور دوسری طرف عملی طور پر نیکوکاروں اور محسنین و محسنات کی صف میں قرار پانا، تو اس بنا پر صرف خدا، آخرت کے گھر اور پیغمبرؐ کے ساتھ عشق اور لگاؤ کا اظہار کافی نہیں ہے، عملی زندگی بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونی چاہیئے۔

اس طرح خدا نے ازواج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داریوں کو جنہیں صاحب ایمان عورتوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہونا چاہیئے، ہمیشہ کے لیے واضح کر دیا ہے، یعنی زہد و پارسائی کا حامل ہونا اور دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ سے بے اعتنائی اور ایمان، عمل صالح اور روحانیت کی طرف خاص توجہ۔ اگر وہ ان صفات کی حامل ہیں تو پھر رہ جائیں اور رسول خدا کی زوجیت کے عظیم اعزاز کی حامل رہیں۔ ورنہ اپنی راہ لیں اور ان سے الگ ہو جائیں۔

اگرچہ اس گفتگو میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مخاطب ہیں، لیکن اپنے مضمون اور نتیجہ کے لحاظ سے سب پر محیط ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جو مخلوق کی رہبری اور لوگوں کی پیشوائی کے مقام بلند پر فائز ہیں۔ ایسے افراد ہمیشہ دوراہے پر ہوتے ہیں کہ یا تو خوشحال زندگی تک پہنچنے کے لیے اپنی ظاہری حیثیت سے فائدہ اٹھائیں یا خدا کی رضا کے حصول اور مخلوق کی ہدایت کے لیے اپنے آپ کو ہر قسم کی محرومیوں کے لیے پیش کر دیں۔

پھر بعد والی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کی سنگین ذمہ داریوں کو قرآن واضح عبارت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی آشکارا گناہ اور فحش و غلط کام انجام دے گی، اس کا عذاب دگنا ہوگا اور یہ خدا کے لیے آسان ہے" (یا نساء النبی من یات منکن بفاحشۃ مبینۃ یضاعف لھا العذاب ضعفین وکان ذالک علی اللہ یسیرا)۔

تم وحی کے گھر اور مرکز نبوت میں زندگی بسر کر رہی ہو، اسلامی مسائل کے سلسلہ میں تمھاری معلومات پیغمبر خدا سے ہمیشہ نزدیک رہنے کی بنا پر عام لوگوں سے زیادہ ہیں، علاوہ ازیں تمہاری طرف دوسری عورتوں کی توجہ ہوتی ہے اور

---

[1] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے فقہی کتب خصوصاً جواہر الکلام جلد ۲۹ صفحہ ۱۲۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

تم ان کے نزدیک نمونۂ عمل ہوتی ہو۔ اس بنا پر خدا کی بارگاہ میں تمہارا گناہ بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ہوگا کیونکہ ثواب اور عذاب معرفت اور معلومات کے مطابق ملتے ہیں، اسی طرح ماحول پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ تمہیں آگاہی بھی زیادہ ہے اور معاشرے پر اثر انداز ہونے کے لحاظ سے بھی تمہاری حیثیت بہت حساس ہے۔

ان سب چیزوں سے قطع نظر تمہارے غلط اعمال ایک طرف تو پیغمبر کو آزردہ خاطر کریں گے اور دوسری طرف آنحضرت کی حیثیت کو مجروح کریں گے اور یہ بجائے خود ایک گناہ ہے جو دوسرے عذاب کا مستوجب ہوتا ہے۔

"فاحشۃ مبینۃ" سے مراد کھلے قسم کے گناہ ہیں اور واضح ہے کہ ان گناہوں کے مفاسد جو اہم شخصیت سے سرزد ہوتے ہیں، اس وقت زیادہ ہوتے ہیں جب وہ آشکارا اور ظاہر بظاہر ہوں۔

"ضعف ومضاعف" کے بارے میں نکات کی بحث میں گفتگو ہوگی۔

باقی رہا یہ فرمان کہ "یہ کام خدا پر آسان ہے" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی بھی یہ گمان نہ کرنا کہ تمہیں سزا دینا خدا کے لیے کوئی مشکل کام ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تمہارا رابطہ اس سے مانع ہوگا، جس طرح دنیا کا دستور ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور قریب کے رشتہ داروں کے گناہوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں یا انہیں بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ تو یہاں ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ یہ دوٹوک فیصلہ ہے جو تم پر بھی نافذ ہے۔

البتہ اس کے برعکس کے بارے میں حکم ہوتا ہے: "اور جو کوئی تم میں سے خدا اور پیغمبر کے سامنے خضوع اور اطاعت کرے اور عمل صالح بجا لائے تو ہم اس کو دوگنا اجر دیں گے اور اس کے لیے ہم نے قیمتی رزق فراہم کر رکھا ہے": (ومن یقنت منکن للہ ورسولہ وتعمل صالحا نؤتہا اجرہا مرتین و اعتدنا لہا رزقا کریما)۔

"یقنت" "قنوت" کے مادہ سے ہے جس میں خضوع وادب سے ملی ہوئی اطاعت کا معنی پایا جاتا ہے۔[1] اور قرآن یہ لفظ استعمال کر کے انھیں یہ جتانا چاہتا ہے کہ وہ فرمان خدا ورسول کی مطیع بھی ہوں اور شرط ادب بھی مکمل طور پر ملحوظ رکھیں۔

یہاں پھر ہمیں یہ نکتہ بھی ملتا ہے کہ صرف ایمان اور اطاعت کا دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے بلکہ "وتعمل صالحا" اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے آثار عمل میں بھی ظاہر ہوں۔

"رزق کریم" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو تمام روحانی اور مادی نعمات الٰہی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس کا مفہوم "جنت" اس لیے کیا گیا ہے چونکہ بہشت ان تمام نعمات کا مرکز ہے۔

گناہ اور ثواب دوگنا کیوں؟

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اوپر والی آیات اگرچہ پیغمبر کی ازواج کے بارے میں کہتی ہیں کہ اگر وہ خدا کی اطاعت کریں

---

[1] مفردات راغب، مادہ قنوت۔

توان کا اجر کئی گنا ہے اور اگر کسی آشکارا گناہ کا ارتکاب کریں تو ان کی سزا کئی گناہ ملے گی۔ لیکن چونکہ اصل معیار تو مقام و مرتبہ اور اجتماعی حیثیت کا حامل ہوتا ہے لہٰذا یہ حکم ان افراد کے بارے میں بھی صادق آتا ہے جو معاشرے میں اچھی حیثیت اور مقام کے حامل ہوتے ہیں۔

اس قسم کے افراد کا تعلق صرف اپنی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ ان کا وجود دو جہات کا حامل ہوتا ہے۔ ایک جہت تو خود انھیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اور دوسری جہت معاشرے سے تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا ان کی زندگی کا طرز عمل ہو سکتا ہے کہ کسی گروہ کو ہدایت یا کسی کو گمراہ کر دے۔ اسی بناء پر ان کے اعمال دوہرا اثر رکھتے ہیں یعنی ایک تو انفرادی اثر اور دوسرا اجتماعی۔ اسی لیے ان میں سے ہر عمل جداگانہ اجر یا سزا کا حامل ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"یغفر للجاهل سبعون ذنبًا قبل ان یغفر للعالم ذنب واحد"

"جاہل کے ستر گناہ بخشے جائیں گے اس سے پہلے کہ عالم کا ایک گناہ بخشا جائے۔" [1]

اس سے قطع نظر ہمیشہ علمی سطح اور سزا و جزا کے درمیان قریبی رابطہ رہا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے:

"ان الثواب علی قدر العقل"

"اجر انسان کی عقل و آگاہی سے ملتا ہے۔" [2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"انما یداقق الله العباد فی الحساب یوم القیامة علی قدر ما آتاهم من العقول فی الدنیا"

"خداوند عالم قیامت کے دن بندوں کا حساب دنیا میں انہیں دی گئی عقل کے مطابق لے گا۔" [3]

یہاں تک کہ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"عالم کی توبہ بعض مراحل میں قبول نہیں ہوگی (پھر اس آیہ شریفہ سے آپ نے استناد فرمایا) انما التوبة علی الله للذین یعملون السوء بجهالة (توبہ تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے اور نادانی سے برا کام انجام دیتے ہیں)۔ (نساء ۱۷) [4]۔

یہاں پر واضح ہو جاتا ہے کہ ممکن ہے "مضاعفہ" یا "مرتین" کا مفہوم یہاں ثواب و عقاب کی

---

[1] اصول کافی جلد اوّل ص ۳۷ (باب لزوم الحجة علی العالم)۔

[2] اصول کافی جلد اوّل ص ۹ کتاب العقل والجہل۔

[3] اصول کافی جلد اوّل ص ۱ کتاب العقل والجہل

[4] اصول کافی جلد اوّل ص ۳۵ (باب لزوم الحجة علی العالم)۔

افزائش ہے۔ کبھی دوگنا اور کبھی اس سے زیادہ، بالکل ان اعداد کی طرح جن میں "کثرت" کا مفہوم ہوتا ہے۔ خصوصاً راغب اپنی کتاب مفردات میں "ضعف" کے معنی کے بارے میں کہتے ہیں:

"ضاعفته ضممت اليه مثله فصاعدا"

"میں نے اسے مضاعف کیا یعنی اس کی مانند یا بیشتر اور کئی گنا کا اس میں اضافہ کیا۔"

(غور کیجئے گا)

مذکورہ روایت جس میں ہم نے عالم و جاہل کے گناہ کے فرق کے بارے میں ستر تک کے برابر کا ذکر کیا ہے، اس دعا پر ایک اور گواہ ہے۔

اصولی طور پر افراد کی اجتماعی حیثیت اور ان کا معاشرتی مرتبہ نیز معاشرے میں ان کا اسوہ اور نمونہ ان کی سزا اور جزا میں کمی بیشی کا سبب بن جاتا ہے۔

اس بحث کو ہم امام سجاد علی بن الحسین علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ کسی نے امامؑ سے عرض کیا:

"انکم اهل بيت مغفور لكم"

"آپ کا وہ خاندان ہے جسے خدا نے بخش دیا ہے۔"

امامؑ غصے میں آکر فرمانے لگے:

"نحن احرى ان يجرى فينا ما اجرى الله فى ازواج النبى (ص)، من ان نكون كما تقول، انا نرى لمحسننا ضعفين من الاجر ولمسيئنا ضعفين من العذاب، ثم قرء الايتين"

"خداوند عالم نے جو حکم ازواج پیغمبرؐ کے بارے میں جاری کیا ہے، ہم اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ ہمارے بارے میں بھی جاری ہو نہ اس طرح جیسے تو کہتا ہے۔ ہم اپنے نیکوکاروں کے لیے دوہرے اجر کے اور بدکاروں کے لیے دوگنا عذاب اور سزا کے قائل ہیں۔ پھر آپ نے شاہد کے طور پر زیر بحث دو آیات کی تلاوت فرمائی۔"[1]

---

[1] مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۳۵۴ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۲- یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ

۳۳- وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا ۚ

۳۴- وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَالْحِکْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا ۚ

ترجمہ

۳۲- اے نبی کی بیویو! اگر تقوے اپناؤ تو تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، لہذا ہوس انگیز قسم کی گفتگو نہ کیا کرو، کہیں کوئی بیمار دل شخص تمھارے بارے میں لالچ میں نہ پڑجائے اور صاف سیدھی بات کیا کرو

۳۳۔ اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو، اور پہلی جاہلیت کی طرح لوگوں کے سامنے نہ نکلا کرو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو خدا تو یہی چاہتا ہے کہ نجاست اور گناہ تم اہل بیت سے دُور رکھے اور تمھیں ہر طرح سے پاک و پاکیزہ رکھے۔

۳۴۔ اور جو کچھ تمھارے گھروں میں آیاتِ خدا اور حکمت و دانش کی تلاوت کی جاتی ہے، اسے یاد رکھو اور خدا لطیف و خبیر ہے۔

تفسیر

ازواج نبیؐ کو کیسا ہونا چاہیئے:

گذشتہ آیات میں ازواج پیغمبرؐ کی حیثیت اور عظیم ذمہ داری کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر آیات میں بھی یہ موضوع اسی طرح جاری و ساری ہے۔ ان چند آیات میں ازواج نبی کو سات اہم احکام دیئے گئے ہیں۔

پہلے ایک مختصر سی تمہید میں فرمایا گیا ہے۔ "اے ازواج پیغمبرؐ! اگر تقویٰ اپناؤ تو تم کسی عام عورت کی طرح نہیں ہو" (یانساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن)۔

ایک طرف رسول اللہ سے تمھاری نسبت ہے۔ دوسری طرف تم مرکز وحی میں موجود ہو، آیات قرآنی سنتی ہو اور تعلیمات اسلامی کو جانتی ہو۔ اس خاص حیثیت کا حامل ہونے کے باعث تم تقوے اور گناہ دونوں میں تمام عورتوں کے لیے نمونہ اور مثال بن سکتی ہو۔

اس بناء پر تم اپنی حیثیت کو پہچانو اور اپنی بھاری ذمہ داری کو طاق نسیاں کے سپرد نہ کرو اور جان لو اگر تم نے تقویٰ اختیار کیا تو بارگاہِ خداوندی میں تمھارا بہت ہی مقام و مرتبہ ہوگا۔

اس مقدمے میں قرآن مخاطب کو اپنی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے اور انھیں ان کے مقام یاد دلاتا ہے۔ اس کے بعد پہلا حکم عفت و پاکدامنی کے سلسلے میں صادر کرتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ایک باریک نکتے کی

طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ اس بارے میں دوسرے مسائل خود بخود واضح اور روشن ہو جائیں۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے، اس بنا پر ہوس انگیز انداز سے بات نہ کیا کرو کہ جس سے دل کے بیمار تمہارے بارے میں طمع کرنے لگیں" (فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض)۔

بلکہ بات کرتے وقت دو ٹوک، سپاٹ اور معمول کے مطابق گفتگو کرو۔ پست عورتوں کی سی گفتگو نہ کرو جو کوشش کرتی ہیں کہ ہیجان انگیز اور تحریک آمیز جس کے باعث شہوت پرست افراد گناہ کی سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔

"الذی فی قلبہ مرض" (وہ شخص کہ جس کے دل میں بیماری ہے) کی تعبیر یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ جنسی جذبات کا اعتدال اور مشروع حد میں ہونا عین سلامتی ہے اور جب اس حد سے گزر جائے، تو پھر ایک قسم کی بیماری ہے۔ یہاں تک کہ وہ کبھی کبھار جنون کی حد کو پہنچ جاتی ہے جسے "جنسی جنون" سے تعبیر کرتے ہیں۔ دورِ حاضر میں ماہرین نے ان نفسیاتی بیماریوں کی اقسام کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، جو اس طاقت کے حدِ اعتدال سے تجاوز اور مختلف جنسی آلودگیوں اور گندے ماحول میں پڑ جانے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔

آیت کے آخر میں دوسرے حکم کی یوں تشریح کی گئی ہے "تمہیں ایسی شائستہ گفتگو کرنا چاہیئے جو خدا اور پیغمبر اکرمؐ دونوں کی رضا کے مطابق اور حق و عدالت سے مزین ہو" (وقلن قولاً معروفاً)۔

حقیقت میں "لا تخضعن بالقول" کا جملہ گفتگو کے انداز اور "قلن قولاً معروفاً" گفتگو کے مطالب کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ "قول معروف" (اچھی اور شائستہ گفتگو) کا وسیع مفہوم ہے جو مذکورہ معنی کے علاوہ ہر قسم کی باطل، بے ہودہ، گناہ سے آلودہ اور حق کی مخالفت گفتار کی نفی ہے۔

یاد رہے کہ آخری جملہ ہو سکتا ہے کہ پہلے جملہ کی وضاحت ہو۔ مبادہ کوئی یہ خیال کرے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کا طرزِ تکلم غیر مردوں سے سخت یا خلافِ ادب ہونا چاہیئے، نہیں بلکہ ان کی گفتگو شائستہ، مؤدبانہ لیکن کسی تحریک آمیز پہلو کے بغیر ہونا چاہیئے۔

تیسرا حکم عفت و پاک دامنی کے سلسلہ میں ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ "تم اپنے گھروں میں رہو اور پہلی جاہلیت کی طرح لوگوں کے سامنے نہ آؤ" اور اپنے بدن اور اس کی زینت کو دوسروں کے سامنے ظاہر نہ کرو (وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولی)۔

"قرن" "وقار" کے مادہ سے بوجھ کے معنی میں ہے اور گھروں میں ٹھہرے رہنے کے لیے کنایہ ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ لفظ "قرار" کے مادہ سے ہے، جو نتیجے کے لحاظ سے پہلے معنی سے چنداں مختلف نہیں ہے[1]۔

---

[1] البتہ اگر اس صورت میں جب کہ قرار کے مادہ سے ہو تو اس کا اصل صیغہ اقررن ہوگا کہ جس کی پہلی "را" تخفیف کے عنوان سے حذف ہوئی ہے اور اس کا فتح قاف کی طرف منتقل ہوا ہے جس کی وجہ سے ہمزہ وصل کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ "قرن" ہو گیا ہے (غور کیجئے گا)

"تبرج" کا معنی ہے لوگوں کے سامنے ظاہر ہونا اور "برج" کے مادہ سے لیا گیا ہے اور "برج" اس چیز کو کہتے ہیں جو سب کی نگاہوں کے سامنے ہو۔

باقی رہا یہ کہ جاہلیت اولیٰ سے کیا مراد ہے؟ تو ظاہراً اس سے مراد جاہلیت ہے، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے پہلے تھی اور جیسا کہ تواریخ میں آیا ہے کہ اس زمانے میں عورتیں ٹھیک طرح پردہ نہیں کرتی تھیں بلکہ اپنے دوپٹے کا ایک حصہ اپنی پشت پر اس طرح ڈال لیتی تھیں جس سے ان کا گلا، سینہ اور گردن کا ایک حصہ اور گوشوارے دکھائی دیتے تھے۔ قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کو اس قسم کے اعمال سے روکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک عام حکم ہے اور آیات کا ازواج پیغمبر کو مخاطب کرنا زیادہ تاکید کے لیے ہے بالکل اس طرح جیسے ہم کسی دانشور سے کہیں کہ آپ تو ایک عالم ہیں، جھوٹ نہ بولا کریں، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسروں کے لیے جھوٹ بولنے کی اجازت ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک عالم کو زیادہ سختی کے ساتھ اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

بہرحال یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ کوئی دوسری جاہلیت عربوں کی جاہلیت کی طرح درپیش ہے کہ جس کے آثار ہم قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اپنی متمدن مادی دنیا میں بھی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ مفسرین کے سامنے چونکہ ایسی چیز نہ تھی لہٰذا وہ اس لفظ کی تفسیر میں بھی مشقت میں پڑے رہے اور وہ آدمؑ اور نوحؑ کے درمیانی فاصلے کو "جاہلیت اولیٰ" سے تعبیر کرتے تھے۔ یا پھر داؤدؑ اور سلیمانؑ کے عصر کے درمیانی فاصلے کو جاہلیت کہتے تھے جس میں عورتیں ایسا نفیس لباس پہن کر باہر نکلتی تھیں، جس سے بدن جھلکتا تھا، اس طرح سے وہ اسلام سے پہلے والی جاہلیت کو "جاہلیت ثانیہ" سمجھتے تھے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ان تمام باتوں کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ "جاہلیت اولیٰ" وہی اسلام سے پہلے والی جاہلیت ہے کہ جس کی طرف قرآن میں کئی جگہوں پر ارشاد بھی ہوا ہے۔ (آل عمران ۱۴۳، مائدہ ۵۰ اور فتح ۲۶) اور "جاہلیت ثانیہ" وہ جاہلیت ہے جو بعد میں پیدا ہوگی (جیسا کہ ہمارا زمانہ ہے)۔ اس موضوع کی مزید تفصیل نکات کی بحث میں پیش کریں گے۔

آخر میں چوتھے، پانچویں اور چھٹے حکم کو بیان فرمایا گیا ہے: "تم (پیغمبر کی بیویو!) نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" (واقمن الصلوٰۃ وآتین الزکوٰۃ واطعن اللہ ورسولہ)۔

اگر عبادات میں سے نماز اور زکوٰۃ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز خالق کے ساتھ اہم ترین رابطہ ہے اور زکوٰۃ بھی باوجود اس کے کہ ایک عظیم عبادت ہے، مخلوق خدا کے ساتھ ایک اور اٹوٹ رابطہ بھی ہے۔

باقی رہا "اطعن اللہ ورسولہ" تو یہ ایک کلی حکم ہے اور خدا کی طرف سے مقرر کردہ تمام امور پر حاوی ہے۔

یہ تین احکام بھی واضح کرتے ہیں کہ زیر بحث احکام ازواج نبیؐ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں بلکہ سب کے لیے ہیں۔ اگرچہ ازواج نبیؐ کے بارے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "اے اہل بیت! خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ نجاست اور گناہ کو تم سے دور رکھے اور تمہیں ہر طرح سے پاک و پاکیزہ رکھے" (انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا)۔

"انما" کی تعبیر جو عام طور پر "حصر" کے لیے ہے اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نعمت خاندان پیغمبر اکرم علیہم السلام سے مخصوص ہے۔

لفظ "یرید" پروردگار کے ارادۂ تکوینی کی طرف اشارہ ہے ورنہ ارادۂ تشریعی اہل بیت پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوگا، بلکہ سب لوگ بغیر کسی استثناء کے حکم شریعت کے تحت اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ ہر قسم کے گناہوں اور نجاستوں سے پاک رہیں۔

ہو سکتا ہے، کہا جائے کہ ارادۂ تکوینی تو ایک قسم کے جبر کا موجب ہے، لیکن جب ان بخشوں کی طرف توجہ کی جائے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے معصوم ہونے کے بارے میں کی جاتی ہیں تو اس بات کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور یہاں پر بطور خلاصہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ معصومین ایک طرف تو اپنے اعمال کی وجہ سے ایک قسم کی اکتسابی لیاقت کے حامل ہیں اور دوسری طرف اپنے پروردگار کی طرف سے ذاتی اور وہبی لیاقت رکھتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے لیے نمونہ و اُسوہ بن سکیں۔

دوسرے لفظوں میں معصومین کی ہمت تائیداتِ الٰہی اور اپنے پاک اعمال کی وجہ سے ایسی ارفع و اعلیٰ ہے کہ گناہ پر قدرت و اختیار رکھنے کے باوجود گناہ کی طرف نہیں جاتے۔ یوں سمجھیے کہ کوئی عقلمند قطعاً تیار نہیں ہوگا کہ آگ کا انگارہ اُٹھا کر اپنے مُنہ میں رکھ لے، باوجودیکہ اس میں نہ کوئی جبر ہے نہ اکراہ، بلکہ یہ ایسی حالت ہے جو کسی قسم کے جبر و اکراہ کے بغیر خود انسان کے وجود کے اندر سے اس کے علم و آگاہی اور فطری و طبعی مبادیات کی وجہ سے ابھرتی ہے۔

لفظ "رجس" ناپاک شئی کے معنی میں ہے خواہ وہ انسان کے مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے ناپاک ہو یا عقلی حکم کی وجہ سے یا شریعت کی رُو سے یا ان سب وجوہ کے اعتبار سے۔[1]

یہ جو بعض نے "رجس" سے گناہ، شرک، بخل و حسد یا باطل اعتقاد وغیرہ مراد لیا ہے تو درحقیقت یہ اس کے مصادیق کا بیان ہے ورنہ اس لفظ کا مفہوم عام اور وسیع ہے اور ہر قسم کی نجاست اس کے معنی میں شامل ہے، کیونکہ الف لام یہاں جنس پر دلالت کرتا ہے۔

"تطھیر" کا معنی ہے پاک کرنا اور حقیقت میں نجاستوں اور ناپاکیوں کو دُور کرنے کے بارے میں تاکید ہے۔ نیز اس کا مفعول مطلق کی شکل میں ہونا یہاں اس معنی کی ایک اور تاکید شمار ہوتا ہے

باقی رہی "اہل بیت" کی تعبیر، تو تمام علماء اسلام اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ جناب پیغمبرؐ کے اہل بیت کی طرف اشارہ ہے یہی بات خود آیت کے ظاہر سے بھی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ "بیت" اگرچہ یہاں مطلق صورت میں ذکر ہوا ہے لیکن قبل و بعد کی آیات کے قرینے سے اس سے مراد پیغمبر اکرمؐ کا بیت اور گھر ہے۔[2]

---

[1] راغب نے کتاب مفردات میں رجس کے مادہ میں مذکورہ بالا معنی اور اس کے چار قسم کے مصداق کو بیان کیا ہے۔

[2] بعض نے "بیت" کو یہاں "بیت اللہ الحرام" اور کعبہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور اس کے اہل متقی افراد کو شمار کیا ہے۔ یہ بات آیات کے سیاق سے بہت ہی غیر مناسب ہے، کیونکہ یہاں گفتگو پیغمبر اکرمؐ اور ان کے گھر کے بارے میں ہے نہ کہ بیت اللہ الحرام کے متعلق۔ اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کے لیے کوئی بھی قرینہ موجود نہیں ہے۔

باقی رہا یہ کہ "اہل بیت پیغمبرؐ" سے مراد کون لوگ ہیں تو اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اسے ازواج پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں اور قبل و بعد کی آیات کو جو ازواج کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس کا قرینہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ایک مطلب کی طرف توجہ کرنے سے اس نظریہ کی نفی ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ وہ ضمیریں جو قبل و بعد کی آیات میں آئی ہیں سب کی سب جمع مؤنث کی شکل میں ہیں جب کہ آیت کے اس حصے "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا" کی ضمیریں سب جمع مذکر کی شکل میں ہیں اور یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہاں کوئی دوسرا معنی مراد ہے۔

اس لیے بعض دوسرے مفسرین نے اس سے وسیع تر نظریہ اختیار کرتے ہوئے آیت میں پیغمبر اکرمؐ کے سارے خاندان کو شامل سمجھا ہے چاہے وہ مرد ہوں یا آپ کی بیویاں۔

دوسری طرف بہت زیادہ روایات جو اہل سنت اور شیعہ منابع و مصادر میں وارد ہوئی ہیں ایک اور معنی دیتی ہیں اور پیغمبر اکرمؐ کے سارے خاندان کے شمول کی بھی نفی کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس آیت میں مخاطب صرف پانچ افراد ہیں، یعنی حضرت پیغمبر اکرمؐ، حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

تو اس قدر وافر مقدار میں نصوص کے ہوتے ہوئے جو آیت کے مفہوم کی تفسیر کے لیے روشن و واضح قرینہ ہیں اس آیت کے لیے قابل قبول تفسیر وہی تیسرا معنی ہے۔ یعنی آیت "خمسہ طیبہ" سے مختص ہے۔

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت پیغمبرؐ کی ازواج کی ذمہ داریوں کے ذکر کے بیچ میں یہ بات کیونکر آ گئی ہے کہ جس میں پیغمبر اکرمؐ کی بیویاں شامل نہیں ہیں؟

تو اس کا جواب بزرگ مفسر مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس طرح دیتے ہیں: یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ آیات قرآن میں ہم ایسی آیات کا سامنا کر رہے ہیں کہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود مختلف موضوعات کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ قرآن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسی طرح فصحاء عرب کے کلام و اشعار میں بھی اس کے وافر نمونے ملتے ہیں۔

تفسیر المیزان کے عظیم مؤلف نے اس پر ایک اور جواب کا اضافہ کیا ہے کہ جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس ...." کا جملہ ان آیات کے ساتھ نازل ہوا ہے، بلکہ روایات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ علیحدہ نازل ہوا ہے، لیکن پیغمبر اکرمؐ کے دور میں آیات قرآن کی جمع آوری کے موقع پر یا اس کے بعد ان آیات کے ساتھ قرار دیا گیا ہے۔

اس سوال کا جو تیسرا جواب دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی بیویوں سے کہے کہ تمہاری نسبت ایک ایسے گھرانے سے ہو گئی ہے کہ جس کے افراد معصوم ہیں۔ تو جو کوئی شجر عصمت کے سائے میں اور معصومین کے مرکز میں ہو وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ دوسروں کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ خبردار ہو اور اس بات کو نہ بھول جائے کہ جس کی نسبت ایسے خاندان سے ہو کہ جس میں پانچ پاک و معصوم ہستیاں موجود ہیں، اس کی ذمہ داریاں بہت بھاری ہیں۔ خدا اور خلق خدا اس سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہے۔

انشاء اللہ ہم نکات کی بحث میں ان سنی و شیعہ روایات کے بارے میں تفصیل سے بحث کریں گے جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں ازواج پیغمبر کا ساتواں اور آخری حصہ بیان ہوا ہے اور ان سب کو خبردار اور متنبہ کیا گیا ہے کہ بہترین موقع انھیں میسر ہے اس سے استفادہ کریں اور حقائق اسلام سے آگاہی حاصل کریں، چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ "تمھارے گھروں میں خدائی آیات اور حکمت و علم کی تلاوت ہوتی ہے اسے یاد کرو" اور اس کے سانچے میں اپنی اصلاح کرو، کیونکہ بہترین موقع تمھارے ہاتھ میں ہے" (واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ)۔

تم وحی کے مقام اور نور قرآن کے مرکز و منبع میں موجود ہو یہاں تک کہ اگر تم گھر میں بھی بیٹھی ہو تو بھی پیغمبر اسلامؐ کی زبانی تمھارے گھر کی فضا ان آیات سے گونج رہی ہے۔ لہٰذا تمھیں چاہیئے کہ شایانِ شان طریقے سے اسلامی تعلیمات اور پیغمبرؐ کے ارشادات سے بہرہ مند ہو جب کہ رسول اللہ کا ہر سانس درس ہے اور ہر بات ایک راہِ عمل متعین کرتی ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ "آیات اللہ" اور "حکمت" کے درمیان کیا فرق ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ دونوں الفاظ قرآن کی طرف اشارہ ہیں۔ البتہ "آیات" کی تعبیر اس کے اعجاز کے پہلو کو بیان کرتی ہے اور حکمت کی تعبیر اس کے عمیق اور گہرے مفہوم اور علم کو بیان کرتی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ "آیات اللہ" آیاتِ قرآن کی طرف اشارہ ہے اور "حکمت" سنتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے حکیمانہ پند و نصائح کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ دونوں تفاسیر آیت کے مقام و الفاظ سے مناسبت رکھتی ہیں، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے، کیونکہ "تلاوت" کی تعبیر آیاتِ الٰہی سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی متعدد آیات میں آیات اور حکمت دونوں کے بارے میں نزول کی تعبیر آئی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۱ (وما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ) اسی طرح سورۂ نساء کی آیت ۱۱۳ میں بھی آیا ہے۔

خلاصہ کلام کے طور پر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "خدا لطیف و خبیر ہے" (ان اللہ کان لطیفاً خبیراً)۔

اس طرف اشارہ ہے کہ وہ نہایت ہی گہرے اور باریک مسائل سے بھی باخبر اور آگاہ ہے اور تمھاری نیتوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا ہے اور تمھارے سینوں کے اندرونی اسرار سے بھی باخبر ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جب "لطیف" کی تفسیر ایسی ذات سے کی جائے جو باریک ہیں اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہو، اور اگر صاحب لُطف مراد ہو تو یہ اس طرف اشارہ ہوگا کہ اللہ تم ازواج رسول کی نسبت لُطف و رحمت رکھتا ہے اور تمھارے اعمال سے "خبیر" اور آگاہ ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لطیف" آیاتِ قرآنی کے اعجاز کی بنا پر ہے اور "خبیر" اس کے حکمت آمیز مضمون کی بنا پر ہے۔ اس کے باوجود ان معانی کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ سب مطالب مفہوم آیت میں جمع ہو سکتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ آیتِ تطہیر عصمت کی واضح دلیل: بعض مفسرین "رجس" کو آیت میں صرف شرک یا زنا جیسے گناہانِ کبیرہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جبکہ اس محدودیت کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ "الرجس" کا "اطلاق" (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس کا الف و لام، جنس کے لیے ہے، ہر قسم کی ناپاکی اور گناہ کا مفہوم لیے ہوئے ہے کیونکہ

ہر گناہ "رجس" ہے اسی لیے یہ لفظ قرآن میں "شرک" "الکحل والے مشروبات" "جوا" "نفاق" "حرام وناپاک گوشت" اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے معنی میں آیا ہے۔ (حج - ۳۰، مائدہ - ۹۰، توبہ - ۱۲۵، انعام - ۱۴۵)

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خدائی ارادہ تخلف ناپذیر ہے اور "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس" کا جملہ اس کے حتمی ارادہ پر دلیل ہے خصوصاً "انما" کے لفظ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو حصر اور تاکید کے لیے ہے واضح ہوجاتا ہے کہ خدا کا یہ قطعی ارادہ ہے کہ اہل بیت ہر قسم کے رجس و نجاست اور گناہ سے پاک ہوں اور اسی چیز کا نام عصمت ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں ارادۂ الٰہی سے مراد حلال و حرام کے بارے میں اس کے احکام اور فرامین نہیں ہیں، کیونکہ یہ احکام تو سب کے لیے ہیں اور اہل بیت سے اختصاص نہیں رکھتے۔ اس بنا پر وہ لفظ "انما" کے مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں۔

پس یہ مسلسل اور متواتر ارادہ ایک قسم کی خدائی امداد کی طرف اشارہ ہے جو اہل بیت کی عصمت اور اس کے دوام و تسلسل کے لیے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ارادہ و اختیار کی آزادی کے بھی منافی نہیں ہے جیسا کہ ہم تشریح کر چکے ہیں۔

حقیقت میں آیت کا مفہوم وہی ہے جو "زیارت جامعہ" میں آیا ہے۔

"عصمکم اللہ من الزلل وآمنکم من الفتن، وطھرکم من الدنس، واذھب عنکم الرجس، وطھرکم تطھیرا"

"خدا نے لغزشوں سے تمہاری حفاظت کی اور انحراف کج روی کے فتنے سے امان میں رکھا اور آلودگیوں سے پاک کیا تم سے ہر قسم کی ناپاکیوں اور نجاستوں کو دور کیا اور جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے تمہیں پاک رکھا۔"

اس وضاحت کے بعد اوپر والی آیت کے عصمت اہل بیت پر دلالت کرنے میں شک و تردد نہیں کرنا چاہیئے۔

۲۔ آیتِ تطہیر کن افراد کے بارے میں ہے؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ آیت اگرچہ ان آیات کے درمیان آئی ہے جو پیغمبر اکرمؐ کی ازواج سے مربوط ہیں لیکن اس کے سیاق کی تبدیلی ("جمع مونث" کی ضمائر کو "جمع مذکر" میں تبدیل کرنا) اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مضمون ان آیات سے بالکل الگ ہے۔

اس بنا پر ان لوگوں کا نظریہ بھی درست نہیں جو آیت کو پیغمبر اکرمؐ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ، حضرت حسن و حضرت حسین علیہم السلام سے مخصوص نہیں سمجھتے، اس کے لیے وسیع معنی کے قائل ہیں کہ آیت ان بزرگواروں کے بارے میں بھی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی بیویوں کے بارے میں بھی۔

ہمارے پاس بہت سی روایات موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ آیت صرف ان بزرگواروں کے ساتھ مخصوص ہے اور ازواج پیغمبر اکرمؐ اس میں داخل نہیں ہیں اگرچہ شایان شان احترام کے لائق ہیں۔ ہم ذیل میں ان میں سے چھ روایات قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

(الف) کچھ روایات وہ ہیں جو خود پیغمبر اکرم کی ازواج سے نقل ہوئی ہیں اور بتاتی ہیں کہ جس وقت پیغمبر اکرمؐ اس آیت شریفہ کے بارے میں بات کرتے تو ہم آپ سے سوال کرتیں کہ ہم بھی اس کا مخاطب ہیں تو آپ فرماتے کہ تم اچھی تو ہو لیکن اس میں شامل نہیں ہو۔

ان میں سے ایک روایت ثعلبی نے اپنی تفسیر میں جناب "ام سلمہ" سے نقل کی ہے۔

"پیغمبر اکرمؐ اپنے گھر میں تھے کہ حضرت فاطمہؑ ریشمی کپڑا لائیں تو رسول اللہ نے فرمایا اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں حسن

حسینؑ کو بلاؤ۔ فاطمہؑ انھیں بھی بلا لائیں، پھر ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے ان پر عبا ڈال دی۔

اور کہا:

"اللّٰھم ھٰؤلاء اھل بیتی وعترتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرًا"

خداوندا! میرے اہل بیت ہیں اور میری عترت ہیں، ان سے ہر قسم کی نجاست دُور رکھ اور انھیں پاک رکھ جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے۔

اس موقع پر آیت "انما یرید اللہ" نازل ہوئی۔

میں نے کہا کیا میں بھی آپ کے ساتھ ہوں اے رسولِ خدا؟ فرمایا (انک الی خیر) "تو خیر اور نیکی پر ہے"، لیکن ان افراد کے زمرے میں شامل نہیں ہو۔

نیز ثعلبی حضرت عائشہ سے یوں نقل کرتے ہیں۔

"جس وقت بی بی عائشہ سے جنگِ جمل کے بارے میں اور اس تباہ کُن جنگ میں ان کے عمل دخل کے سلسلہ میں سوال کیا گیا تو (انھوں نے افسوس کے ساتھ) کہا یہ ایک تقدیرِ خداوندی تھی اور جب ان سے حضرت علیؑ کے بارے میں سوال ہوا تو کہا:

"تسئلنی عن احب الناس کان الی رسول اللہؐ وزوج احب الناس، کان الی رسول اللہ لقد رأیت علیًا وفاطمۃ وحسنًا وحسینًا علیھم السلام وجمع رسول اللہ (ص) بثوب علیھم ثم قال، اللّٰھم ھٰؤلاء اھل بیتی وحامتی فاذھب عنھم الرجس و طھرھم تطھیرًا، قالت، فقلت یارسول اللہ، انا من اھلک قال تنحی فانک الی خیر"

"کیا مجھ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھتے ہو جو رسول اللہ کے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب اور آنحضرتؐ کے نزدیک محبوب ترین خاتون کے شوہر تھے۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو دیکھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے انہیں ایک کپڑے کے نیچے جمع کیا اور فرمایا: خداوندا! یہ میرے اہل بیت اور میرے حامی و مددگار ہیں ان سے ہر قسم کے رجس کو دور رکھ اور انھیں آلودگیوں سے ایسا پاک رکھ جیسا پاک رکھنے کا حق ہوتا ہے۔

میں نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا میں بھی آپ کے اہل بیت میں سے ہوں؟

فرمایا: پیچھے ہٹو! تم خیر پر ضرور ہو، لیکن ان میں شامل نہیں ہو[1]

اس قسم کی روایات صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ اس آیت میں ازواجِ رسولؐ، اہل بیت کا جزو نہیں ہیں۔

(ب) حدیث کساء کے بارے میں بہت سی روایات اجمالی طور پر وارد ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پیغمبرِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام کو بلایا، یا وہ حضرات خود آپ کی خدمت میں آئے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اوپر عبا ڈالی اور

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

"خداوندا! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے ہر قسم کی بے آلودگی کو دور رکھ"۔

تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس"۔

مشہور عالم، حاکم حسکانی نیشاپوری نے "شواہد التنزیل" میں ان روایات کو متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے اور مختلف راویوں سے جمع کیا ہے۔ [1]

یہاں پر یہ سوال توجہ طلب ہے کہ آخر اہل بیت کو کساء کے نیچے جمع کرنے کا مقصد کیا تھا؟

جواباً عرض ہے کہ گویا پیغمبر چاہتے تھے کہ اپنے اہل بیت کو مکمل طور پر نمایاں اور ممتاز کردیں اور بتادیں کہ یہ آیت صرف انہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مبادا کوئی شخص رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام گھروں اور ان تمام افراد کو جو آپ کے خاندان میں تھے، اس آیت کا مصداق سمجھ لے۔ حتیٰ کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا:

"اللھم ھؤلاء اھل بیتی وخاصتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا"

"خداوندا! میرے اہل بیت یہی ہیں، ان سے ہر قسم کی نجاسات کو دور رکھ"۔ [2]

(ج) بہت سی دوسری روایات میں ہے کہ مندرجہ بالا آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھ ماہ تک جب بھی صبح کی نماز کے وقت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر کے پاس سے گزرتے تو پکار کر کہتے:

"الصلوٰۃ یا اھل البیت! انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا"

"نماز کا وقت ہے اے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ ہر قسم کی نجاست اور پلیدی کو تم اہل بیت سے دور رکھے اور تمہیں ویسا ہی پاک رکھے، جیسے پاک رکھنے کا حق ہے"۔

اس حدیث کو حاکم حکانی نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے۔ [3]

ایک اور روایت میں ابوسعید خدری کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے یہ سلسلہ آٹھ یا نو ماہ تک جاری رکھا۔ [4]

مذکورہ بالا حدیث کو ابن عباس نے بھی آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے۔ [5]

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲ صفحہ ۳۱۔

[2] تفسیر درمنثور آیت زیر بحث کے ذیل میں۔

[3] شواہد التنزیل جلد ۲ صفحہ ۱۱۔

[4] شواہد التنزیل جلد ۲ صفحہ ۳۶، ۳۹۔

[5] درمنثور زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس آیت کا تکرار چھ، آٹھ یا نو ماہ تک مسلسل فاطمہ زہرا علیہا السلام کے گھر کے پاس اس بنا پر ہے، تاکہ یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جائے اور آئندہ کسی شخص کے لیے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے کہ یہ آیت صرف انہی ذوات مقدسہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن کے گھر کا صدر دروازہ مسجد نبوی میں اس وقت بھی کھلتا تھا، جب آنحضرت کے حکم سے دوسروں کے دروازے مسجد کی طرف بند کر دیئے تھے، فطری بات ہے کہ بہت سے افراد ہمیشہ نماز کے وقت یہ بات وہاں پیغمبر کی زبانِ مبارک سے سنتے تھے۔ (غور کیجئے گا)

مقام تعجب ہے کہ اس کے باوجود بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ آیت کا مفہوم عام ہے اور ازواج رسول بھی اس میں شامل ہیں، جبکہ علماء اسلام کی اکثریت خواہ وہ شیعہ ہوں یا اہل سنت اسے پنجتن ہی میں محدود سمجھتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اگر یہ آیت ازواج کے لیے بھی ہوتی تو زوجۂ رسولؐ جناب عائشہؓ نے اپنی گفتگو کے دوران میں کسی نہ کسی مناسب موقع پر اس کا اظہار ضرور کیا ہوتا، کیونکہ روایات کے مطابق انھوں نے اپنے فضائل اور آنحضرتؐ سے اپنے رابطے کو بیان کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، جبکہ اس سلسلہ میں ان سے کسی قسم کی کوئی چیز روایت نہیں ہوئی۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جو صراحت کے ساتھ گواہی دیتی ہیں کہ: "نزلت فی خمسة فی رسول اللہ وعلی وفاطمة والحسن والحسینؑ"[1]

یعنی "یہ روایت صرف انہی پاک ہستیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"

یہ روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض محققین انہیں متواتر جانتے ہیں۔

جو کچھ ہم نے ابھی بیان کیا ہے، اس کا مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احادیث کے مآخذ اور راوی جو آیت کو صرف پنج تن پاک میں منحصر سمجھتے ہیں، اس قدر زیادہ ہیں کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، یہاں تک کہ "احقاق الحق" کی شرح میں ستر سے زیادہ احادیث اہل سنت کی مشہور کتابوں سے جمع کی گئی ہیں اور شیعی مآخذ میں تو ایک ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔[2]

کتاب "شواہد التنزیل" کے مؤلف نے جو برادران اہلسنت کے مشہور علماء میں سے ہیں اس سلسلے میں ۱۳۰ احادیث نقل کی ہیں۔[3]

ان سب امور سے قطع نظر بعض ازواج پیغمبرؐ نے اپنی زندگی کے دوران میں ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں، جو ہرگز مقام عصمت کے لائق نہیں۔ مثلاً جنگِ جمل کا واقعہ، جو امام وقت کے خلاف قیام تھا اور زبردست خون ریزی کا سبب بنا، بعض مؤرخین کے بقول اس جنگ میں سترہ ہزار افراد مارے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ کسی بھی طرح قابل توجیہ نہیں ہے یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود حضرت عائشہؓ بھی اس حادثے کے بعد اظہار ندامت کیا کرتی تھیں، جس کا ایک نمونہ گذشتہ مباحث میں پیش کیا جا چکا ہے۔

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲ صفحہ ۲۵۔

[2] احقاق الحق جلد ۱۲ اور اس کے حواشی کی طرف رجوع کریں۔

[3] شواہد التنزیل جلد ۲ صفحہ ۱ سے لے کر صفحہ ۹۲ تک رجوع کریں۔

اسلام کی بزرگ ترین، فداکار ترین اور بافضیلت ترین خاتون جناب خدیجۃ الکبریٰ تاریخ اسلام کے سینے میں اب تک محفوظ ہے۔ یہ عیب جوئی اسلام کے گرامیٔ قدر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر ناگوار گزری کہ شدت غضب سے آپؐ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔

"خدا کی قسم مجھے اس سے بہتر بیوی نصیب نہیں ہوئی، وہ اس وقت ایمان لائیں جب باقی لوگ کافر تھے اور اس وقت سارا مال میرے سپرد کر دیا جب سب لوگ مجھ سے کٹے ہوئے تھے۔[1]

۳۔ خدا کا ارادہ تشریعی ہے یا تکوینی؟

ہم نے آیت کی تفسیر کے دوران میں اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس" میں ارادہ سے مراد ارادۂ تشریعی نہیں بلکہ ارادۂ تکوینی ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ذہن نشین کریں کہ ارادۂ تشریعی سے مراد خدا کے اوامر و نواہی ہیں۔ مثلاً خدا ہم سے نماز، روزہ، حج و جہاد وغیرہ چاہتا ہے اور یہی ارادۂ تشریعی ہے۔

معلوم ہوا کہ ارادۂ تشریعی کا ہمارے اعمال کے ساتھ تعلق ہوتا ہے نہ کہ خدا کے افعال کے ساتھ۔ حالانکہ زیر بحث آیت میں ارادے کا تعلق خدا کے فعل کے ساتھ ہے، قرآن کہتا ہے: خدا نے ارادہ کیا ہے کہ تم اہل بیت سے ہر قسم کی نجاست اور پلیدی کو دور رکھے اس بنا پر اس قسم کا ارادہ تکوینی ہونا چاہیئے جو عالم تکوین میں خدا کی مشیئت سے مربوط ہے۔

مزید برآں پاکیزگی اور تقوے کے سلسلہ میں ارادۂ تشریعی کا مسئلہ اہل بیتؑ کے ساتھ مخصوص نہیں رہتا، کیونکہ خدا نے تو سب لوگوں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ پاک ہوں اور تقوے اختیار کریں، اور یہ اہل بیتؑ کے لیے کوئی اعزاز نہیں ہوگا کیونکہ تمام مکلف اسی حکم میں شامل ہیں۔

بہرحال یہ موضوع یعنی ارادۂ تشریعی نہ صرف یہ کہ ظاہراً آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ گذشتہ آیات کے ساتھ بھی کسی طرح مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ وہ سب احادیث ایک اعلیٰ خصوصیت اور زبردست قدر و قیمت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں جو اہلبیت کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہ بھی مسلم ہے کہ "رجس" یہاں پر ظاہری نجاست کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ باطنی ناپاکیوں کی طرف اشارہ ہے اور اسے شرک و کفر اور منافی عفت اعمال وغیرہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا اور ہر قسم کے اعتقادی، اخلاقی اور عملی گناہ اور آلودگیاں اس میں شامل ہیں۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف غور سے توجہ کرنا چاہیئے یہ ہے کہ ارادۂ تکوینی جو خلقت و آفرینش کے معنی میں ہے، یہاں مقتضی کے مفہوم میں ہے کہ علت تامہ کے معنی میں، جو موجب جبر و اکراہ اور باعث سلب اختیار ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ مقام عصمت تقوائے الٰہی کی ایک حالت ہے جو پروردگار کی مدد سے انبیاء اور ائمہ میں پیدا ہوتی ہے، لیکن اس حالت کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ وہ گناہ نہ کر سکیں بلکہ وہ اس کام کی قدرت رکھتے ہیں لیکن اپنے ارادہ و اختیار

---

[1] صحیح بخاری اور صحیح مسلم المراجعات ص ۲۲۹ خط ۷۲ کے مطابق۔

کے ساتھ گناہ کے نزدیک نہیں جاتے۔

بالکل اس ماہر طبیب کی مانند جو کسی زہریلی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا کیونکہ وہ اس کے یقینی خطرات سے آگاہ ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کی بصیرت اور فکری و روحانی تقاضے اس امر کا سبب بنتے ہیں کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے دست بردار ہو جائے۔

یہاں اس نکتے کو یاد دلانا بھی ضروری ہے کہ یہ خدائی تقویٰ اس کی خاص دین، عطیہ اور نعمت ہے جو اس نے انبیاء، مرسلین اور ائمہ اطہار علیہم السلام کو عطا فرمایا ہے نہ کہ دوسرے لوگوں کو لیکن توجہ رہے کہ خدا نے یہ اعزاز انہیں رہبری اور قیادت کی بھاری ذمہ داری نبھانے کی بناء پر عطا فرمایا ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کا فائدہ سب کو پہنچتا ہے۔ اور یہ عین عدالت ہے البتہ اس خاص امتیاز کے مانند جو خدا نے آنکھ کے نازک اور بہت ہی حساس پردوں کو دیا ہے، جن سے سارا بدن فائدہ اُٹھاتا ہے۔

علاوہ ازیں انبیاء اور ائمہ جس قدر اعزازات کے حامل ہیں اور عنایات الٰہیہ ان کے شامل حال ہیں اسی قدر ان کی ذمہ داری بھی سخت ہوتی ہے اور ان کا ایک ترک اولیٰ عام افراد کے ایک عظیم گناہ کے برابر شمار ہوتا ہے۔ یہی امر عدالت الٰہی کو واضح کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ ارادہ مقتضی کی صورت میں ارادہ تکوینی ہے (نہ کہ علت تامہ) اور اس کے باوجود نہ تو موجب جبر ہے اور نہ ہی اعزاز کو سلب کرتا ہے۔

۴۔ بیسویں صدی کی جاہلیّت:

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت "الجاھلیۃ الاولیٰ" کی تفسیر کے سلسلے میں زیر بحث آیات میں شک و شبہ کا شکار ہوئی ہے۔ گویا وہ یہ باور نہیں کر سکے کہ ظہور اسلام کے بعد جاہلیت کی کوئی اور قسم بھی دنیا میں ظہور پذیر ہو گی جس کے سامنے اسلام سے پہلے عربوں کی جاہلیت بھی شرما جائے گی لیکن آج کے زمانے میں یہ امر ہمارے لیے جو بیسویں صدی کی جاہلیت کے وحشت ناک مظاہر کے شاہد ہیں پورے طور پر حل شدہ ہے اور اسے قرآن مجید کی معجزانہ پیش گوئیوں میں سے ایک شمار کرنا چاہیئے۔

اگر عرب جاہلیت اولیٰ کے زمانے میں جنگ اور غارتگری کا بازار گرم رکھتے تھے اور بطور مثال متعدد بار بازار عکاظ احمقانہ خوں ریزی کا مرکز بنا جس میں کچھ افراد قتل ہو گئے تو ہمارے زمانے کی جاہلیت میں ایسی عالمی جنگیں رونما ہوتی ہیں کہ بسا اوقات دو کروڑ افراد ان کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور اس سے زیادہ تعداد میں لوگ مجروح اور معذور ہو جاتے ہیں۔

اگر جاہلیت عرب میں عورتیں "تبرج بزینت" کرتی تھیں اور اپنے دوپٹے کو اس انداز سے استعمال کرتیں کہ سینہ، گلا، گردن کا ہار اور گوشوارے نمایاں ہو جاتے تو ہمارے زمانے میں ایسے کلب CLUB بھی ہیں جنہیں "برہنوں کے کلب" کا نام دیا جاتا ہے (جن کا نمونہ انگلستان میں موجود ہے) ہم نہایت معذرت کے ساتھ عرض کریں گے کہ ایسے کلبوں میں لوگ مادر زاد ننگے بن کر جاتے ہیں۔ ساحل سمندر کے پلازوں، سوئمنگ پولوں حتیٰ کہ شارع عام پر ہونے والی اخلاق باختگی ناقابل بیان ہے۔

اگر عربوں کی جاہلیت کے دور میں "زنان آلودہ ذات الاعلام" (جھنڈے تلے والی بدمعاش عورتیں) جو گناہ کی دعوت کی غرض سے اپنے مکانوں پر جھنڈے نصب کر دیتی تھیں، موجود تھیں، تو ہماری صدی کی جاہلیت میں ایسے افراد بھی موجود ہیں تو جو اس بارے میں مخصوص روزناموں میں ایسے مطالب شائع کرتے ہیں جن کے ذکر سے قلم شرما جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں عربوں کی جاہلیت، شرافت نظر آتی ہے۔

قصہ کوتاہ ہم ان مفاسد کی کیفیت کے بارے میں کیا کہیں جو ایمان سے خالی اس مادی اور مشینی تمدن میں پائے جاتے ہیں جن کو بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے اور ہم اس مقدس تفسیر کو اس سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔

جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے ایسے لوگوں کی زندگی کی نشان دہی کرنے کے لیے مشتے نمونہ از خروارے تھا جو خدا سے اپنا ناتہ توڑ بیٹھے ہیں اور ہزارہا دانش گاہوں، علمی مراکز اور مشہور دانش مندوں کے باوجود اخلاقی فساد کی دلدل میں پھنس چکے ہیں یا جنسی فساد کی منجدھار میں ڈوب چکے ہیں۔ حتیٰ کہ خود انہی مراکز کے دانشور بھی ایسی تباہ کاریوں کا شکار ہو چکے ہیں۔

۳۵۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ○

ترجمہ

۳۵۔ بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور صاحبِ ایمان مرد اور صاحبِ ایمان عورتیں، فرمانِ الٰہی کے مطیع مرد اور مطیع عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، باخشوع مرد اور باخشوع عورتیں، خرچ کرنے والے مرد اور خرچ کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، وہ مرد جو اپنے دامن عفّت کو آلودگی سے محفوظ رکھتے ہیں اور پاک دامن عورتیں، وہ مرد جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو زیادہ یادِ خدا میں رہتی ہیں خدا نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم فراہم کر رکھا ہے۔

شانِ نزول

مفسرین کی ایک جماعت کے مطابق جس وقت جعفر بن ابی طالبؑ کی زوجہ جناب اسماء بنت عمیس اپنے شوہر کے ہمراہ حبشہ سے واپس لوٹیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئیں۔ سب سے پہلے جو انہوں نے سوالات کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ "کوئی چیز عورتوں کے بارے میں بھی قرآن مجید میں نازل ہوئی ہے؟" ازواج رسولؐ نے جواب دیا کہ "نہیں" تو فوراً رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئیں کہ یا رسول اللہ! کیا عورتیں خسارے کا شکار تو نہیں"؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: "وہ کیسے"؟

اسماء نے عرض کیا: "قرآن مجید میں مردوں کی طرح ان کے بارے میں کوئی فضیلت نہیں آئی"۔

چنانچہ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اطمینان دلایا کہ عورت اور مرد بارگاہ رب العزت میں قرب و منزلت کے لحاظ سے یکساں حیثیت کے حامل ہیں اور ان کی فضیلت اور برتری اعتقاد، عمل اور اسلامی اخلاق کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

تفسیر

اسلام میں عورت کا مقام:

ازواج رسولؐ کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں مذکورہ گفتگو کے بعد زیر نظر آیت میں عورتوں، مردوں اور ان کی برجستہ صفات کے متعلق ایک اور مفید گفتگو ہو رہی ہے۔ ان کی دس اعتقادی، عملی اور اخلاقی صفات کو شمار کر کے ان کے عظیم اجر کو آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

ان دس صفات کا ایک حصہ ایمان کے مراحل کے بارے میں ہے (یعنی زبان سے اقرار، قلب و روح سے تصدیق اور ارکان کے ساتھ عمل)۔

اس کا دوسرا حصہ زبان و شکم اور جنسی شہوت پر کنٹرول کے بارے میں ہے کیونکہ یہ تینوں عوامل انسان کی زندگی اور اخلاق کے لیے نہایت ہی مؤثر اور فیصلہ کن نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک اور حصے میں محرومین کی حمایت اور سخت ترین حوادث میں استقامت یعنی صبر کا ذکر ہے جو ایمان کی جڑ ہے۔ آخر میں ان صفات کو اپنائے رکھنے اور انہیں دوام بخشنے یعنی ذکر پروردگار کے متعلق گفتگو ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں" (ان المسلمین والمسلمات)۔

مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں (والمؤمنین والمؤمنات) اور وہ مرد جو حکم خدا کے مطیع اور پیروکار ہیں اور وہ عورتیں جو فرمان حق تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہیں (والقانتین والقانتات)۔

اگرچہ اس آیت میں بعض مفسرین نے اسلام اور ایمان کو ایک ہی معنی میں لیا ہے لیکن واضح ہے کہ آیت میں تکرار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان سے مراد دو الگ الگ

چیزیں ہیں اور اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو سورہ حجرات آیہ ۱۴ میں آئی ہے:

" قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم "

" اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ ابھی تم ایمان نہیں لائے بلکہ کہو کہ ہم اسلام لائے ابھی تو ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں اترا ہی نہیں

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام وہ زبانی اقرار ہے جو انسان کو مسلمانوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے اور اسی پر اسلامی احکام نافذ ہوتے ہیں، لیکن ایمان، دل کے ساتھ تصدیق کرنے کا نام ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس فرق کی طرف اشارہ ہوا ہے

ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی نے اسلام اور ایمان کے بارے میں آپؑ سے سوال کیا کہ کیا یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں؟ تو امامؑ نے جواب میں فرمایا:

" جی ہاں ایمان، اسلام کے ساتھ ساتھ ہے لیکن ممکن ہے کہ اسلام، ایمان کے ساتھ نہ ہو۔

صحابی نے مزید وضاحت چاہی تو امام عالی مقام علیہ السلام نے فرمایا:

" الاسلام شهادة ان لا اله الا الله والتصديق برسول الله صلى الله عليه وآله وسلم به حقنت الدماء، وعليه جرت المناكح والمواريث، وعلى ظاهره جماعة الناس، والايمان الهدى ومايثبت فى القلوب من صفة الاسلام، وما ظهر من العمل به

اسلام توحید کی شہادت اور رسالت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق ہے۔ جو شخص ان امور کا اقرار کرے، اس کی جان (حکومت اسلامی کی پناہ میں) محفوظ ہوگی اور مسلمانوں کا اس سے شادی بیاہ جائز ہوگا اور وہ مسلمانوں کی میراث لے سکتا ہے، لوگوں کا ایک گروہ اس ظاہری اسلام ہی کا مصداق ہے۔ لیکن ایمان نورِ ہدایت اور ایسی حقیقت کا نام ہے جو دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور ایسے اعمال سے عبارت ہے جو ایمان کے پیچھے چلے آتے ہیں۔

" قانت " " قنوت " کے مادہ سے ہے اور جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ یہ ایسی اطاعت کے معنی میں ہے جس میں خضوع وخشوع پایا جاتا ہے۔ ایسی عبادت جو ایمان اور اعتقاد کے ساتھ بجالائی جائے۔ یہ ایمان کے عملی پہلوؤں اور اس کے آثار کی جانب اشارہ ہے۔

اس کے بعد سچے مؤمنین کی ایک اہم ترین صفت یعنی زبان کی حفاظت کرنے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اور سچے مرد اور سچی عورتیں" والصادقین والصادقات"۔

لہ اصول کافی جلد ۲ صـ باب " ان الایمان یشرک الاسلام"۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے ایمان کی استقامت اور درستی اس کی زبان کی استقامت پر منحصر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

" لا یستقیم ایمان امرء حتی یستقیم قلبہ، ولا یستقیم قلبہ حتی یستقیم لسانہ "

"انسان کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل درست نہ ہو، جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اس کا دل درست نہیں ہوتا۔"

چونکہ مشکلات کے مقابلے میں ایمان کی بنیاد صبر و شکیبائی ہے اور معنویت کے لحاظ سے صبر کا مقام و مرتبہ انسان کے بدن میں مثل "سر" کے ہے۔ لہٰذا ان کی پانچویں صفت کو یوں بیان کیا گیا ہے "اور صابر و شکیبا مرد اور صابر و با استقامت عورتیں" (والصابرین والصابرات)۔

ہم جانتے ہیں کہ اخلاق کے آفات اور اس کے مصائب میں سے تکبر و غرور اور حب جاہ و مال بھی ہیں جب کہ اس کا متضاد "خشوع" ہے۔ لہٰذا چھٹی صفت یہ بتائی گئی ہے۔ "اور با خشوع مرد اور با خشوع عورتیں" (والخاشعین والخاشعات)۔

حب جاہ کے علاوہ حب مال بھی ایک عظیم آفت ہے جس کے چنگل میں پھنس جانا ایک زبردست المیہ ہوتا ہے بلکہ قید و بند سے کم نہیں ہوتا۔ اس کا متضاد "انفاق" اور حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔ اس لیے ساتویں صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے: "اور انفاق کرنے والے مرد اور انفاق کرنے والی عورتیں" (والمتصدقین والمتصدقات)۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انسان ان کے شر سے محفوظ ہو جائے تو بہت سے شرور اور اخلاقی آفات سے بچ جاتا ہے اور وہ ہیں زبان، شکم اور جنسی خواہشات۔ پہلے حصہ میں چوتھی صفت کی طرف اشارہ ہوا ہے، لیکن دوسرے اور تیسرے حصے میں پچھتے مومنین کی آٹھویں اور نویں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "اور وہ مرد جو روزہ رکھتے ہیں اور وہ عورتیں جو روزہ رکھتی ہیں" (والصائمین والصائمات)۔

"اور وہ مرد جو اپنے دامن کو فحش آلودگیوں سے بچاتے ہیں اور وہ عورتیں جو پاک دامن ہیں" (والحافظین فروجھم والحافظات)۔

اور آخر میں دسویں اور آخری صفت بیان کی گئی ہے کہ جس سے عام گزشتہ صفات کا دوام وابستہ ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ "اور وہ مرد جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو خدا کو زیادہ یاد کرتی ہیں" (والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات)۔

جی ہاں! وہ خدا کے ساتھ ہر حالت میں اور تمام مقامات پر غفلت اور بے خبری کے پردوں کو اپنے دل سے ہٹا دیتے ہیں، شیاطین کے وسوسوں اور بے ہودہ خیالات کو دور کر دیتے ہیں۔ اور اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے، تو فوراً اس

لہ محجۃ البیضاء جلد ۵ ص ۱۵۔

کرتا ہے تاکہ خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم سے ہٹ نہ جائیں

"ذکر کثیر" سے کیا مراد ہے؟ اسلامی روایات اور مفسرین کی گفتگو میں اس کی مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں جو بظاہر اس کا مصداق شمار ہوں گی اور اس لفظ کا وسیع مفہوم ان سب پر محیط ہوگا۔

منجملہ ان کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مبارک حدیث ہے:

"اذا ایقظ الرجل اھلہ من اللیل فتوضأ وصلیا کتبا من الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات"

جب کوئی مرد اپنی بیوی کو رات کے وقت بیدار کرے اور دونوں وضو کر کے نماز (تہجد) ادا کریں تو ان دونوں کا شمار ان مردوں اور عورتوں میں ہوگا جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں۔ [1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو شخص حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کی تسبیح رات کو پڑھے تو وہ اس آیت کا مصداق ہوگا۔ [2]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "ذکر کثیر" یہ ہے کہ:

"قیام وقعود کی حالت میں اور بستر پر جا کر خدا کو یاد کیا جائے"۔

تفسیر جو بھی ہو ذکر بہرحال فکر کی نشانی ہے اور فکر عمل کا مقدمہ اور تمہید ہے اور مقصد قطعاً فکر و عمل سے خالی ذکر نہیں ہے۔

آیت کے آخر میں ایسے مردوں اور عورتوں کے عظیم اجر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: "خدا نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم فراہم کر رکھا ہے" (اعد اللہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما)۔

خداوند عالم پہلے مرحلہ میں ان کے گناہوں کو دھو ڈالتا ہے جو ان کی روح کی آلودگی کا موجب بنتے ہیں، پھر انہیں عظیم اجر عطا کرتا ہے ایسا اجر جس کی عظمت خود اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ درحقیقت ان میں سے ایک میں ناگوار حالات کی نفی کا اور دوسرے میں خوشگوار حالات کے پیدا کرنے کا پہلو موجود ہے۔

"اجرا" کی تعبیر ویسے ہی اس کی عظمت کی دلیل ہے اور پھر اس کو "عظیم" کی صفت کے ساتھ موصوف کرنا اس عظمت کی تاکید ہے اور پھر اس عظمت کو مطلق اور بغیر کسی قید کے ذکر کرنا اس کی وسعت دامان کی ایک اور دلیل ہے۔ واضح رہے، جس چیز کو خداوند عظیم باعظمت شمار کرے وہ یقیناً انتہائی عظیم ہوگی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "اعد" (آمادہ کر رکھا ہے) فعل ماضی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جو یا تو اس اجر کے قطعی اور برخلاف نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے یا پھر اس طرف اشارہ ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتیں ابھی سے مومنین کے لیے تیار ہیں۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر قرطبی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔

خدا کی بارگاہ میں مرد اور عورت برابر ہیں:

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے منزلت کا پلڑا مردوں کے لیے بھاری قرار دیا ہے اور اسلامی کارناموں میں عورتوں کو چنداں مقام و منزلت حاصل نہیں۔ شاید انھیں یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ اسلام میں بعض مقامات پر عورت اور مرد کے حقوق اور قوانین کے درمیان فرق ہے جن میں سے ہر ایک کی اپنی علیحدہ وجہ اور خاص فلسفہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے فرق سے قطع نظر کہ جن کی مخصوص معاشرتی حیثیت اور خاص طبیعی حالت ہوتی ہے، انسانی پہلو اور روحانی مقامات کے لحاظ سے اسلام کی نظر میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

مذکورہ بالا آیت اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کیونکہ مومنین کی خصوصیات اور اعتقادی، اخلاقی اور عمل کے اہم ترین بنیادی مسائل بیان کرتے وقت ترازو کے پلڑوں کے مانند مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے شانہ بشانہ قرار دیا گیا ہے اور ہر دو کے لیے بغیر کسی تھوڑی سی بھی تفاوت اور فرق کے یکساں اجر بیان کیا گیا ہے۔

بالفاظ دیگر مرد اور عورت کے جسمانی فرق کے مانند ان کے روحانی فرق کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور واضح بات ہے کہ یہ فرق انسانی معاشرے کے نظام کو جاری و ساری رکھنے کے لیے ضروری ہے، جس کے نتائج عورت اور مرد کے حقوق کے بعض قوانین میں مرتب ہوتے ہیں لیکن اسلام عورت کی انسانی شخصیت کے بارے میں بعض گزشتہ عیسائی علماء کی طرح یہ سوال نہیں کرتا کہ کیا عورت واقعاً انسان ہے اور آیا اس کے اندر بھی انسانی رُوح پائی جاتی ہے؟ اسلام نہ صرف اس قسم کے سوال نہیں کرتا، بلکہ انسانی رُوح کے لحاظ سے مرد اور عورت کے درمیان کسی قسم کے فرق کا بھی قائل نہیں ہے۔ اسی لیے ہم سورۂ نحل کی آیہ ۹۷ میں پڑھتے ہیں:

"من عمل صالحاً من ذکر او انثی وھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔"

"جو شخص نیک عمل کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، جبکہ وہ باایمان ہو تو ہم اس کو زندہ کریں گے اور اسے پاکیزہ زندگی بخشیں گے اور اسے اس کے بہترین عمل کا بدلہ دیں گے۔"

اسلام عورت کے لیے اسی طرح اقتصادی آزادی کا قائل ہے جس طرح مرد کے لیے، برخلاف گزشتہ بلکہ موجودہ زمانہ کے بہت سے قوانین کہ جن میں عورت کو کسی قسم کی اقتصادی آزادی نہیں دی گئی۔

اسی بناء پر اسلامی "علم الرجال" میں ہمیں ایسی صاحبان علم خواتین کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو فقہا اور راویوں کی صف میں موجود ہیں اور جنھیں ناقابل فراموش شخصیات کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

اگر ہم اسلام سے پہلے کی عرب تاریخ کی طرف لوٹیں اور اس معاشرے میں عورت کی کیفیت کے سلسلے میں تحقیق کریں کہ کس طرح وہ اپنے بہت سے بنیادی حقوق تک سے محروم تھی تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات تو وہ لوگ اس کے جینے کے حق کے قائل بھی نہیں تھے اور پیدا ہونے کے بعد اسے زندہ درگور کر دیتے تھے۔

اسی طرح اگر موجودہ دور میں عورت کی حالت دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ تمدن کے مٹھی بھر جھوٹے دعوے داروں نے عورت

کو ایک بے جان کھلونا سمجھا ہوا ہے اور بس!

یہیں پر پہنچ کر ہم اس امر کی تصدیق کریں گے کہ اسلام نے عورت کی کس قدر عظیم خدمت کی ہے اور عورت کی گردن پر اس کا کس حد تک حق بنتا ہے؟ [1]

---

[1] اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد نہم میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ کے ذیل میں اور جلد ۱۱ میں سورۂ نحل کی آیت ۹۷ کے ذیل میں بھی بحث کی گئی ہے۔

۳۶۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ ۝

۳۷۔ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝

۳۸۔ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۝

ترجمہ

۳۶۔ کوئی با ایمان مرد اور با ایمان عورت یہ حق نہیں رکھتے کہ خدا اور اس کا

رسول کسی امر کو لازم سمجھیں (تو وہ خدا کے فرمان کے مقابلے میں) اپنی طرف سے خود مختار ہوں اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ واضح گمراہی میں گرفتار ہے۔

۳۷۔ وہ وقت یاد کرو جب اس شخص کو جسے خدا نے نعمت دی تھی اور تم نے بھی اس پر احسان کیا تھا، تم اس سے کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور خدا سے ڈرو (اور تم اسے یہ بات بار بار کہتے تھے) اور تم اپنے دل میں ایک چیز چھپائے ہوئے تھے کہ جسے خدا نے آشکار کرنا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ اس سے ڈرو۔ جس وقت زید اپنی بیوی سے جدا ہوا تو ہم نے اس کی بیوی کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ مومنین کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے مطلقہ ہونے کے بعد شادی کرنے میں کوئی مشکل باقی نہ رہے اور خدا کا فرمان تو پورا ہو کر رہتا ہے۔

۳۸۔ جو چیز خدا نے نبی پر فرض کی ہے، اس کے بارے میں پیغمبر پر کسی قسم کا جرم نہیں ہے، خدا کی سنت ان لوگوں کے بارے میں بھی جاری ہے جو اس سے پہلے تھے اور خدا کا فرمان ٹھیک اور حساب و کتاب کے مطابق ہے۔

شان نزول

اکثر اسلامی مورخین اور مفسرین کے مطابق زیر نظر آیات (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد) زینب بنت جحش اور آنحضرتؐ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ زمانہ بعثت سے پہلے اور اس کے بعد جب کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ نے پیغمبر اسلام سے شادی

کی تو حضرت خدیجہؑ نے زید نامی ایک غلام خریدا، جسے بعد میں آنحضرتؐ کو ہبہ کر دیا۔

آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ چونکہ اس کے قبیلے نے اسے اپنے سے جدا کر دیا تھا، لہٰذا رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا، جسے اصطلاح میں متبنیٰ کہتے ہیں۔

ظہورِ اسلام کے بعد زید مخلص مسلمان ہو گیا اور اسلام کے ہراول دستے میں شامل ہو گئے اور اسلام میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ آخر میں جنگ موتہ میں ایک مرتبہ لشکرِ اسلام کے کمانڈر بھی مقرر ہوئے اور اسی جنگ میں شربت شہادت نوش کیا۔

جب سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کا عقد کرنا چاہا تو اپنی پھوپھی زاد، زینب بنت جحش بنت امیہ بنت عبدالمطلب سے اس کے لیے خواستگاری کی۔ زینب نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ آنحضرت اپنے لیے اسے انتخاب کرنا چاہتے ہیں لہٰذا وہ خوش ہو گئی اور رضامندی کا اظہار کر دیا، لیکن بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ آپ کی یہ خواستگاری تو زید کے لیے تھی تو سخت پریشان ہوئی اور انکار کر دیا۔ اس کے بھائی عبداللہ نے بھی اس چیز کی سخت مخالفت کی۔

یہی وہ مقام تھا جس کے بارے میں زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور زینب اور عبداللہ جیسے افراد کو تنبیہ کی کہ جس وقت خدا اور اس کا رسول کسی کام کو ضروری سمجھیں تو وہ مخالفت نہیں کر سکتے۔

جب انھوں نے یہ بات سُنی تو سرِ تسلیم خم کر دیا۔ (البتہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ شادی کوئی عام شادی نہیں تھی بلکہ یہ زمانۂ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کے لیے ایک تمہید تھی کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں کسی باوقار اور مشہور خاندان کی عورت کسی غلام کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی، چاہے وہ غلام کتنا ہی اعلیٰ قدر و قیمت کا مالک کیوں نہ ہوتا۔

لیکن یہ شادی زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی اور طرفین کے درمیان اخلاقی ناچاقیوں کی بدولت طلاق تک نوبت جا پہنچی۔ اگرچہ پیغمبرِ اسلام کا اصرار تھا کہ یہ طلاق واقع نہ ہو لیکن ہو کر رہی۔

اس کے بعد پیغمبرِ اکرمؐ نے شادی میں اس ناکامی کی تلافی کے طور پر زینب کو بحکمِ خدا کے تحت اپنے حبالہ عقد میں لے لیا اور یہ بات یہیں پر ختم ہو گئی۔

لیکن دوسری باتیں لوگوں کے درمیان چل نکلیں جنہیں قرآن مجید نے بعض زیر بحث آیات کے ذریعے ختم کر دیا، جن کی تفصیل انشاءاللہ ابھی آئے گی۔[1]

تفسیر

ایک بہت بڑی رسم ٹوٹتی ہے:

سب جانتے ہیں کہ اسلام کی رُوح تسلیم ہے اور وہ بھی حکمِ خدا کے سامنے غیر مشروط طور پر، یہ معنی قرآن کی مختلف آیات اور

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی، تفسیر المیزان، تفسیر فخر الرازی، تفسیر فی ظلال القرآن اور دوسری تفاسیر زیر بحث آیات کے ذیل میں اسی طرح سیرۃ ابن ہشام، جلد اوّل صفحہ ۲۶۴ اور کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۷۵۔

عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، منجملہ ان کے مندرجہ بالا آیت ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے: "کسی ایماندار مرد اور باایمان عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی امر کو ضروری سمجھیں تو حکم خدا کے سامنے ان کا اپنا اختیار چلے" (وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرًا ان یکون لھم الخیرة من امرھم)۔

انہیں چاہیئے کہ وہ اپنا ارادہ حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع کریں جیسا کہ ان کا وجود سراپا اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔

"قضی" یہاں پر قضائے تشریعی" قانون، فرمان اور فیصلہ دینے کے معنی میں ہے اور واضح سی بات ہے کہ نہ تو خدا لوگوں کی اطاعت اور تسلیم کا محتاج ہے اور نہ ہی پیغمبر اکرمؐ کو ان سے کسی قسم کا طمع، بلکہ حقیقت میں خود ان لوگوں کا اپنا فائدہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات اپنے علم و معرفت کے محدود ہونے کی وجہ سے وہ باخبر نہیں ہو پاتے لیکن خدا تو جانتا ہے اور اپنے پیغمبرؐ کو حکم بھی دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سے ایک ماہر طبیب بیمار سے کہتا ہے کہ میں اس صورت میں تمہارا علاج کروں گا جب تم میری ہدایت کو بسر و چشم قبول کرو گے اور اپنی طرف سے خود مختار نہیں ہو گے۔ درحقیقت یہ بات بیمار کے بارے میں طبیب کی دلی شفقت اور انتہائی دل سوزی کی دلیل ہوتی ہے اور خدا تو اس قسم کے طبیب سے بدرجہا اولیٰ اور برتر ہے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ واضح گمراہی کا شکار ہو گا" (ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالًا مبینًا)

وہ راہ سعادت کھو دے گا اور بے راہروی اور بدبختی کا شکار ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے مہربان خدا اور اس کے رسولؐ کے فرمان کی پرواہ نہیں کی جو خیر و سعادت کا ضامن ہے۔ اس سے بڑھ کر اور واضح گمراہی کیا ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد زید اور اس کی بیوی زینب کی اس مشہور داستان کو بیان کیا گیا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حساس مسائل میں سے ایک ہے اور ازواج رسولؐ کے مسئلہ سے مربوط ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اس وقت کو یاد کرو جب اس شخص کو جسے خدا نے نعمت دے رکھی تھی اور تم نے (بھی اے رسولؐ!) اسے نعمت دی تھی اور تم کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور خدا سے ڈرو" (واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ)۔

نعمت خدا سے مراد وہی ہدایت اور ایمان کی نعمت ہے جو زید بن حارثہ کو نصیب ہوئی تھی اور پیغمبرؐ کی نعمت یہ تھی کہ آپ نے اسے آزاد کیا تھا اور اپنے بیٹے کی طرح اسے عزت بخشی تھی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زید اور زینبؓ کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا تھا اور یہ جھگڑا اس قدر طول پکڑ گیا کہ نوبت جدائی اور طلاق تک جا پہنچی۔ اگر "تقول" کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ فعل مضارع ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آنحضرتؐ بارہا بلکہ ہمیشہ اسے نصیحت کرتے اور روکتے تھے۔

کیا زینب کا یہ نزاع زید کی سماجی حیثیت کی بناء پر تھا جو زینب کی معاشرتی حیثیت سے مختلف تھی؟ کیونکہ زینب کا ایک مشہور و معروف قبیلہ سے تعلق تھا اور زید آزاد شدہ تھا۔ یا زید کی اخلاقی سختیوں کی وجہ سے تھا؟ یا ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی بلکہ دونوں میں روحانی اور اخلاقی موافقت اور ہم آہنگی نہیں تھی؟ کیونکہ ممکن ہے دو افراد اچھے تو ہوں لیکن فکر و نظر اور سلیقہ کے لحاظ سے ان میں اختلاف

ہو جس کی بناء پر وہ اپنی ازدواجی زندگی کو آئندہ کے لیے جاری نہ رکھ سکتے ہوں؟

بہرحال مسئلہ اس حد تک پیچیدہ نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے "تم اپنے دل میں ایک چیز کو چھپائے ہوئے تھے جسے خدا آشکار کرتا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ خدا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے ڈرو": (وتخفی فی نفسك ما الله مبديه وتخشى الناس والله احق ان تخشاه)۔

مفسرین نے اس مقام پر بہت سی باتیں کی ہیں اور بعض لوگوں کی تعبیرات میں لاپرواہی اور نافہمی کے سبب دشمن کے ہاتھ بہانے آ گئے۔ حالانکہ ان قرائن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ آیات کے شان نزول اور تاریخ میں یہ بات موجود ہے کہ پیغمبرؐ کی نظر میں تھا کہ اگر ان میاں بیوی کے درمیان صلح صفائی نہیں ہو پاتی اور نوبت طلاق تک جا پہنچتی ہے تو وہ اپنی پھوپھی زاد زینبؓ کی اس ناکامی کی تلافی اپنے ساتھ نکاح کی صورت میں کر دیں گے، اس کے ساتھ آپؐ کو یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ لوگ دو وجوہ کی بنا پر آپؐ پر اعتراض کریں گے اور مخالفین ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیں گے۔

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ زید آنحضرتؐ کا منہ بولا بیٹا تھا، اور زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق منہ بولے بیٹے کے بھی وہی احکام ہوتے تھے جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی تھا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے بھی شادی کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔

دوسری یہ کہ رسول اکرمؐ کیونکر اس بات پر تیار ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ سے عقد کریں جبکہ آپؐ کی شان بہت بلند و بالا ہے۔

بعض اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ ارادہ حکم خداوندی سے کیا ہوا تھا اور آیت کے بعد والے حصے میں بھی اس بات کا قرینہ موجود ہے۔

اس بناء پر یہ مسئلہ ایک تو اخلاقی اور انسانی مسئلہ تھا اور دوسرے یہ زمانہ جاہلیت کی دو غلط رسموں کو توڑنے کا ایک نہایت ہی مؤثر ذریعہ تھا۔ (یعنی منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے ازدواج۔ اور آزاد کردہ غلام کی مطلقہ سے عقد)۔

مسلم ہے کہ پیغمبرؐ کو ان مسائل میں نہ تو لوگوں سے ڈرنا چاہیئے تھا اور نہ ہی فضا کے مکدر ہونے اور زہریلے پروپیگنڈا سے خوف زدہ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بہرحال ایک فطری بات ہے کہ انسان اس قسم کے مواقع پر خصوصاً جہاں بیوی کے انتخاب کا مسئلہ ہو تو خوف و وحشت کا شکار ہو ہی جاتا ہے، خاص کر جب یہ احتمال ہو کہ ایک جنجال کھڑا ہو جائے گا اور آپؐ کے مقدس مشن کی ترقی اور اسلام کی پیش رفت کے لیے رکاوٹ کھڑی ہو جائے گی اور یہ بات ضعیف الایمان افراد کو متزلزل کر دے گی اور ان کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے۔

اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "جس وقت زید نے اپنی حاجت کو پورا کر لیا اور اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تو ہم اسے تمہاری زوجیت میں لے آئے تاکہ منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کی مطلقہ ہونے کے بعد مومنین کو ان سے شادی کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو": (فلما قضى زيد منها وطرا زوجناكها لكى لا يكون على المومنين حرج فى ازواج ادعيائهم اذا قضوا منهن وطرا)۔

یہ کام ایسا تھا جسے انجام پا جانا چاہیئے تھا" اور خدا کا فرمان انجام پا کر رہتا ہے": (وكان امر الله مفعولا)۔

"ادعیاء" "دعی" کی جمع ہے جو مُنہ بولے بیٹے کے معنی میں ہے"، "وطر" ضرورت اور اہم حاجت کے معنی میں ہے اور "زینب" کی طلاق اور جدائی کے بارے میں اس تعبیر کا انتخاب حقیقت میں لطفِ بیان کی وجہ سے ہے تاکہ "طلاق" کا لفظ جو عورتوں کے لیے بلکہ مردوں کے لیے بھی عیب ہے، صراحت کے ساتھ بیان نہ ہو، گویا یہ دونوں ایک دوسرے کے احتیاج مند تھے کہ ایک مدت تک مشترکہ زندگی بسر کریں اور جب یہ احتیاج ختم ہوگئی تو ان کے درمیان جدائی واقع ہوگئی۔

"زوجناکھا" (ہم اسے آپ کی تزویج میں لے آئے) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ازدواج، خدا کی طرف سے تھا۔ اسی لیے تاریخ میں آیا ہے کہ "زینب" رسول خدا کی دوسری بیویوں پر فخر و مباہات کرتی اور کہتی تھیں:

"زوجکن اھلوکن وزوجنی اللہ من السماء"

"پیغمبرؐ سے تمہارا نکاح تو تمہارے رشتہ داروں نے کیا ہے لیکن میرا نکاح اللہ نے آنحضرتؐ کے ساتھ آسمانوں میں کیا ہے۔" [1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن ہر قسم کے شک و شبہ کو دور کرنے کے لیے پوری صراحت کے ساتھ اس شادی کا اصل مقصد بیان کرتا ہے جو زمانۂ جاہلیت کی ایک رسم توڑنے کے لیے تھی یعنی مُنہ بولے بیٹوں کی مطلقہ عورتوں سے شادی نہ کرنے کے سلسلے میں یہ خود ایک کلی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبرؐ کا مختلف عورتوں سے شادی کرنا کوئی عام سی بات نہیں تھی، بلکہ اس میں کسی ایک مقاصد کا ذکر کرنا مقصود تھا جو آپؐ کے مکتب کے مستقبل میں انجام سے تعلق رکھتا تھا۔

"کان امر اللہ مفعولا" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کے مسائل میں دوٹوک فیصلہ کردینا چاہیئے اور کرنے کا کام ضرور انجام پذیر ہونا چاہیئے۔ ایسے مسائل میں جو کلی اور بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، ان کے سلسلہ میں دُنیا کے شور شرابے اور جنجال کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال دینا چاہیئے۔

مذکورہ بالا آیت کی واضح تفسیر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے ضمن میں جو الزامات دشمن یا نادان دوست لگاتے ہیں، وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور انشاء اللہ ہم نکات کی بحث میں اس بارے میں مزید وضاحت کریں گے۔

آخری زیر بحث آیت گزشتہ مباحث کی تکمیل کے سلسلے میں یوں کہتی ہے: "خدا نے جو چیز پیغمبر پر واجب کردی ہے اس کے بارے میں ان کے لیے کسی قسم کی تمنی اور حرج نہیں ہے": (ما کان علی النبی من حرج فیما فرض اللہ لہ)۔

جب خداوند عالم انھیں کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے بارے میں کسی قسم کی رو رعایت جائز نہیں ہے۔ کسی قسم کے چون و چرا کے بغیر اس پر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔

آسمانی رہبروں کو خدائی احکام کے اجراء میں اِدھر اُدھر کی باتوں پر بھی کان نہیں دھرنا چاہیئے، غلط سیاسی فضا یا غلط قسم کے آداب و رسوم کو جو ماحول پر چھائے ہوئے ہیں، مدنظر نہیں رکھنا چاہیئے۔

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۷۷، قابل توجہ امر یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی زینبؑ سے شادی پانچویں ہجری میں ہوئی (حوالہ مذکورہ)۔

کیونکہ بعض اوقات اس قسم کے احکام انہی غلط رسومات کو مٹانے اور غلط اور سوا کن بدعتوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ہوتے ہیں، انہیں ولا یخافون لومۃ لائم (مائدہ/۵۴) کا مصداق ہوتے ہوئے دنیا کی کسی سرزنش اور شور و غوغا خاطر میں نہ لاکر حکم انہی پر کاربند ہونا چاہیئے۔

اصولی طور پر اگر ہم یہ چاہیں کہ جب تک فرمان خدا کے لیے سب کی رضا اور خوشنودی حاصل کرلیں، اس وقت تک کچھ نہ کریں تو یہ بات قطعاً ناممکن ہے، کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو صرف اس وقت راضی ہوتے ہیں جب ہم ان کی تمام خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کرلیں یا ان کے مکتب کے پیروکار ہو جائیں، جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

"ولن ترضی عنک الیھود ولا النصاری حتی تتبع ملتھم"۔

"یہود و نصاریٰ ہرگز تجھ سے راضی نہیں ہوں گے، جب تک تو ان کے دین کی غیر مشروط پیروی نہ کرے"۔

(بقرہ/۱۲۰)

زیر بحث آیت کے بارے میں بھی معاملہ کچھ اسی طرح کا تھا، کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زینبؓ سے شادی کرلینے پر اس ماحول کے عام لوگوں کی نظر میں دو اعتراض تھے ایک تو منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی جو ان کی نگاہ میں سگے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنے کے مترادف تھا اور یہ ایسی بدعت تھی، جسے ہر حالت میں توڑنا چاہیئے تھا اور دوسرا ایک باوقار شخصیت یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے شخص کا ایک آزاد شدہ غلام کی مطلقہ سے شادی کرنا۔ کیونکہ یہ چیز پیغمبر کو ایک غلام کے ہم پلہ قرار دیتی تھی اس غلط خیال کو بھی بہر صورت ختم ہونا چاہیئے تھا اور اس کی جگہ انسانی اقدار کو لینا چاہیے تھی اور میاں بیوی کا "کفو" ہونا صرف ایمان، اسلام اور تقویٰ کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیئے تھا، اور یہی ہو کر رہا۔

اصولی طور پر کسی رسم و رواج کو توڑنے اور غیر انسانی آداب و رسوم کو ختم کرنے سے ہمیشہ ہنگامہ کھڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا پیغمبروں کو کبھی ایسے ہنگاموں کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی لیے بعد والے جملہ میں فرمایا گیا ہے: انبیاء کے بارے میں یہ خدائی سنت گزشتہ امتوں میں بھی جاری رہ چکی ہے: (سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل)۔

گویا اے رسول! صرف آپ ہی ان مشکلات میں گرفتار نہیں ہیں، بلکہ تمام انبیاءؑ غلط رسم و رواج کو توڑتے وقت ان مشکلات سے دوچار ہوئے تھے۔

اس معاملہ میں سب سے بڑی مشکل صرف یہ نہیں تھی کہ ان دو غلط رسموں کو توڑا جائے، بلکہ آنحضرت کی شادی کا مسئلہ بیچ میں آجانے کی وجہ سے عیب جوئی کے لیے دشمن کے ہاتھ میں ایک اور بہانہ بھی آتا تھا جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

اس قسم کے بنیادی مسائل کے فیصلہ کن ہونے کو ثابت کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے:

خدا کا حکم ہمیشہ جچا تلا اور صحیح پروگرام کے مطابق ہوتا ہے اور اسے نافذ العمل ہونا چاہیئے (وکان امر اللہ قدرا مقدورا)۔

ہوسکتا ہے کہ "قدرا مقدورا" کی تعبیر فرمان الٰہی کے حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں حکمت اور مصلحت کو مدنظر رکھا گیا ہو۔ لیکن زیادہ مناسب یہی ہے کہ اس سے دونوں معانی مراد لیے جائیں یعنی فرمان خدا حساب و کتاب پر مبنی بھی ہے اور وہ بغیر کسی حیل و حجت کے نافذ العمل بھی ہے۔

پھر مزید بات یہ کہ تاریخی کتابوں میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب سے ازدواج کے سلسلے میں کھانے کی دعوت کا ایسا عمومی بندوبست کیا، جو اس سے پہلے کسی شادی کے موقع پر دیکھنے میں نہیں آیا تھا[1]

اس طرح سے گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ آپ کسی طرح بھی بے ہودہ اور فضول رسم و رواج سے مرعوب نہیں، بلکہ اس خدائی حکم کے نفاذ پر فخر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی نگاہ میں یہ بھی تھا کہ اس طرح سے زمانہ جاہلیت کی رسم کو توڑنے کی آواز تمام جزیرۃ العرب کے رہنے والوں کے کانوں تک پہنچ جائے۔

چند اہم نکات

۱۔ **جھوٹے افسانے:** پیغمبر اسلامؐ کی زینب کے ساتھ شادی کی داستان قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دی ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کا ہدف منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کے ذریعے دور جاہلیت کی ایک رسم کو توڑنا تھا، اس کے باوجود دشمنان اسلام نے اسے غلط رنگ دے کر ایک عشقیہ داستان میں تبدیل کر دیا، اس طرح سے انہوں نے پیغمبر اکرم کی ذات والا صفات کو آلودہ کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے اور اس بارے میں مشکوک اور جعلی احادیث کا سہارا لیا ہے۔ ان داستانوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جس وقت رسول اکرمؐ زید کی احوال پرسی کے لیے اس کے گھر گئے اور جونہی آپؐ نے دروازہ کھولا تو آپ کی نظر زینبؓ کے حسن و جمال پر جا پڑی تو آپؐ نے فرمایا:

"سبحان اللہ خالق النور تبارک اللہ احسن الخالقین"

"منزہ ہے وہ خدا جو نور کا خالق ہے اور جاوید و بابرکت ہے وہ اللہ جو احسن الخالقین ہے"

ان لوگوں نے اس جملے کو زینبؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لگاؤ کی دلیل قرار دیا ہے، حالانکہ عصمت و نبوت کے مسئلے سے قطع نظر بھی اس قسم کے افسانوں کی تکذیب کے واضح شواہد ہمارے پاس موجود ہیں:

پہلا یہ کہ حضرت زینبؓ، رسول پاکؐ کی پھوپھی زاد تھیں اور خاندانی ماحول میں تقریباً آپ کے سامنے بڑی ہوئی تھیں اور آپؐ ہی نے یہ کے لیے ان کی خواستگاری کی تھی۔ اگر زینبؓ حد سے زیادہ حسین تھیں اور بالفرض اس کے حسن و جمال نے پیغمبر اکرمؐ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا تھا تو نہ تو اس کا حسن و جمال ڈھکا چھپا تھا اور نہ ہی اس ماجرے سے پہلے ان کے ساتھ آنحضرتؐ کا عقد کرنا کوئی مشکل امر تھا۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو زینب کو زید کے ساتھ شادی کرنے سے دلچسپی نہ تھی، بلکہ اس بارے میں انہوں نے اپنی مخالفت کا اظہار صراحت کے ساتھ بھی کر دیا تھا اور وہ اس بات کو کما حقہ ترجیح دیتی تھیں کہ زید کی بجائے رسول اللہ کی بیوی بنیں، کیونکہ جب آنحضرتؐ زید کے لیے زینب سے خواستگاری کرنے آئے تو وہ نہایت خوش ہوگئیں، کیونکہ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ آپ ان سے اپنے

---

[1] عظیم مفسر طبرسی مرحوم "مجمع البیان" میں اس طرح نقل کرتے ہیں کہ:

"فتزوجها رسول اللہ ..... وما اولم علی امرأة من نسائه ما اولم علیها، ذبح شاة واطعم الناس الخبز واللحم، حتی امتد النهار۔ (مجمع البیان جلد ۸ ص ۳۶۱)

لیے خواستگاری کی غرض سے تشریف لائے ہیں، لیکن بعد میں قرآن کی آیت کے نزول اور خدا و پیغمبر کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے زید کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہوگئیں۔

تو ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تو ہم کی کونسی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ آپ زینبؓ کے حالات سے بے خبر تھے؟ یا آپ ان سے شادی کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اقدام نہیں کر سکتے تھے؟

دوسرا یہ کہ جب زید نے اپنی بیوی زینبؓ کو طلاق دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کیا تو آپ نے بار بار اسے نصیحت کی اور طلاق دینے کے لیے روکا اور یہ چیز بجائے خود ان افسانوں کی نفی کا ایک اور شاہد ہے۔

پھر یہ کہ خود قرآن صراحت کے ساتھ اس شادی کا مقصد بیان کرتا ہے تاکہ کسی قسم کی دوسری باتوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

چوتھا امر یہ ہے کہ آیت بالا میں خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ سے فرماتا ہے کہ زید کی مطلقہ بیوی کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی خاص بات تھی جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں سے ڈرتے تھے، جبکہ انھیں صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہیے۔ خوف خدا کا مسئلہ واضح کرتا ہے کہ یہ شادی ایک فرض کی بجا آوری کے طور پر انجام پائی تھی کہ خدا کی ذات کے لیے شخصی ملاحظات کو ایک طرف رکھ دینا چاہیئے تاکہ ایک خدائی مقدس ہدف پورا ہو۔ اگرچہ اس سلسلے میں کوردل دشمنوں کی زبان کے زخم اور منافقین کی افسانہ طرازی کا پیغمبر کی ذات پر الزام ہی کیوں نہ آتا ہو۔ پیغمبر اکرمؐ نے حکم خدا کی اطاعت اور غلط رسم کو توڑنے کی پاداش میں یہ ایک بہت بڑی قیمت ادا کی ہے اور اب تک کر رہے ہیں۔

لیکن سچے رہبروں کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں، جن میں انھیں ایثار اور فداکاری کا ثبوت دینا پڑتا ہے، اور وہ اس قسم کے لوگوں کے اتہامات اور الزامات کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ تاکہ اس طرح سے وہ اپنے اصل مقصد تک پہنچ جائیں۔

البتہ اگر پیغمبر گرامیؐ قدر نے زینبؓ کو بالکل ہی نہ دیکھا ہوتا اور نہ ہی پہچانا ہوتا اور زینب نے بھی آپ کے ساتھ ازدواج کے بارے میں رغبت کا اظہار نہ کیا ہوتا اور زیدؓ بھی انھیں طلاق دینے پر تیار نہ ہوتے (نبوت و عصمت کے مسئلہ سے ہٹ کر) پھر تو اس قسم کی گفتگو اور ان توہمات کی گنجائش ہوتی، لیکن پیغمبر کی تو وہ دیکھی بھالی تھیں لہٰذا ان تمام امکانات کی نفی کے ساتھ ان افسانوں کا جعلی اور من گھڑت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں نبی اکرمؐ کی زندگی کا کوئی لمحہ یہ نہیں بتاتا کہ آپ کو زینب سے کوئی خاص لگاؤ اور رغبت ہو، بلکہ دوسری بیویوں کی طرح اور شاید ان میں سے بعض دوسری بیویوں کی نسبت ان سے کم رغبت رکھتے تھے اور ان افسانوں کی نفی پر یہ ایک اور دلیل ہے۔

آخری بات جس کی طرف ہم یہاں پر اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اس غلط رسم کو مٹانا تو ضروری تھا، لیکن اس کی کیا ضرورت تھی کہ خود آنحضرتؐ ہی اس کے لیے عملی اقدام اٹھائیں۔ آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ اس مسئلے کو قانون کی صورت میں بیان کر دیتے اور دوسروں کو اپنے منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے شادی کرنے کی ترغیب دلاتے۔

لیکن توجہ رکھنا چاہیئے کہ بعض اوقات ایک جاہلانہ اور غلط رسم کا خاتمہ خاص کر شادی بیاہ کے سلسلے میں اور وہ بھی ایسے افراد سے جو دنیا کی نگاہوں میں کم حیثیت ہوتے ہیں، صرف گفتگو سے ممکن نہیں ہوتا، بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر یہ کام اچھا ہے تو

پیغمبر اسے خود کیوں نہیں انجام دیتے ؟ اپنے آزاد شدہ غلام کی مطلقہ بیوی سے خود شادی کیوں نہیں کرتے ؟ وغیرہ۔

اس قسم کے مواقع پر ایک عملی نمونہ اس طرح کے تمام اعتراضات کو ختم کر دیتا ہے، فیصلہ کن انداز میں وہ غلط رسم ٹوٹ جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ یہ عمل بذاتِ خود ایک قسم کی فداکاری اور ایثار بھی تھا۔

۲۔ حق کے سامنے جھک جانا ہی عین اسلام ہے :

اس میں شک نہیں کہ انسان کا فکری اور روحانی استقلال اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ غیر مشروط طور پر ہر کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے، کیونکہ وہ بھی اس کی طرح کا انسان ہے اور ہو سکتا ہے کہ کئی مسائل میں وہ (جس کے سامنے جھکایا جا رہا ہے) غلطی میں مبتلا ہو۔

لیکن جب مسئلے کا سلسلہ عالم اور حکیم خدا اور اس کے پیغمبر تک جا پہنچتا ہو، جو خدا کے حکم کے ساتھ بولتا اور اس کے حکم کے مطابق قدم اُٹھاتا ہو تو اب مکمل طور پر سرِ تسلیم خم نہ کرنا گمراہی کی دلیل ہوگا، کیونکہ اس کا حکم اور فرمان ہر قسم کے شائبہ تک سے پاک ہوتا ہے۔ نیز اس سے قطع نظر کہ اس کا فرمان خود انسان ہی کے مفاد میں ہوتا ہے اور خدا کی پاک ذات کو تو کوئی چیز بھی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ تو کیا پھر بھی ممکن ہے کہ کوئی عقلمند انسان اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اپنے مفادات اور مصالح کو پامال کر دے؟

ان سب باتوں سے ہٹ کر، ہم اس کی ملکیت ہیں اور ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، اس کا دیا ہوا ہے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ ہم اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ اس لیے قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیات دکھائی دیتی ہیں جو اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

کوئی آیت کہتی ہے :

" انما کان قول المؤمنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون۔ (نور۔ ۵۱)

" انبیاء کے حقیقی پیروکار وہی لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول کا حکم سن کر کہتے ہیں، ہم نے سنا اور اطاعت کی "

" فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما "

(نساء / ۶۵)

" تمہارے پروردگار کی قسم کی وہ ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، جب تک کہ تجھے اپنے اختلافات میں حاکم اور فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں۔ اور پھر تیرے کیے ہوئے فیصلے سے ذرہ برابر بھی ناراضی کا اظہار نہ کریں اور مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کریں۔

کبھی قرآن کہتا ہے :

" ومن احسن دینا ممن اسلم وجھہ للہ وھو محسن " (نساء / ۱۲۵)

"کس شخص کا دین اس شخص سے بہتر ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ پروردگار کے سامنے جھک گیا جبکہ وہ نیکوکار بھی ہے۔"

اصولی طور پر اسلام تسلیم کے مادہ سے لیا گیا ہے اور وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ اس بنا پر ہر شخص جس قدر حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے اسی قدر روح اسلام سے بہرہ مند ہے۔

اس سلسلے میں لوگوں کی کئی قسمیں ہیں:

ایک گروہ صرف ان امور میں فرمان حق تعالیٰ کے سامنے جھکتا ہے جن میں اس کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ مشرک ہوتے ہیں جنہوں نے اپنا نام "مسلم" رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ان کا کام "نؤمن ببعض ونکفر ببعض" کے مصداق احکام الٰہی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہوتا ہے۔ حتی کہ اگر وہ ایمان بھی لاتے ہیں تو حقیقت میں اپنے مفاد کے لیے ایمان لاتے ہیں نہ کہ حکم خدا پر۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جن کا ارادہ اور خواہش خدا کے ارادے اور خواہش کے تابع ہوتی ہے۔ جس وقت ان کے مفادات فرمان حق سے متصادم دکھائی دیتے ہیں تو وہ اپنے مفادات سے دستکش ہو کر فرمان خدا کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ یہی سچے مؤمن اور سچے مسلمان ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ مذکورہ دونوں گروہوں سے برتر اور افضل ہوتا ہے، یہ لوگ اصولی طور پر وہی کچھ چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے اور وہی ارادہ کرتے ہیں جو خدا کرتا ہے۔ یہی ان کی تمنا اور منتہائے مقصود ہوتا ہے۔ وہ اس مقام پر پہنچ چکے ہوتے ہیں کہ صرف اسی چیز کو پسند کرتے ہیں جسے خدا پسند کرتا ہے اور اس چیز سے نفرت کرتے ہیں جس سے خدا نفرت کرتا ہے۔

یہی لوگ اس کی بارگاہ کے خواص، مخلصین اور مقربین ہوتے ہیں۔ جن کا سارے کا سارا وجود رنگ توحید میں رنگا ہوتا ہے، اس کی محبت میں غرق اور اس کے جمال میں محو ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] اس سلسلہ میں ایک اور بحث بھی جلد ۳ میں سورہ نساء کی آیہ ۶۵ کے ذیل میں ہو چکی ہے۔

۳۹۔ اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا ○

ترجمہ

۳۹۔ (گذشتہ پیغمبر کہ) جو خدائی پیغامات کی تبلیغ کرتے تھے اور (صرف) اسی سے ڈرتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے اور یہی کافی ہے کہ خدا حساب لینے والا (اور ان کے اعمال کا اجر دینے والا) ہے۔

تفسیر

سچے مبلغ کون ہیں؟

پہلی زیر بحث آیت میں اس گفتگو کی مناسبت سے جو گذشتہ آیات میں سے آخری آیت میں پیغمبروں کے بارے میں گزری تھی، انبیاء کے عمومی فرائض میں سے ایک اہم ترین فرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "وہ (گذشتہ انبیاء) ایسے لوگ تھے جو خدائی پیغامات کی تبلیغ کرتے تھے اور اس سے ڈرتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے"۔ (الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ)۔

آپ کو بھی پروردگار کے پیغاموں کی تبلیغ کے سلسلے میں کسی سے ذرہ بھر بھی نہیں گھبرانا چاہیئے، خدا آپ کو حکم دیتا ہے، کہ ایک جاہلانہ رسم کو منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کر کے توڑیں اور زید کی مطلقہ بیوی زینب کے ساتھ شادی کرلیں اور اس فرض کی ادائیگی میں کسی قسم کی پریشانی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کریں، کیونکہ نہ گھبرانا پیغمبروں کی سنت ہے۔

اصولی طور پر پیغمبروں کا کام بہت سے مراحل میں اس قسم کی رسومات کو توڑنا ہے۔ اگر وہ تھوڑے سے بھی خوف اور دہشت کا مظاہرہ کریں گے تو یقیناً اپنے فرائض کی بجاآوری میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ انھیں فیصلہ کن انداز میں آگے بڑھنا چاہیئے اور بدزبان لوگوں کی نازیبا باتوں کو برداشت کرنا چاہیئے، لوگوں کی افواہوں اور شور و غوغا کرنے والے کمینہ فطرت اور مفسد لوگوں کی سازشوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہیئے۔ سب حساب و کتاب خدا کے پاس ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا

گیا ہے۔ "یہی کافی ہے کہ خدا خود بندوں کے اعمال کا محافظ، محاسب اور ان کا جزا دینے والا ہے" (وکفی باللہ حسیبا)۔

اس راہ میں انبیاء کے ایثار و قربانی کے حساب کی بھی حفاظت کرتا ہے، اس کا اجر بھی دیتا ہے اور دشمن کی نازیبا گفتگو اور یاوہ سرائی کا محاسبہ کر کے انھیں کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔

حقیقت میں "کفی باللہ حسیبا" کا جملہ اس امر کی دلیل ہے کہ خدائی رہبروں کو اپنے دین کی تبلیغ میں پریشانی اور خوف میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ان کی زحمتوں، تکلیفوں اور مشقتوں کا حساب کرنے اور جزاء دینے والا خود خدا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **"تبلیغ" سے مراد:** اس سے مراد ابلاغ اور پہنچانا ہے اور جب "تبلیغ" "رسالات اللہ" سے ربط پیدا کرے تو اس کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے وحی کے ذریعے سے پیغمبروں کو تعلیم دی ہے وہی وہ لوگوں کو تعلیم دیں اور اُسے استدلال، انذار، بشارت اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کریں۔

۲۔ **"خشیت" کا معنیٰ:** اس کا معنی ایسا خوف ہے جو تعظیم اور احترام کے ساتھ ہو۔ اس بنا پر اس کا خوف کا معنی الگ ہوگا جس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو اور کبھی کبھار یہ لفظ مطلق خوف کے معنی میں بھی آتا ہے۔

محقق طوسیؒ کی بعض تالیفات میں ان دو الفاظ کے فرق کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جو درحقیقت اس کے عرفانی معنی کی غماز ہے نہ کہ اس کے لغوی معنی کی۔ وہ کہتے ہیں "خشیت اور خوف" اگرچہ لغت میں ایک ہی معنی (یا تقریباً ایک معنی) میں ہیں۔ لیکن صاحب دل افراد کے نزدیک ان دونوں کے درمیان فرق ہے اور وہ یہ کہ "خوف" اس مجازات اور سزا سے باطنی خلش اور پریشانی کے معنی میں ہے کہ انسان گناہ کے ارتکاب یا اطاعت میں کوتاہی کی وجہ سے جس کی توقع رکھتا ہے اور یہ کیفیت اکثر لوگوں کی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے مراتب بہت مختلف ہیں اور اس کا اعلیٰ مرتبہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

لیکن "خشیت" ایک ایسی کیفیت ہے جو خدا کی عظمت اور اس کی ہیبت کے ادراک اور اس کے فیض کے انوار سے دور اور محروم رہنے کے خوف سے کسی انسان پر طاری ہو جاتی ہے اور یہ ایسی حالت ہے جو سوائے ان لوگوں کے جو ذات پاک کی عظمت اور اس کے مقام کبریائی سے واقف ہیں اور انھوں نے اس کے قرب کی لذت چکھی ہوئی ہو، کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے قرآن نے اس حالت کو عالم اور آگاہ بندوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور کہا ہے:

"انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء"

"اللہ سے خشیت کرنے والے بس علماء ہی ہیں۔" [1]

۳۔ **ایک سوال کا جواب:** ہو سکتا ہے، کہا جائے کہ یہ آیت اس گذشتہ جملے کی متضاد ہے جو گذشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے، کیونکہ یہاں ہے کہ خدا کے انبیاء صرف خدا ہی سے ڈرتے ہیں کسی اور

---

[1] مجمع البحرین مادہ "خشیت"۔

سے نہیں ڈرتے جبکہ گذشتہ آیات میں ہے کہ تم اپنے دل میں ایسی چیز چھپائے ہوئے تھے جسے خدا نے آشکار کر دیا۔ تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ تمہیں خدا سے ڈرنا چاہیے "وتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ"

لیکن دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

پہلا یہ کہ اگر جناب پیغمبرؐ کو کسی قسم کا خوف تھا تو وہ صرف اس بناء پر کہ مبادا اس رسم کو توڑنا بہت سے لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے ایمان میں مبانی اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جائیں۔ درحقیقت اس قسم کی خشیت کی بازگشت خوفِ خدا کی طرف ہوتی ہے۔

دوسرا یہ کہ انبیاء کرام خدائی پیغام کی تبلیغ میں ہرگز خوف اور دہشت کا شکار نہیں ہوتے لیکن اپنے ذاتی اور مخصوص مسائل میں ایسے خطرناک حالات سے دوچار ہونے کے وقت خوف و اضطراب کے اظہار میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے لوگوں کی زبانوں کے زخم یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح عصا کے اژدہا بن جانے کے بعد اضطراب کا اظہار، کیونکہ انسانی فطرت کے تقاضوں کے پیشِ نظر خوف اور دہشت کا اظہار اگر درجہ افراط کو نہ پہنچے تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے، شجاع ترین افراد بھی اپنی زندگی میں اس قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ معیوب خوف تو وہ ہوتا ہے جو اجتماعی زندگی میں خدائی فریضہ کی انجام دہی اور ذمہ داریوں کے نبھانے کے وقت پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ کیا انبیاء بھی تقیہ کرتے ہیں؟

کچھ لوگوں نے زیرِ بحث آیت سے یہ سمجھا ہے کہ انبیاء کے لیے تبلیغِ رسالت کے فریضے میں تقیہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے "ولا یخشون احدًا الا اللہ"

لیکن توجہ رکھنا چاہیئے کہ "تقیہ" کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ایک قسم کا نام "تقیہ خونی" ہے جس کی مذکورہ بالا آیت میں انبیاءؑ کی دعوت اور ابلاغِ رسالت کے سلسلے میں نفی کی گئی ہے۔ لیکن تقیہ کی کچھ اور اقسام بھی ہیں جن میں سے ایک "تقیہ تحبیبی" اور "پوشش" ہے اور "تقیہ تحبیبی" سے مراد یہ ہے کہ انسان کبھی فریقِ مخالف کا دل جیتنے کے لیے اپنے عقیدے کو چھپاتا ہے تاکہ اسے فکری و نظری طور پر اپنا ہم نوا بنا سکے۔

اور "تقیہ پوشش" سے مراد یہ ہے کہ کبھی ہدف اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے منصوبوں اور ان کے مقدمات کو چھپایا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ عام ہو جائیں اور دشمن ان سے آگاہ ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ منصوبے ناکام ہو جائیں۔

انبیاء اکرامؑ خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کی زندگی تقیہ کی اس قسم سے بھری پڑی ہے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ بہت سے مواقع پر جب آپؐ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوتے تو اپنے مقصد کو مخفی رکھتے، جنگ کے تمام منصوبے مکمل طور پر معرضِ خفا میں رہتے اور استتار کا انداز یعنی مقصد کو چھپائے رکھنا جو تقیہ کی ایک قسم ہے، تمام مراحل میں نافذ ہوتا۔

بعض اوقات کسی حکم کے بیان کرنے میں ایک مرحلہ وار روش سے بھی استفادہ کرتے جو تقیہ کی ایک قسم ہے، مثلاً "تحریم ربا" (سود کی حرمت) اور "شرب خمر" (شراب پینے) کا مسئلہ ہے تو یہ ایک ہی مرحلہ میں بیان نہیں ہوئے، بلکہ فرمانِ الٰہی سے کئی مراحل میں صورت پذیر ہوئے ہیں۔ یعنی زیادہ ہلکے مرحلے سے شروع ہو کر اپنے آخری اور اصلی حکم تک جا پہنچے۔

بہر حال تقیہ کا ایک بہت ہی وسیع معنی ہے یعنی "مقصد کے حصول کو خطرے میں پڑنے سے بچانے کے لیے حقیقت کو چھپانا" اور یہ ایسی چیز ہے، جسے تمام عقلائے عالم نے اپنایا ہوا ہے اور خدائی رہبر اپنے مقدس مشن کو کامیاب کرنے کے لیے کئی مراحل پر اپناتے ہیں۔ جبکہ توحید کے سپید و حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں ہے کہ جس دن بت پرست لوگ عید کے مراسم کی ادائیگی کے لیے شہر سے باہر جا رہے تھے تو آپ نے اپنے مقصد کو مخفی رکھا تاکہ موقع سے فائدہ اٹھا کر بتوں کو پاش پاش کر دیں۔

نیز "مومن آل فرعون" نے حساس مواقع پر حضرت موسیٰؑ کی مدد کرنے اور انھیں قتل ہونے سے بچانے کے لیے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا جس کی وجہ سے قرآن نے انھیں عظمت کے ساتھ یاد کیا ہے۔

بہر حال صرف "خوف والا تقیہ" ہی پیغمبروں کے لیے جائز نہیں نہ کہ تقیہ کی دوسری اقسام بھی۔

اگرچہ اس سلسلے میں بہت سے سخن ہائے گفتنی ہیں لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک جامع فرمان کے ساتھ اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"التقیۃ دینی ودین ابائی، ولا دین لمن لا تقیۃ لہ والتقیۃ ترس اللہ فی الارض، لان مؤمن آل فرعون لو اظہر الاسلام لقتل"۔

"تقیہ میرا اور میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔ جو شخص تقیہ نہیں کرتا اس کا دین نہیں ہے۔ تقیہ خدا کی مضبوط ڈھال ہے کیونکہ اگر مومن آل فرعون اپنے ایمان کو ظاہر کرتے تو یقیناً قتل ہو جاتے (خطرہ کی صورت میں دین موسیٰؑ کی حفاظت کے سلسلے میں پیغام حق کا فریضہ انجام نہ پا سکتا)۔[1]

تقیہ کے بارے میں ہم تفصیلی بحث جلد نمبر ۱۱ میں سورہ نحل کی آیت نمبر ۱۰۶ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

۵۔ تبلیغی امور میں کامیابی کی شرط:

اوپر والی آیت اس امر کی واضح دلیل ہے کہ تبلیغی مسائل میں ترقی کے لیے بنیادی شرط قاطعیت، خلوص اور خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈرنا ہے۔

جو لوگ خدائی امور کے مقابلہ میں ہر کہ ومہ کی خواہشات اور مختلف گروہوں کے بے بنیاد رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنی ناشائستہ تاویلوں کے ذریعے حق و عدالت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ کبھی بنیادی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ کوئی نعمت ہدایت کی نعمت سے بڑھ کر نہیں ہے اور کوئی خدمت اس نعمت کو کسی انسان کو دینے سے افضل نہیں ہے۔ اسی بنا پر اس کا اجر و ثواب سب سے برتر ہے ——— ہم ایک حدیث میں امیر المومنین سے پڑھتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا کہ:

"جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا، جب تک کسی کو حق کی دعوت نہ دے دیں، اس وقت تک جنگ نہ کرنا"۔

"وایم اللہ لئن یھدی اللہ علی یدیک رجلاً خیر مما طلعت الشمس وغربت"۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۵۲۱ سورہ مومن کی آیت ۲۸ کے ذیل میں۔

"یعنی خدا کی قسم اگر تمہارے ہاتھوں ایک شخص کو ہدایت مل جائے تو یہ تمہارے لیے ان تمام چیزوں سے بدرجہا بہتر ہے جن پر سورج طلوع وغروب کرتا ہے"۔ [1]

اس لیے ضروری ہے کہ سچے مبلغین لوگوں سے بے نیاز اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے دار سے بے خوف ہو کر اپنا فریضہ تبلیغ انجام دیں۔ کیونکہ "نیاز" اور "خوف" ہی ان کے افکار وارادہ پر ہر حالت میں اثر انداز ہوں گے۔

ایک مبلغ ربانی "وکفیٰ باللہ حسیبا" کے تقاضوں کے پیش نظر صرف یہ سوچتا ہے کہ اس کے اعمال کا حساب لینے والا صرف خدا ہے۔ اور یہی عرفان وآگاہی اسے اس نشیب فراز والے راستے میں مدد دیتی ہے۔

---

[1] کافی منقول از بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۳۶۱

۴۰۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ۝

ترجمہ

۴۰۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم و آخری پیغمبر ہیں۔ اور خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

ختم نبوّت:

یہ آیت اس سلسلہ کی گفتگو کی آخری کڑی ہے جو دمانہ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کے لیے خدا نے زید کی مطلقہ بیوی سے پیغمبر اکرمؐ کے عقد کے بارے میں بیان فرمائی ہے اور آخری جواب کے طور پر ایک مختصر لیکن چبھتا جواب دیا گیا ہے۔ ضمنی طور پر ایک اور اہم حقیقت کو ایک خاص مناسبت کی بناء پر ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے "ختم نبوت" کا مسئلہ۔

پہلے فرمایا گیا ہے۔ "محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں" (ما کان محمد ابا احد من رجالکم)۔

نہ زید کے اور نہ کسی اور کے۔ اگر کسی دن لوگوں نے اسے محمد کے بیٹے کا نام دیا ہے تو یہ صرف ایک عادت اور دنیاوی رسم و رواج کے مطابق تھا، جسے اسلام کے آنے اور قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد ختم کر دیا گیا ہے، یہ فطری اور قرابت داری کا رابطہ نہیں ہے، البتہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی بیٹے بھی تھے، جن کا نام "قاسم" "طیب" "طاہر" اور "ابراہیم" تھا۔ لیکن مؤرخین کے مطابق وہ سب بالغ ہونے سے پہلے ہی دنیا سے چل بسے۔ لہٰذا "رجال" (مردوں) کا نام ان پر صادق نہیں آتا۔[1]

---

[1] تفسیر قرطبی، و تفسیر المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو بھی فرزند رسول کہہ کر پکارا جاتا تھا، اگرچہ وہ بالغ بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اس آیت کے نزول کے وقت ابھی بچے تھے، اسی بناء پر "ماکان محمد ابا احد من رجالکم" کا جملہ فعل ماضی میں آیا ہے اور قطعی طور پر اس وقت سب کے حق میں صادق آتا ہے۔

اور اگر بعض تعبیرات میں خود پیغمبر اکرم سے منقول ہے:

"انا وعلی ابوا ھذہ الامۃ"

میں اور علی اس امت کے باپ ہیں۔

تو یقیناً اس سے مراد نسبی باپ نہیں، بلکہ یہ رشتہ تعلیم و تربیت اور رہبری کی بنیاد پر ہے۔

ان حالات میں زید کی مطلقہ بیوی سے شادی جس کا فلسفہ قرآن نے صراحت کے ساتھ غلط رسوم کو توڑنا بیان فرمایا ہے، کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے موضوع بحث بنا کر ہر کوئی اس کے خلاف لب کشائی کرے یا اسے اپنے غلط مقاصد کے لیے کوئی دستاویز بنائے۔

آگے چل کر مزید فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر کا رابطہ تمام سے صرف رسالت اور خاتمیت کی بناء پر ہے کیونکہ "وہ خدا کے رسول اور خاتم النبیین ہیں: (ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین)۔

اسی بناء پر آیت کی ابتداء کلی طور پر نسبی رابطے کو منقطع کرتی ہے اور اس کی انتہا اس معنوی رابطے کو ثابت کرتی ہے جو رسالت اور خاتمیت سے پیدا ہوتا ہے اور یہاں سے ہی آیت کے آغاز اور اختتام کا تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے ہٹ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ باوجودیکہ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، لیکن ان کا تعلق باپ کے بیٹے کے ساتھ تعلق سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ آپ کا تعلق ایک رسول کی حیثیت سے ہے جو امت کے ساتھ ہوتا ہے اور رسول بھی ایسا جو جانتا ہے کہ پھر کوئی پیغمبر نہیں آئے گا، لہذا قیامت تک کی جو ضرورتیں اُمت کو درپیش آسکتی ہیں، اچھی طرح سے اور انتہائی دل سوزی کے ساتھ انھیں پورا کرتا ہے۔

البتہ عالم اور آگاہ خدا نے بھی وہ تمام چیزیں جو اس سلسلے میں ضروری تھیں، آپ کے اختیار میں دے دیں، خواہ وہ اصولی ہوں یا فروعی، کلی ہوں یا جزئی۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "خدا ہر چیز سے عالم اور آگاہ تھا اور ہے" (وکان اللہ بکل شیء علیما)۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "خاتم الانبیاء" کا معنی "خاتم المرسلین" بھی ہے۔ موجودہ دور کے نیادین گھڑنے والے افراد مسئلہ ختم نبوت کو مخدوش کرنے کے لیے یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ قرآن نے سرکار رسالت مآبؐ کو "خاتم الانبیاء" کہا ہے "خاتم المرسلین" نہیں کہا، حالانکہ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے کیونکہ رسالت کا درجہ نبوت کے درجہ سے بالاتر ہے۔ (غور کیجیے گا)

ٹھیک اسی طرح جیسے ہم کہیں کہ فلاں شخص سرزمین حجاز میں نہیں ہے تو یقیناً وہ مکہ میں بھی نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ وہ مکہ میں نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ حجاز کے کسی اور علاقہ میں ہو۔ اسی بناء پر اگر حضور گرامی کو "خاتم المرسلین" کا نام دیا جاتا تو تصور میں آسکتا تھا کہ شاید وہ خاتم الانبیاء نہ ہوں، لیکن جب فرمایا گیا ہے کہ وہ "خاتم الانبیاء" ہیں تو یقیناً خاتم المرسلین بھی ہیں۔ اور منطقی اصطلاح کے لحاظ سے "رسول" اور "نبی" کے درمیان "عام خاص مطلق" کی نسبت ہے۔

(ایک بار پھر غور کیجیے گا)

چند اہم نکات

۱۔ "خاتم" کیا ہے؟

"خاتم" (بر وزن حاتم) ارباب لغت کی تصریحات کے مطابق اس چیز کے معنی میں ہے جس کے ذریعہ کسی چیز کو ختم کیا جائے یا جس سے کاغذات وغیرہ کی مہر لگائی جائے۔

قدیم زمانے سے یہ معمول چلا آرہا ہے کہ جس وقت کسی خط یا برتن یا گھر کے دروازہ کو بند کیا جاتا ہے تاکہ کوئی اسے کھول نہ سکے تو دروازے یا قفل (یا تالے) کے اوپر گوند جیسا مادہ رکھ کر اس پر مہر لگا دیتے ہیں، جسے موجودہ زمانے میں "لاکھ اور مہر" کہتے ہیں۔

یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے کھولنے کے لیے یقیناً لاکھ اور مہر کو توڑا جائے۔ اور جو مہر اس قسم کی چیزوں پر لگائی جاتی ہے اسے "خاتم" کہتے ہیں۔ چونکہ گذشتہ زمانے میں اس مقصد کے لیے کبھی کبھی سخت اور چکنی مٹی سے استفادہ ہوتا تھا لہٰذا لغت کی مشہور کتب میں "خاتم" کے معنی میں لکھا گیا ہے کہ "ما یوضع علی الطینۃ" یعنی جو چیز مٹی پر لگائی جائے۔[1]

یہ سب کچھ اس بناء پر ہے کہ یہ لفظ "ختم" کی اصل سے "اختتام" کے معنی میں لیا گیا ہے اور چونکہ مہر لگانے کا کام خاتمے اور آخر پر قرار پاتا ہے لہٰذا "خاتم" کا نام اس وسیلے اور ذریعے کو دیا گیا ہے۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ "خاتم" کا ایک معنی انگوٹھی ہے تو وہ بھی اسی بناء پر ہے کہ بہت سے لوگ اپنی مہر کے نقوش اپنی انگوٹھیوں پر کندہ کرتے تھے اور انگوٹھی کے ذریعہ ہی خطوط وغیرہ پر مہر لگا دیتے تھے۔ اسی لیے پیغمبر اسلام، آئمہ ہدیٰ اور دوسری شخصیتوں کے حالات کے ضمن میں ان کی انگوٹھی کے نقش کی گفتگو بھی ہوتی ہے۔ مرحوم کلینی نے کتاب "کافی" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے:

"ان خاتم رسول اللہ کان من فضۃ نقشہ محمد رسول اللہ"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگوٹھی چاندی کی تھی جس کا نقش "محمد رسول اللہ" تھا۔"[2]

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ چھٹی ہجری کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لیے نقش والی انگوٹھی بنوائی اور یہ اس لیے تھا کہ آپ سے صحابہؓ نے عرض کیا کہ بادشاہ ایسے خطوط کو نہیں پڑھتے "جو مہر کے بغیر ہوتے ہیں۔"[3]

کتاب "طبقات" میں بھی آیا ہے کہ جس وقت پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو وسعت دینے اور روئے زمین کے سلاطین کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو حکم دیا کہ آپ کے لیے انگوٹھی تیار کی جائے جس پر "محمد رسول اللہ" کندہ ہو۔ چنانچہ آپ اپنے خطوط پر اسی سے مہر لگاتے تھے۔[4]

---

[1] لسان العرب اور قاموس اللغۃ "مادہ ختم" "الخاتم ما یوضع علی الطینۃ" "خاتم" وہ چیز ہوتی ہے جو گیلی مٹی پر لگائی جاتی ہے۔

[2] اس روایت کو بیہقی نے بھی سنن کی جلد ۱، ص ۱۳۰ میں نقل کیا ہے۔

[3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۳۰۰۔

[4] طبقات کبریٰ جلد ۱ ص ۲۵۰۔

اس بیان سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ خاتم کا موجودہ زمانے میں اگرچہ زینت اور زیور کے طور پر انگوٹھی پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن اس کی اصل "ختم" سے لی گئی ہے جو "انتہا" کے معنی میں ہے اور اس زمانے میں ان انگوٹھیوں کو کہا جاتا تھا جن سے خطوط پر مہر لگاتے تھے۔

علاوہ ازیں یہ مادہ قرآن مجید میں بھی متعدد مواقع پر استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ ختم کرنے اور مہر لگانے کے معنی میں ہے۔ مثلاً:

"الیوم نختم علی افواھھم وتکلمنا ایدیھم" (یٰسٓ/ ۶۵)

آج (قیامت کے دن) ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے گفتگو کریں گے"۔

یا

"ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ"

"خدا نے ان (منافقین) کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے (اس لحاظ سے کوئی نصیحت اس پر اثر نہیں کرتی) اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے"۔ (بقرہ/ ۷)

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت اور آپ پر سلسلۂ انبیاءؑ ختم ہونے کے بارے میں زیر بحث آیت کی دلالت میں وسوسہ ڈالا ہے یا تو بالکل اس لفظ کے معنی سے بے خبر تھے یا پھر تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ورنہ جو شخص عربی ادب سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ لفظ "خاتم النبیین" واضح طور پر ختم نبوت پر دلالت کرتا ہے۔

اس صورت میں اگر اس تفسیر کے علاوہ آیت کی کوئی تفسیر کی جائے تو سبک، ہلکا اور بچگانہ مفہوم پیدا کرے گی۔ مثلاً اگر یہ کہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے انبیاء کی انگوٹھی تھے، یعنی پیغمبروں کی زینت شمار ہوتے تھے تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ انگوٹھی انسان کا ایک عام زینتی زیور ہوتی ہے جو کبھی بھی انسان کے برابر اور ہم پلہ قرار نہیں پا سکتی۔ لہٰذا اگر آیت کی یہ تفسیر کریں گے تو پیغمبر اسلام کو ان کے مقام و مرتبہ سے بہت گرا دیں گے۔ اس کے علاوہ یہ معنی لغت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی لیے تو یہ لفظ پورے قرآن میں آٹھ مقام پر جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے، ہر جگہ "ختم کرنے" اور "مہر لگانے" کے معنی میں آیا ہے۔

۲۔ ختم نبوت کے دلائل: مندرجہ بالا آیت اگرچہ اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کی دلیل اسی پر منحصر نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی دوسری آیات بھی اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور روایات تو کثرت سے موجود ہیں۔ منجملہ ان کے سورۂ انعام کی آیت ۱۹ میں ہم پڑھتے ہیں:

"واوحی الیٰ ھٰذا القراٰن لانذرکم بہ ومن بلغ"

"یہ قرآن مجھ پر وحی ہوا ہے تاکہ تمہیں اور ان دوسرے لوگوں کو جن تک یہ قرآن پہنچے میں ڈراؤں" (اور خدا کی طرف دعوت دوں)۔

"ومن بلغ" (تمام وہ لوگ جن تک یہ بات پہنچے) کی تعبیر کے مفہوم کی وسعت ایک طرف تو قرآن مجید اور پیغمبر اسلامؐ کی عالمی رسالت کو واضح کرتی ہے اور دوسری طرف ختم نبوت کو۔

دوسری آیات جو پیغمبر گرامی قدر کی عالمین کے لیے عمومی دعوت کو ثابت کرتی ہیں مثلاً:

"تبارك الذي نزل الفرقان على عبده ليكون للعالمين نذيرا"

"جاوید اور بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ تمام اہل عالم کو ڈرائے"

اور مثلاً (فرقان / ۱)

"وما ارسلناك الا كافة للناس بشيرا ونذيرا" (سبا / ۲۸)

"ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر (تاکہ لوگوں کو جنت کی خوش خبری دیں اور جہنم سے ڈرائیں)

اور ارشاد الٰہی ہے:

"قل يا ايها الناس اني رسول الله اليكم جميعا"

"اے پیغمبرؐ! کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا ہوں"۔ (اعراف / ۱۵۸)

"عالمین" "ناس" اور "کافۃ" کے مفہوم کی وسعت بھی اس معنی کی مؤید ہے، اس سے قطع نظر کہ ایک تو اس پر علماء اسلام کا اجماع ہے، دوسرے یہ مسئلہ ضروریات دین میں سے ہے اور تیسرے پیغمبر اسلام اور دیگر پیشواؤں سے کثرت سے روایات ملتی ہیں جو اس مطلب کو بہت واضح کرتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ہم ذیل کی چند روایات کو ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہم پیغمبر اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث میں پڑھتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا ہے:

- حلالي حلال الى يوم القيامة وحرامي حرام الى يوم القيامة"

"میرا حلال قیامت تک حلال ہے اور میرا حرام قیامت کے دن تک حرام ہے"۔[1]

یہ تعبیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے شریعت محمدیؐ بھی قائم و برقرار ہے۔

بعض مقامات پر مذکورہ بالا حدیث یوں بھی نقل ہوئی ہے:

"حلال محمد حلال ابدا الى يوم القيامة وحرامه حرام ابدا الى يوم القيامة لا يكون غيره ولا يجيء غيره"

"حلال محمدؐ ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک حلال ہے اور آپؐ کا حرام کیا ہوا، ہمیشہ کے لئے قیامت کے دن تک حرام ہے۔ اس کے علاوہ نہ کچھ ہوگا اور نہ ہی کوئی آئے گا۔[2]

۲۔ مشہور حدیث "منزلت" جو اہل تشیع اور اہل سنت کی مختلف کتابوں میں حضرت علیؑ کے بارے میں وارد ہوئی ہے اس کے مطابق جب آنحضرتؐ جنگ تبوک میں شرکت کے لیے تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت علیؑ کو مدینہ میں اپنی جگہ اپنا نائب بنایا تھا تو یہ حدیث مسئلہ خاتمیت کو بھی مکمل طور پر واضح کرتی ہے، کیونکہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۰۰، صفحہ ۳۱۰، باب ۳، حدیث ۱۷۔

[2] اصول کافی جلد اول، باب البدع والرأی والمقائیس، حدیث ۱۹۔

"انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی"

"یا علی! تم میرے نزدیک وہی منزلت رکھتے ہو جو ہارون کو موسیٰ سے تھی لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے (اسی بنا پر تمہارے پاس سوائے نبوت کے ہارون کے باقی تمام مناصب موجود ہیں)"[1]

۳۔ یہ حدیث بھی مشہور ہے اور اہل سنت کے بہت سے منابع میں نقل ہوئی ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا:

"مثلی ومثل الانبیاء کمثل رجل بنی بنیانا فاحسنه واجمله فجعل الناس یطیفون به یقولون ما رأینا بنیانا احسن من هذا الا هذه اللبنة، فکنت انا تلک اللبنة"

"گزشتہ انبیاؑ کے مقابلے میں میری مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بہت ہی خوبصورت اور دلکش مکان تعمیر کرے، لوگ اس کے گرد چکر لگائیں اور کہیں کہ اس سے بہتر کوئی عمارت نہیں، لیکن اس کی صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے اور میں وہی آخری اینٹ ہوں"

یہ حدیث صحیح مسلم میں مختلف عبارتوں اور متعدد راویوں سے نقل ہوئی ہے یہاں تک کہ ایک جگہ پر اس کے ذیل میں ایک جملہ یہ بھی آیا ہے:

"وانا خاتم النبیین"

"میں خاتم الانبیاء ہوں"

ایک اور حدیث کے ذیل میں یہ جملہ بھی آیا ہے:

"جئت فختمت الانبیاء"

"میں آیا اور انبیاؑ ختم ہو گئے"[2]

نیز یہ صحیح بخاری (کتاب المناقب) میں مسند احمد ابن حنبل، سنن ترمذی، سنن نسائی اور کئی دوسری کتب میں منقول ہے اور نہایت ہی مشہور و معروف احادیث میں سے ہے۔ اسے شیعہ مفسرین، مثلاً مرحوم طبرسی اور اہل سنت مفسرین جیسے مرحوم قرطبی نے اپنی تفاسیر میں زیر بحث آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے۔

۴۔ نہج البلاغہ کے بہت سے خطبات میں بھی ختم نبوت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جن میں سے خطبہ نمبر ۱۷۳ ہے جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یوں تعریف و توصیف کی گئی ہے:

---

[1] اس حدیث کو محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ ص ۷۹ (مطبوعہ مکتبۃ القدس) میں ابن حجر نے صواعق محرقہ ص ۱۰۰ (مطبوعہ مکتبۃ القاہرہ) میں تاریخ بغداد جلد ۷ ص ۲۵۲ (مطبوعہ السعادۃ) میں اور دوسری کتب مثلاً کنز العمال، منتخب کنز العمال اور ینابیع المودۃ میں بھی نقل کیا ہے (حدیث منزلت کے سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۵ میں سورۂ اعراف آیت نمبر ۱۴۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] صحیح مسلم جلد ۴ ص ۱۷۹۰ و ص ۱۷۹۱ (باب ذکر کونہ خاتم النبیین ازکیٰ بالفضائل)۔

" امین وحیہ وخاتم رسلہ وبشیر رحمتہ ونذیر نقمتہ "

۱۵۱ حضرت محمد مصطفیٰ وحی خدا کے امین، پیغمبروں کے خاتم، رحمت کی بشارت دینے والے اور اس کے عذاب سے ڈرانے والے تھے۔

نیز خطبہ نمبر ۱۴۳ میں یوں فرمایا ہے:

" ارسلہ علی حین فترۃ من الرسل، وتنازع من الالسن، فقفی بہ الرسل و ختم بہ الوحی "

" خدا نے انھیں گذشتہ انبیاء کے دور فترت کے بعد بھیجا، ایسے وقت میں جب مختلف مذاہب کے درمیان نزاع اور جھگڑا پیدا ہو گیا تھا، پس اللہ نے آپ کے ذریعے نبوت کی تکمیل فرمائی اور آپ ہی کے ذریعے وحی کو ختم کیا۔"

اور نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں گزشتہ انبیاء و مرسلین کے لائحہ عمل کو ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"الی ان بعث اللہ سبحانہ محمداً رسول اللہ لانجاز عدتہ و اتمام نبوتہ"

" یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ وسبحانہ نے اپنے رسول حضرت محمدؐ کو اپنے وعدوں کی تکمیل اور سلسلہ نبوت کو ختم کرنے کے لیے مبعوث فرمایا۔"

۵۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کے آخری حج اور آخری سال میں ایک جامع وصیت نامہ کی صورت میں لوگوں سے جو خطبہ بیان فرمایا، اس میں بھی ختم نبوت کے مسئلے کو صراحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

" الا فلیبلغ شاھدکم غائبکم لانبی بعدی ولا امۃ بعدکم"

حاضرین غائبین تک یہ بات ضرور پہنچا دیں کہ نہ تو میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ ہی تمھارے بعد کوئی اُمت۔

پھر آپؐ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اس حد تک بلند کیے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور بارگاہ خدا میں عرض کیا:

" اللھم اشھد انی قد بلغت "

" خدایا گواہ رہنا کہ مجھے جو کچھ کہنا چاہیئے تھا کہہ دیا ہے۔" [1]

۶۔ ایک اور حدیث میں جو کتاب کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، اس میں ہے:

" ان اللہ ختم بنبیکم النبیین فلا نبی بعدہ ابداً وختم

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۱ صفحہ ۳۹۱۔

بکتابکم الکتب فلا کتاب بعدہ ابدا۔"

"خدا نے تمہارے پیغمبرؐ کے ذریعے سلسلہ انبیاء کو ختم کر دیا ہے۔ اس بناء پر ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اور تمہاری آسمانی کتاب کے ساتھ آسمانی کتابوں کا سلسلہ ختم کر دیا ہے، لہٰذا اس کے بعد ہرگز کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی"[1]

اسلامی ماخذ میں اس سلسلے کی بہت زیادہ احادیث میں یہاں تک کہ کتاب "معالم النبوۃ" میں ۱۲۵ احادیث علماء اسلام کی کتب سے جمع کی گئی ہیں جو پیغمبر اور اسلام کے بزرگ پیشواؤں کی طرف سے اس سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں۔[2]

۳۔ چند سوال اور ان کے جواب:

ختم نبوت کے سلسلے میں مختلف سوالات پیش آتے ہیں جن کا ہم ذیل میں جائزہ لیں گے۔

۱۔ ختم نبوت، ارتقاء سے کیونکر ہم آہنگ ہے؟ پہلا سوال جو اس بحث میں سامنے آتا ہے کہ آیا ممکن ہے، انسانی معاشرہ متوقف ہو جائے اور کسی خاص منزل پر جا کر رک جائے؟ کیا انسانی تکامل اور ارتقاء کی کوئی حد و حساب بھی ہے یا نہیں؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے کہ موجودہ زمانے کے انسان گزشتہ دور کے لوگوں سے علم و دانش اور تمدن و ثقافت کے اعتبار سے فائق ہیں؟

تو ان حالات میں کیونکر ممکن ہے کہ دفتر نبوت کلی طور پر بند کر دیا جائے اور انسان اپنے ارتقائی مراحل میں نئے پیغمبروں کی رہبری سے محروم کر دیا جائے؟

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کبھی انسان اپنے فکر و تمدن کے بلوغ کے اس مرحلہ تک پہنچ سکتا ہے کہ آخری نبی، جو جامع اصول اور تعلیمات اسے دے، ان کی روشنی میں اسے کسی نئی شریعت کی ضرورت نہ رہے، بلکہ انہی اصولوں سے مسلسل استفادہ کرنے سے وہ اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔

بعینہٖ اس طرح جس طرح انسان تعلیم کے مختلف شعبوں میں نئے معلم اور مربی کا محتاج ہوتا ہے تاکہ مختلف تعلیمی ادوار کو گزار سکے لیکن جب ڈاکٹریٹ کے مرحلے تک پہنچ جاتا ہے اور کسی ایک علم یا چند علوم میں صاحب نظر مجتہد اور ماہر ہو جاتا ہے تو پھر اس منزل پر تعلیم جاری رکھنے کے لیے اسے نئے استاد کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس تعلیم کے بل بوتے پر اپنی تحقیقات میں لگا رہتا ہے جو سابقہ استادوں خاص کر آخری استاد کے پاس سے حاصل کی تھی۔ اس طرح سے وہ اپنے ارتقاء کے مراحل کو طے کرتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں راستے کی مشکلات کو ان کلی اصولوں کے ذریعہ حل کرتا رہتا ہے جو اس نے آخری استاد سے حاصل کیے تھے۔ اس بناء پر یہ ضروری نہیں ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ نت نیا دین آتا رہے، (غور کیجئے گا)

بالفاظ دیگر گزشتہ انبیاء میں سے ہر ایک نے انسان کے ارتقاء کے لیے کچھ نقشے اسے بتائے ہیں تاکہ وہ اس نشیب و فراز والے رستوں میں پیش رفت کر سکے، حتیٰ کہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور تک اس میں ایسی اہلیت اور لیاقت پیدا ہو

---

[1] اصول کافی جلد اول۔

[2] "معالم النبوۃ" "فصوص خاتمیت"۔

کہ اس آخری پیغمبرؐ کے لیے خدا کی طرف سے ایک مکمل اور جامع ترین نقشہ مل گیا جس کے ذریعے وہ راستے کی مشکلات کو حل کر سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک جامع اور مکمل نقشہ ہوتے ہوئے کسی دوسرے نقشے کی ضرورت نہیں رہتی اور یہ حقیقتاً اس تعبیر کا بیان یا وضاحت ہے جو ختم نبوت کے بارے میں روایات آئی ہیں، جن میں آنحضرتؐ کو قصرِ رسالت کی آخری اینٹ یا اس آخری اینٹ کا رکھنے والا بتایا گیا ہے۔

یہ سب دلائل تو کسی نئے دین کی نفی کے سلسلے میں تھے، رہا رہبری اور امامت کا مسئلہ جو ان قوانین اور اصول کے نفاذ کی مکمل نگرانی اور راہ ہدایت کے لیے لوگوں کی دستگیری کا نام ہے تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور اس سے انسان کسی بھی وقت بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے سلسلۂ نبوت کے خاتمے سے سلسلۂ امامت ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ ان اصولوں کی تشریح اور وضاحت اور انھیں ظاہری وجود عطا کرنے کے لیے امامت کی بہرحال ضرورت ہے جس سے استفادہ خدا کے کسی معصوم پیشوا اور رہبر کے بغیر ناممکن ہے۔

۲۔ ثابت قانون اور بدلتی ضرورتیں: پہلے سوال میں پیش ہونے والے نظریۂ ارتقاء سے قطع نظر یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک جانتا ہے کہ مختلف زمان اور مکان کے تقاضے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی ضروریات ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، جبکہ خاتم الانبیاءؐ کی شریعت کے قوانین ثابت اور لازوال ہیں، تو کیا یہ قوانین ہر دور کے انسان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا بھی اچھی طرح جواب دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر تمام اسلامی قوانین جزوی حیثیت کے حامل ہوتے اور ہر موضوع کے لیے علیحدہ علیحدہ جزوی احکام معین کیے ہوتے پھر تو اس سوال کی گنجائش تھی، لیکن چونکہ اسلام میں کچھ ایسے احکام بھی ہیں جن کے اصول کلی اور نہایت ہی وسیع دائرہ کے حامل ہیں جو بدلتی ہوئی ضروریات اور ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لہٰذا اس قسم کے اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

مثلاً زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے درمیان قانونی رابطے بڑھ رہے ہیں اور ہر روز نئے نئے معاہدے وجود میں آ رہے ہیں جن کا قرآن کے نزول کے وقت بالکل وجود نہیں تھا، مثلاً اس زمانے میں "بیمہ" نام کی کوئی چیز نہیں تھی جس کی آج ایک نہیں، بلکہ کئی قسمیں ہیں۔[1]

اسی طرح مختلف قسم کی کمپنیاں ہیں جو موجودہ دور میں ضروریاتِ زمانہ کے تحت معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسلام میں ایک کلی اصول موجود ہے جو سورۂ مائدہ کی ابتدا میں "معاہدوں پر عمل کرنا ضروری ہے" کی صورت میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] البتہ اسلام میں بیمہ سے ملتے جلتے کئی ایک موضوع موجود ہیں، جو ایک خاص حد میں محدود ہیں، جیسے "ضامن جریرہ" کا مسئلہ ہے (قتل خطائے محض کی دیت کا عاقلہ (خاص قسم کے رشتہ داروں) سے متعلق ہونا) لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ اس مسئلے سے صرف ملتا جلتا ہے۔

"یا ایھا الذین اٰمنوا اوفوا بالعقود"

"اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے معاہدوں پر عمل کرو"

یہ حکم ہر قسم کے باہمی معاہدوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ البتہ اس کلی اصول کے لیے اسلام نے کچھ کلی شرائط بھی مقرر کی ہیں جنھیں مدنظر رکھنا ہوگا۔

اس بنا پر اس سلسلے میں ایک ثابت اور پائیدار کلیہ موجود ہے۔ اگرچہ اس کے مصادیق بدلتے رہتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ہر روز اس کا ایک نیا مصداق مل جائے۔

دوسری مثال اسلام میں "قانون لاضرر" کے نام سے ایک مسلم قانون موجود ہے اور اسلامی معاشرہ میں جو حکم بھی کسی کے لیے ضرر اور نقصان کا سبب بن رہا ہو، اس قانون کے ذریعے اس کا سدباب کیا جاسکتا ہے اور اس طرح سے بہت سے مسائل کا حل نکالا جاسکتا ہے۔

ان سب سے قطع نظر "معاشرتی نظام کی حفاظت اور واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے" اور "اہم ترین کو اہم پر مقدم کیا جائے" یہ چند ایک مسائل ایسے ہیں جو بہت سے مشکل ترین مسائل کو حل کرسکتے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ تمام وسیع اختیارات جو "ولایت فقیہ" کے ذریعے اسلامی حکومت کو حاصل ہیں، ان کے ذریعے اسلام کے کلی اصولوں کے اندر رہ کر ان مشکلات کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

البتہ ان امور میں سے ہر ایک کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے ایک لمبی تفصیل کی ضرورت ہے، خصوصاً جبکہ اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے (اجتہاد کا معنیٰ ہے اسلامی ماخذ سے اسلامی احکام کا استنباط) لیکن ہم یہاں اس تفصیل میں نہیں جاتے کیونکہ اس طرح سے ہم اپنے مقصد سے دُور ہٹ جائیں گے، لیکن پھر بھی ہم نے اشارہ کردیا ہے جو مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہوسکتا ہے۔

۳۔ غیبی فیض سے محرومی: ایک اور سوال یہ ہے کہ وحی کا نزول ہو یا عالم غیب اور ماورا طبیعت سے ارتباط، عالم بشریت کے لیے خدا کی طرف سے ایک بہت بڑا احسان اور اعزاز ہے اور تمام سچے مومنین کے لیے امید کا دریچہ ہے۔

تو کیا اس ارتباط کا منقطع ہوجانا اور امید کے اس دریچے کا بند ہوجانا پیغمبر خاتمؐ کے بعد آنے والے انسانوں کے لیے ایک عظیم محرومی نہ ہوگی؟

اس سوال کا جواب بھی ذیل کے نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ ہے:

اوّلاً وحی اور عالم غیب سے رابطہ درحقیقت حقائق کے ادراک کے لیے ہے اور جب کہنے کی باتیں کہی جاچکی ہوں اور روز قیامت تک کی ضروریات کے تمام کلی اور جامع اصول پیغمبر اسلام علیہ وآلہ وسلم کے فرامین کی روشنی میں بیان ہوچکے ہوں تو پھر اس رابطہ کے منقطع ہوجانے سے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا۔

ثانیاً: جو کچھ نبوت کے خاتمے کے بعد ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگیا ہے، وہ ہے "نئی شریعت کے لیے وحی" یا "سابق شریعت کی تکمیل" نہ کہ عالم طبیعت کے ماورا ہر قسم کے رابطہ کا انقطاع، کیونکہ ائمہ علیہم السلام بھی عالم غیب سے رابطہ رکھتے ہیں اور وہ سچے مومنین بھی جو تہذیب نفس کے ذریعے اپنے دلوں سے حجابوں کو دور کرکے کشف و شہود کے مناصب پر فائز ہوچکے ہیں۔

مشہور فیلسوف صدرالمتالہین شیرازی "مفاتیح الغیب" میں یوں رقم طراز ہیں:

"وحی" اس معنی کے لحاظ سے کہ فرشتہ مامور یت اور پیغمبری کے لیے کان اور دل پر نازل ہوتا ہے، تو یہ سلسلہ اگرچہ منقطع ہو چکا ہے اور کسی پر فرشتہ نازل نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کو کسی قسم کے فرمان کے لفاذ پر مامور کرتا ہے کیونکہ "اکملت لکم دینکم" کے حکم کے مطابق جو کچھ اس راستے سے انسان تک پہنچنا چاہیئے تھا، وہ پہنچ چکا ہے، لیکن الہام و اشراق کا دروازہ ہرگز بند نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا کیونکہ اس دروازے کا بند ہونا ممکن بھی نہیں۔ [1]

اصولی طور پر یہ رابطہ نفس کے ارتقاء، روح کی جلا اور باطن کے صفا کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ چیز صرف نبوت اور رسالت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہوتی بلکہ جس وقت بھی اس کے مقدمات اور شرائط فراہم ہو جائیں یہ معنوی رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور بنی نوع انسان اس فیض سے کبھی محروم تھی اور نہ ہی ہوگی۔ (غور کیجئے گا)

---

[1] مفاتیح الغیب صفحہ ۱۳۔

۴۱۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ۝
۴۲۔ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا ۝
۴۳۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۝
۴۴۔ تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِیْمًا ۝

ترجمہ

۴۱۔ اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو! خدا کو بہت یاد کرو۔
۴۲۔ اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔
۴۳۔ وہ وہی ہے جو تم پر درود اور رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی (تمھارے لیے رحمت کا تقاضا کرتے ہیں) تاکہ تمھیں (جہالت، شرک اور گناہ کی تاریکیوں سے (ایمان، علم اور تقویٰ کے) نور کی طرف رہنمائی کرے، وہ مومنین پر بہت ہی مہربان ہے۔
۴۴۔ ان کا تحیہ سلام ہے جس دن وہ اس سے ملاقات کریں گے اور خدا نے ان کے لیے نہایت ہی قیمتی جزاء مقرر کر رکھی ہے۔

تفسیر

خدا اور فرشتوں کا درود :

گذشتہ آیات میں تبلیغِ رسالت کے سلسلہ میں پیغمبرِ اسلام کی سخت ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب مندرجہ بالا آیات میں اس تبلیغ کے دامن کو سارے معاشرے میں وسعت دینے کے لیے مومنین کی کچھ ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے اور ان سب کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو خدا کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا کرو" (یا ایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا)۔

اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو: (وسبحوہ بکرۃ واصیلا)۔

چونکہ مادی زندگی میں ان کے لیے غفلت کے عوامل بہت زیادہ ہیں اور شیاطین کے وسوسوں کے تیر ہر طرف سے چل رہے ہیں ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے "ذکرِ کثیر" کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے" ذکرِ کثیر" اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے یہ ہے کہ پورے وجود کے ساتھ خدا کی طرف توجہ ہو، نہ کہ صرف زبانی۔

ایسا ذکرِ کثیر جو انسان کے تمام اعمال پر سایہ فگن ہو اور اس پر نور اور روشنی ڈال رہا ہو۔ اس طرح سے قرآن پاک تمام مومنین کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ وہ ہر حالت میں یادِ خدا میں مصروف رہیں۔ عبادت کے وقت اسے حضورِ قلب اور خلوصِ دل سے یاد کریں، اگر گناہ کے مقامات پر پہنچیں تو اسے یاد کر کے گناہوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اگر لغزش ہو جائے تو توبہ کریں اور راہِ حق کی طرف پلٹ آئیں۔ نعمت کے وقت اسے یاد کریں، اس کے شکر گزار ہوں، بلا و مصیبت کے وقت اسے یاد کریں۔ صابر و شاکر رہیں

خلاصہ یہ کہ اس کی یاد کو کبھی دل سے نہ بھلائیں جو زندگی کے ہر شعبہ میں صحیح اور الٰہی طرزِ عمل کا سبب ہے۔

ایک حدیث جسے صحیح ترمذی اور مسند احمد بن حنبل میں ابو سعید خدری کی وساطت سے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے، میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا:

"ای العباد افضل درجۃ عند اللہ یوم القیامۃ"؟

"قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کس بندے کا درجہ سب سے افضل اور سب سے برتر ہوگا"؟

تو آپ نے ارشاد فرمایا:

"الذاکرون اللہ کثیرا"

"جو لوگ خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں"۔

ابو سعید کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! ومن الغازی فی سبیل اللہ

"یا رسول اللہ! کیا اس قسم کے لوگ راہ خدا میں جہاد کرنے والوں سے بھی بلند مقام کے مالک ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"لو ضرب بسیفہ فی الکفار والمشرکین حتی ینکسر ویختضب دمًا لکان الذاکرون اللہ افضل درجۃ منہ۔"

"اگر اپنی تلوار سے کفار و مشرکین کے پیکر پر اس قدر ضربیں لگائیں کہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگین ہو جائے تب بھی وہ لوگ جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں، ان سے افضل ہیں۔" [1]

کیونکہ خالص جہاد بھی خدا کے ذکرِ کثیر کے بغیر ناممکن ہے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کثیر ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اگر بعض روایات میں تسبیح حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا (۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ) اور مفسرین کے بعض اقوال میں ذکر کثیر سے مراد "صفات علیا" اور "اسمائے حسنیٰ" اور پروردگار کو ان چیزوں سے پاک بیان کرنا جو اس کے لائق نہیں یا اس قسم کے دوسرے امور ہیں تو یہ سب ذکر کے واضح مصداق کا بیان ہیں نہ کہ آیت کے مفہوم کو خصوصیت سے ان مصادیق میں سے کسی کے ساتھ محدود کر دیا جائے۔

جیسا کہ آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے "ہر صبح و شام خدا کی تسبیح" سے مراد یہ ہے کہ تسبیح کو دن رات جاری رکھا جائے اور ان دو اوقات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا دراصل دن کے آغاز اور اختتام کے طور پر ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی تفسیر نماز صبح و عصر وغیرہ سے کی ہے تو وہ بھی اس کا ایک مصداق ہے۔

اس طرح سے "خدا کا ذکر کثیر اور ہر صبح و شام اس کی تسبیح" پروردگار کی طرف دائمی توجہ اور اسے ہر عیب و نقص سے مبرا جانے بغیر نہیں ہو سکتی۔ نیز ہم سب جانتے ہیں کی خدا کی یاد انسان کی روح کے لیے اسی قدر اہم ہے جس قدر جسم کے لیے پانی اور غذا۔ چنانچہ سورہ رعد کی آیت ۲۸ میں آیا ہے:

"الا بذکر اللہ تطمئن القلوب"

"آگاہ رہو کہ صرف خدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے۔"

دلوں کے سکون و اطمینان کا نتیجہ بھی وہی ہے جو سورۂ فجر کی آیات نمبر ۲۷ تا ۳۰ میں آیا ہے:

"یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ، فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی"

"اے نفس مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جا، جب کہ تو رب سے راضی ہے، پھر میرے بندوں کے زمرے میں شامل ہو کر میری بہشت میں داخل ہو جا۔"

لہذا والی آیت درحقیقت ذکر اور دائمی تسبیح کا نتیجہ اور علت غائی ہے، خدا فرماتا ہے۔ وہ وہی تو ہے جو تم پر درود و رحمت

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۶ صفحہ ۳۵۳ بحوالہ درمنثور۔

ہیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تمھارے لیے رحمت کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ تمھیں وہ جہالت، کفر اور شرک کی تاریکیوں سے ایمان، علم اور تقویٰ کے نور کی طرف رہنمائی کرے (هو الذی یصلّی علیکم وملائکته لیخرجکم من الظلمات الی النور)۔

"کیونکہ وہ مومنین کی بابت رحیم و مہربان ہے" اور اسی بنا پر ان کی ہدایت اور رہبری اس نے اپنے ذمہ لے لی ہے اور اپنے فرشتوں کو بھی ان کی امداد پر مامور کیا ہے: (وکان بالمؤمنین رحیمًا)۔

"یصلّی" "صلاۃ" کے مادہ سے ہے، یہاں توجہ اور مخصوص عنایت کے معنی میں ہے۔ یہ عنایت خدا کے بارے میں تو نزول رحمت ہے اور فرشتوں کے بارے میں استغفار اور تقاضائے رحمت ہے۔ جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۷ میں ہے: ویستغفرون للذین آمنوا" یعنی حاملین عرش مومنین کے لیے استغفار کرتے ہیں۔

بہرحال یہ آیت ان مومنین کے لیے بشارتِ عظیم اور بڑی نوید ہے جو ہمیشہ خدا کی یاد میں رہتے ہیں، کیونکہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سیر و سلوک میں تنہا نہیں ہیں بلکہ لفظ "یصلّی" فعل مضارع ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ مومنین ہمیشہ خدا اور اس کے فرشتوں کی رحمت کے زیر سایہ رہتے ہیں اور رحمت کے اس سائے میں ظلمت کے پردے شق ہوتے ہیں اور علم و حکمت، ایمان اور تقوے کا نور ان کے قلب و روح پر ضو فشانی کرتا ہے۔

جی ہاں! سالکین راہ حق کے لیے یہ آیت بہت بڑی بشارت ہے اور انھیں نوید دیتی ہے کہ محبوب کی طرف سے زبردست کشش موجود ہے تاکہ بے چارے عاشق کی کوشش کسی نہ کسی نتیجہ تک پہنچ جائے۔ وہ راہِ خدا میں قدم اٹھانے والے مجاہدین کے لیے ضمانت ہے کیونکہ ایسے لوگوں کا شمار خالص اور مخلص افراد کے زمرے میں ہوتا ہے جنہیں گمراہ کرنے سے شیطان نے پہلے دن ہی اپنے عجز و ناتوانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

"فبعزتك لاغوینهم اجمعین الا عبادك منهم المخلصین"۔

"اے خداوندا! تیری عزت کی قسم سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔ (ص/ ۸۲-۸۳)

"وکان بالمؤمنین رحیما" کے جملے میں "کان" فعل ماضی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کی طرف سے ہمیشہ مومنین پر ایک خاص رحمت رہتی ہے اور یہ اس بات کی ایک اور تاکید ہے جو آیت کے آغاز میں ہے۔ یہ خدا کی خاص رحمت ہی ہے کہ وہ مومنین کو اوہام، شہوات اور شیطانی وسوسوں کی تاریکیوں سے نکال کر یقین و اطمینان کے نور کی طرف راہنمائی کرتا ہے کیونکہ اگر اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہو تو خطرناک اور پیچیدہ راستہ کبھی طے نہ ہو سکے۔

موجودہ سلسلے کی آخری آیت میں مومنین کے مقام اور ان کی جزا کی عمدہ اور مختصر عبارت میں تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ خدائی فرشتوں کا تحیہ ان کے لیے جس دن (قیامت) وہ اس سے ملاقات کریں گے، سلام ہے"؛ (تحیتهم یوم یلقونه سلام)۔

"تحیت" مادہ "حیات" سے "سلامتی" اور "ایک اور زندگی" کے لیے دعا کرنے کے معنی میں ہے (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۴ صفحہ ۵۵ اردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں)۔

یہ ایسا سلام ہے جو عذاب اور ہر قسم کے درد و رنج اور پریشانی سے محفوظ ہے اور سکون و اطمینان سے ملا ہوا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "تحیتہم" مومنین کو آپس میں درود و سلام پیش کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن اگر گذشتہ آیات کو دیکھیں جن میں خدا اور ملائکہ کی اس جہان میں صلوٰۃ اور رحمت کی گفتگو تھی تو اس کا ظاہر یہ بتایا ہے کہ "یہ تحیہ" بھی اس کے فرشتوں کی جانب سے آخرت میں ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ رعد کی آیت ۲۳-۲۴ میں ہے۔

"والملائکۃ یدخلون علیھم من کل باب سلام علیکم بما صبرتم"۔

"اس دن فرشتے مومنین پر ہر دروازے سے وارد ہوں گے اور ان سے کہیں گے، تمہارے صبر کی وجہ سے تم پر سلام ہو"۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے معنی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ "یوم یلقونہ" سے مراد قیامت کا دن جسے "لقاء اللہ" کے دن کا نام دیا گیا ہے، عام طور پر یہ تعبیر قرآنی آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوتی ہے۔

اس تحیہ کے بعد جو درحقیقت آغاز کار سے مربوط ہے اس کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "خدا نے ان کے لیے بڑا قیمتی اجر فراہم کر رکھا ہے" "واعد لھم اجرا کریما"۔

یہ ایک ایسا جملہ ہے جس میں اختصار کے باوجود تمام چیزیں جمع ہیں اور خدا کی تمام نعمتیں اور ہر قسم کی بخششیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ ہر حال میں خدا کی یاد: جس وقت خدا کا نام لیا جاتا ہے، عظمت، قدرت، علم اور حکمت کی ایک دنیا کے دل میں روشن ہوتی ہے کیونکہ وہ اسماء حسنیٰ اور اعلیٰ صفات کا حامل، تمام کمالات کا مالک اور ہر قسم کے نقص و عیب سے منزہ و مبرہ ہے۔

اس حقیقت کی طرف دائمی توجہ انسانی روح کو نیکیوں اور پاکیزگیوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور برائیوں اور قباحتوں سے روکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی صفات کا عکس انسانی روح میں تجلی کرتا ہے، ایسے عظیم معبود کی طرف توجہ اس کی بارگاہ میں دائمی حضور کے احساس کا موجب بنتی ہے اور اس احساس کے ذریعے ہی گناہوں سے انسان کا فاصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ روز بروز ان سے دور ہوتا جاتا ہے۔

اس کی یاد ہمیشہ اس کی نگرانی کی یاد آوری، اس کے حساب و کتاب اور جزا کی یاد، اس کے عدل و انصاف اور جنت و دوزخ کی یاد ہے۔ ایسی یاد ہے جو روح کو صفا اور دل کو نور و حیات عطا کرتی ہے۔

اسی بنا پر اسلامی روایات میں آیا ہے کہ ہر چیز کی ایک مقدار معین ہے، سوائے یاد خدا کے کہ جس کا کوئی حد و حساب نہیں۔ اصول کافی کی روایت کے مطابق امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "ما من شیء الا وقد ینتھی الیہ الا الذکر فلیس لہ حد ینتھی الیہ"۔ ہر ایک چیز کی ایک حد ہوتی ہے کہ جب وہ اس تک پہنچ جائے تو ختم ہو جاتی ہے، سوائے یاد خدا کے کہ جس کی کوئی حد

نہیں ہے۔

پھر مزید فرماتے ہیں:

" فرض اللہ عزوجل الفرائض فمن ادھن فھو حدھن وشھر رمضان فمن صامہ فھو حدہ والحج فمن حج حدہ، الا الذکر، فان اللہ عزوجل لم یرض منہ بالقلیل ولم یجعل لہ حدا ینتھی الیہ، ثم تلا: یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا وسبحوہ بکرۃ واصیلا"

" خدا نے واجب نمازوں کو فرض کیا ہے جو ان کو ادا کر دے اس نے ان کی حد کو پورا کر دیا، ماہ رمضان کے روزے رکھ لے اس کی حد انجام پا گئی جو شخص (ایک مرتبہ) حج بجا لائے تو وہی اس کی حد ہے سوائے "ذکر خدا" کے کہ خدا اسکی قلیل مقدار سے راضی نہیں ہوتا اور اس کے کثیر کے لیے بھی کسی حد کا قائل نہیں۔ پھر آپ نے اپنی گفتگو کے شاہد کے طور پر آیہ " یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا . . . . . " تلاوت فرمائی۔ [1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اسی روایت کے ذیل میں اپنے والد گرامی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں نقل کرتے ہیں۔

آنجناب "کثیر الذکر" تھے۔ جس وقت ہم ان کے ساتھ چل رہے ہوتے تو وہ ذکر خدا کر رہے ہوتے اور کھانا کھاتے وقت ذکر خدا میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ جب لوگوں سے باتیں کر رہے ہوتے تو بھی ذکر خدا سے غافل نہ ہوتے . . . . "

آخر میں یہ پر مغز حدیث اس جملہ کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

" والبیت الذی یقرء فیہ القرآن، ویذکر اللہ عزوجل فیہ تکثر برکتہ، وتحضرہ الملائکۃ، وتھجر منہ الشیاطین، ویضیء لاھل السماء کما یضیء الکوکب الدری لاھل الارض"

" جس گھر میں قرآن کی تلاوت اور خدا کی یاد ہو، اس میں برکت زیادہ ہوتی ہے، فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں اور شیاطین اس سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، اور وہ گھر اہل آسمان کو یوں چمکتا دکھائی دیتا ہے، جیسے اہل زمین کو چمکتا ستارہ نظر آتا ہے"۔

اس کے برعکس جس گھر میں تلاوت قرآن اور ذکر خدا نہیں ہوتا اس کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور فرشتے ہجرت کر جاتے ہیں اور شیاطین آ پڑاؤ ڈالتے ہیں [2]۔

---

[1] کافی جلد ۲ کتاب الدعا باب ذکر اللہ عزوجل۔

[2] کافی جلد ۲ کتاب الدعا باب ذکر اللہ عزوجل۔

یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ ایک حدیث میں یادِ خدا کو دنیا و آخرت کی تمام خیر کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"من اعطی لسانا ذاکرا فقد اعطی خیر الدنیا والاٰخرۃ"۔

"جس شخص کو خدا نے ذکر کرنے والی زبان عطا کی ہے گویا اس کو دنیا و آخرت کی بھلائی دے دی گئی ہے"۔[1]

یادِ خدا کی اہمیت کے سلسلے میں روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر ہم چاہیں کہ ان سب کو یہاں جمع کر دیں تو ہم اپنے موضوع سے خارج ہو جائیں گے۔ اس گفتگو کو ہم حضرت صادق آلِ محمد کی ایک مختصر مگر جامع حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"من اکثر ذکر اللہ عزوجل اظلہ اللہ فی جنتہ"۔

"جو شخص زیادہ یادِ خدا کرے تو خدا اسے اپنے لطف و کرم کے سائے میں بہشت بریں میں جگہ عطا فرمائے گا"۔[2]

اجو لوگ اس سلسلے میں آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں اصول کافی جلد دوم کے ان ابواب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جو ذکر اللہ کے بارے میں ہیں، خصوصاً جس باب میں بتایا گیا ہے کہ اس شخص کو کبھی آفات و بلیات اپنا نشانہ نہیں بناتے جو ذکرِ خدا کرتے ہیں[3]۔

اس بات کو ایک بار پھر دہرانا ضروری ہے کہ ان سب خیرات و برکات کا تعلق یقیناً ایسے لفظی ذکر اور حرکت زبان سے نہیں ہے جو غور و فکر اور عمل سے خالی ہو بلکہ مقصود وہ ذکر ہے جس سے فکر کے سوتے پھوٹتے ہوں اور جس کا ردِ عمل انسانی اعمال سے واضح ہو جیسا کہ روایات میں اس معنی کی تصریح ہوئی ہے۔[4]

۲۔ لقاء اللہ کیا ہے؟

ہم نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں عام طور پر یہ تعبیر قیامت کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ پروردگار کے بارے میں حسی ملاقات کوئی مفہوم نہیں رکھتی کیونکہ وہ جسم ہے، نہ ہی عوارض جسم کا حامل، لہٰذا بعض مفسرین مجبوراً اصطلاح کے مطابق یہاں مضاف کو مقدر مان کر کہتے ہیں کہ "لقاء ثواب اللہ" یا "خدا کے فرشتوں کی ملاقات" ہے۔ لیکن یہاں پر "لقاء" کو "لقاء اللہ" کے حقیقی اور دل کی آنکھ کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے۔

کیونکہ قیامت کے دن تمام پردے ہٹ جائیں گے اور خدا کی عظمت اور اس کی نشانیاں ہر زمانے سے زیادہ روشن اور واضح طور پر جلوہ گر ہوں گی۔ انسان باطنی شہود اور دل کی آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کے مقام پر پہنچ جائے گا اور ہر شخص اپنی معرفت اور عمل صالح کی مقدار کے مطابق اس شہود کے عالی مرحلے پر فائز ہوگا۔

اسی مناسبت سے جناب فخر رازی نے اپنی تفسیر میں نہایت ہی قابل توجہ بات بیان کی ہے جسے ہماری مذکورہ گفتگو کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اس دنیا میں انسان مادی امور اور تلاش معاش میں مستغرق ہونے کی وجہ سے عام طور پر خدا سے غافل ہو جاتا ہے لیکن

---

[1] کافی جلد ۲ کتاب الدعا باب ذکر اللہ عزوجل ۱۔

[2] کافی جلد ۲ کتاب الدعا باب ذکر اللہ عزوجل ۱۔

[3] خصائل صدوق مطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۱۱، صفحہ ۳۹۳۔

قیامت میں جب یہ تمام امور برطرف ہو جائیں اور انسان فکر معاش سے بے نیاز ہو جائے گا تو اپنے پورے وجود کے ساتھ پروردگار عالم کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اور یہی "لقاء اللہ" کا معنی ہے۔ [1]

یاد رہے جو کچھ ہم عرض کر چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض مفسرین نے یہاں پر جو موت اور فرشتہ موت سے ملاقات کے لمحے کی طرف اشارہ سمجھا ہے، نہ تو وہ مذکورہ آیات سے مناسبت رکھتا ہے اور نہ ہی ان جیسی دوسری قرآنی آیات کی تعبیرات سے۔ خصوصاً "یلقونہ" میں مفعول کی ضمیر مفرد کی صورت میں آئی ہے جو اس ذات پاک خداوند متعال کی طرف اشارہ ہے، جبکہ روح کو قبض کرنے والے فرشتوں کے لیے جمع کا صیغہ ہوتا ہے اور اس سے قبل کی آیت میں لفظ "ملائکہ" جمع کی صورت میں آیا ہے اگرچہ یہ کوئی کلمہ مقدر مانا جائے)۔

۳۔ مؤمنین کی جزا ابھی سے تیار ہے: "اعد لھم اجرا کریما" کا جملہ واضح کرتا ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتیں ابھی سے پیدا ہو چکی ہیں اور مومنین کے انتظار میں ہیں، لیکن ممکن ہے یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ تیار رکھنا تو ایسے لوگوں کے لیے مناسب ہوتا ہے جو محدود قدرت کے مالک ہوتے ہیں اور مبادا ضرورت کے وقت فراہم کرنا چاہیں تو نہ کر پائیں لیکن پروردگار کی قدرت غیر محدود ہے، وہ جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرے تو حکم دیتا ہے "ہو جا" تو وہ فوراً ہو جاتی ہے وہاں ایسی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تو پھر اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں تیار ہونے کا کیا مقصد ہے؟

ج: ایک نکتے کی طرف توجہ اس مشکل کو حل کر دیتی ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کو تیار کر کے رکھنا ہمیشہ قدرت کے محدود ہونے کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ کبھی دل کو گرمانے اور زیادہ سے زیادہ دلی اطمینان اور بعض اوقات زیادہ سے زیادہ احترام و اکرام کی بنا پر ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم کسی مہمان کو دعوت دیتے ہیں اور کچھ مدت پہلے اس کی تواضع کے وسائل تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، تو ہم اس کے لیے زیادہ احترام اور اہمیت کے قائل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کے آنے کے بعد تواضع اور پذیرائی کے وسائل مہیا کرنے میں لگ جائیں تو یہ خود ایک قسم کی بے اعتنائی، بے پرواہی اور ناقدر شناسی شمار ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود یہ بات اس سے مانع نہیں ہوگی کہ باایمان افراد اپنی خود سازی، معرفت اور پاکیزگی عمل میں جتنی زیادہ کوشش کریں گے، خدا کی طرف سے اجر و ثواب بھی اتنا کامل اور ارتقا پیدا کرتا جائے گا۔

---

[1] تفسیر کبیر از فخر الدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۴۵۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ

۴۶۔ وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝

۴۷۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِیْرًا ۝

۴۸۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ۝

ترجمہ

۴۵۔ اے پیغمبر! ہم نے تجھے گواہ، خوشخبری دینے والا اور انذار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

۴۶۔ اور تجھے اللہ کے حکم سے، اسی کی طرف دعوت دینے والا اور روشنی عطا کرنے والا چراغ قرار دیا ہے۔

۴۷۔ اور مومنین کو بشارت دے کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے عظیم فضل اور اجر ہے۔

۴۸۔ اور تو کفار و منافقین کی اطاعت نہ کر اور نہ ہی ان کے آزار اور اذیتوں کی پرواہ کر خدا پر توکل کر اور یہی کافی ہے کہ خدا (تیرا) حامی اور مدافع ہے۔

تفسیر

رسول اللہؐ چراغِ فروزاں ہیں:

ان آیات میں رُوئے سخن پیغمبر اسلامؐ کی طرف ہے لیکن اس کا نتیجہ مومنین کے لیے ہے۔ اور یہ آیات اُن گزشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہیں جن میں مومنین کی بعض ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ان چار آیات میں سے پہلی دو آیات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پانچ اوصاف بیان ہوئے ہیں اور دوسری دو آیات میں پانچ ذمہ داریوں اور فرائض کا تذکرہ ہے جو سب کے سب آپس میں مربوط اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے۔ "اے پیغمبرؐ! ہم نے آپ کو شاہد اور گواہ کے طور پر بھیجا ہے": (یاایھا النبی انا ارسلناک شاھدا)۔

آنحضرتؐ ایک طرف سے تو امت کے اعمال پر گواہ ہیں کیونکہ آپؐ ان کے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم ایک اور جگہ پڑھتے ہیں:

"وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون"

"کہہ دیجئے کہ عمل کرتے رہو خدا، اس کا رسول اور مومنین (آئمہ معصومین) تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں"۔

(توبہ/۱۰۵)

پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ علیہم السلام کے پاس اُمت کے اعمال کے پیش ہونے سے ان کے بارے میں ان کے علم و آگہی کی بات ثابت ہو جاتی ہے جس کی تفصیل اسی آیت کے ذیل میں، تفسیر نمونہ جلد ہشتم میں آچکی ہے۔

دوسری طرف آپ گزشتہ انبیاءؑ پر شاہد ہیں جو خود اپنی امت کے گواہ تھے:

"فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علی ھؤلاء شھیدا"

"اس دن ان کی حالت کیسی ہوگی جس دن ہم ہر امت کے لیے ان کے اعمال پر گواہ طلب کریں گے اور آپ کو ان کے اعمال پر گواہ قرار دیں گے"۔ (نساء/۴۱)

اور تیسری طرف آپ اپنے وجودِ مقدس، اوصاف حمیدہ، اخلاقِ حسنہ، اصلاحی پروگرام، روشن ماضی اور اعمال صالح کی وجہ سے اپنے مکتب کی حقانیت اور پروردگار کی عظمت و قدرت کے گواہ ہیں۔

پھر دوسری اور تیسری صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "ہم نے آپ کو بشارت دینے اور ڈرانے والا قرار دیا ہے": (ومبشرا ونذیرا)۔

نیک لوگوں کو پروردگار عالم کے بے انتہا اجر اور ہمیشہ کی سعادت و سلامتی اور قابلِ فخر کامیابی و کامرانی کی بشارت یعنی خوش خبری

دینے والا اور کفار و منافقین کو خدا کے دردناک عذاب، تمام وجودی سرمایوں کے ضیاع اور دنیا و آخرت میں بدبختی کے گڑھوں میں جا گرنے سے ڈرانے والا۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ خوف و امید کو ہر جگہ ایک دوسرے سے ملا ہوا اور باہم مساوی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وجود انسانی کا آدھا حصہ تو فوائد کے حصول سے لگاؤ رکھتا ہے اور دوسرا نصف حصہ نقصان سے بچنے کی خواہش رکھتا ہے۔ "بشارت" کا سبب پہلا حصہ اور "انذار" کا سبب دوسرا حصہ ہے۔ وہ لوگ جو اپنے منصوبوں کاموں میں صرف ایک حصے پر انحصار کرتے ہیں دراصل انھوں نے انسان کی حقیقت کو پہچانا ہی نہیں ہے اور نہ ہی انھوں نے اس کی اس حرکت کے اسباب و علل کی طرف کوئی توجہ کی ہے۔ [1]

بعد والی آیت رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چوتھی اور پانچویں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: "ہم نے آپ کو اللہ کے حکم کے مطابق اس کی طرف دعوت دینے والا قرار دیا ہے اور روشنی عطا کرنے والا چراغ بھی": (وداعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیراً)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ رسالت مآبؐ کا مقامِ شہود: آپ کے تمام اوصاف سے پہلے آیت میں اس مقام کا ذکر ہوا ہے کیونکہ یہ مقام صرف پیغمبر کے وجود اور ان کی رسالت کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کسی قسم کے تمہید اور مقدمہ کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس وقت آپ اس مقام و منزلت پر منصوب ہو جائیں گے تو آپ کا مذکورہ بالا جہات سے شاہد ہونا مسلم ہو جائے گا، البتہ مقام "بشارت" و "انذار" دو ایسے مقامات ہیں جو اس کے بعد وجودی صورت اختیار کرتے ہیں۔

۲۔ خدا کی طرف دعوت کا مرحلہ: یہ مرحلہ بشارت اور انذار کے بعد آتا ہے کیونکہ بشارت و انذار افراد کو حق کے قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ جب ترغیب اور تنبیہ کے ذریعے حق کو قبول کرنے کی آمادگی پیدا ہو جائے گی تو پھر خدا کی طرف دعوت شروع ہوگی، اور صرف ایسے ہی مقام پر دعوت مؤثر ہوگی۔

۳۔ دعوت اذنِ الٰہی سے: باوجودیکہ آنحضرتؐ کے تمام کام خدا کے اذن و فرمان سے انجام پاتے ہیں لیکن یہاں پر صرف دعوت کو اذنِ پروردگار سے مقید کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کا مشکل ترین اور اہم ترین کام کی طرف دعوت دینا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کو ان کی خواہشات نفسانی کے برخلاف صحیح راستے پر چلانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر خدا کے اذن و فرمان اور یاوری و مدد کو شامل حال ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے صحیح انجام کو پہنچے۔ ضمناً یہ بھی واضح ہونا چاہیئے کہ پیغمبرؐ اپنی طرف سے نہیں بلکہ جو کچھ کہتے ہیں، اذن خدا سے کہتے ہیں۔ [2]

---

[1] اس سلسلے میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۹ کے ذیل میں ہم تفصیل بحث "دو اہم تربیتی اصول" کے عنوان سے کر چکے ہیں۔ (جلد اول دیکھیے)

[2] یہ احتمال بھی ہے کہ "باذنہ" کی قید گذشتہ تمام اوصاف کی طرف لوٹتی ہو۔ لیکن آیت کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ صرف "داعیاً الی اللہ" کی طرف لوٹتی ہے۔

۴۔ آپؐ کا سراجِ منیر ہونا: "سراج" کا معنیٰ "چراغ" اور "منیر" کا معنی "نور افشاں" ہے اور یہ پیغمبر گرامی کے معجزات، حقانیت کے دلائل اور دعوت کی صداقت کی نشانیوں کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ایسا روشن چراغ ہے جو اپنا گواہ خود آپ ہے، تاریکیوں کو دُور کرتا ہے اور آنکھوں اور دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جس طرح "آفتاب آمد دلیل آفتاب" ہوتا ہے، ان کا وجود بھی ان کی حقانیت کی دلیل ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں چار مرتبہ لفظ سراج آیا ہے جن میں سے تین مقامات پر "سورج" کے معنی میں آیا ہے جن میں سے سورۂ نوحؑ کی آیت ۱۶ میں فرمایا گیا ہے:

"وجعل القمر فیھن نورا وجعل الشمس سراجا"

"خدا نے چاند کو آسمان کا نور اور سورج کو چراغ فروزاں قرار دیا ہے۔"

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ "سراج" اصل میں چراغ کے معنی میں ہے جو گزشتہ زمانے میں فتیلے اور سرسوں کے تیل سے جلتا تھا اور موجود دور میں بجلی وغیرہ کی قوت سے نور اور روشنی کا سرچشمہ ہے، لیکن مفردات میں راغب کے بقول یہ لفظ تدریجاً نور اور روشنی کے ہر منبع پر بولا جانے لگا اور سورج اس کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ اس کا نور خود اسی کے اندر سے پھوٹتا ہے اور چاند کی طرح کسی اور منبع سے نور حاصل نہیں کرتا۔

پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود گرامی آفتاب تاباں کی طرح ہے جو جہالت، شرک اور کفر کی ظلمتوں کو انسان کی رُوح کے افق سے دُور کرتا ہے۔ لیکن جس طرح نابینا افراد سورج کی روشنی سے استفادہ نہیں کر سکتے اور جس طرح چمگادڑ کی آنکھیں اس روشنی کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں اور وہ اس سے اپنے آپ کو چھپائے رکھتی ہے، اسی طرح دل کے اندھے اور ہٹ دھرم افراد بھی اس نور سے کبھی استفادہ نہیں کر سکتے۔ نہ پہلے اور نہ اب اور ابوجہل جیسے لوگ اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں تاکہ رسول پاکؐ کے قرآن پڑھنے کی آواز نہ سن سکیں۔ ہمیشہ ظلمت اور تاریکی اضطراب اور وحشت کا سبب ہوتی ہے، جبکہ نور اور روشنی سکون اور اطمینان کا باعث چور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بیابان کے درندے بھی عام طور پر رات ہی کی تاریکی میں اپنے ٹھکانوں سے باہر آتے ہیں۔

تاریکی انتشار کا سبب ہے اور نور اجتماع کا باعث ہے۔ اسی بنا پر اگر کسی تاریک رات میں بیابان کے اندر ایک چراغ روشن کر دیا جائے تو تھوڑی دیر میں انواع و اقسام کے حشرات اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔

روشنی اور نور درختوں کی نشوونما، پھولوں کی پرورش، پھلوں کے پکنے غرضیکہ تمام حیاتی فعالیتوں کا سرمایہ ہے۔

ذاتِ پیغمبر کو ایک منبع نور کے ساتھ تشبیہ دینا ان تمام مفاہیم کو ذہن میں منتقش کر دیتا ہے۔

آپ کا وجودِ گرامی باعثِ سکون ہے، دین و ایمان کے چوروں اور معاشرے کے بے رحم گرگ بھیڑیوں کے بھاگ جانے کا سبب ہے، دل کی تسلی کا سرمایہ اور ایمان و اخلاق کی روحانی پرورش اور نشوونما کا ذریعہ ہے۔ غرضیکہ آپ ہی کے دم قدم سے زندگی اور اس کی چہل پہل کا مزہ ہے اور آپ کی تاریخ زندگی اس امر کا زندہ شاہد ہے۔

* * * * *

ہم کہہ چکے ہیں کہ زیر بحث آیات میں سے دو آخری آیتوں میں آنحضرتؐ کی پانچ اہم ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ

آپ کی پانچ صفات بیان کرنے کے بعد، پہلے مرحلے پر فرمایا گیا ہے۔ "مومنین کو بشارت دیجئے کہ ان کے لیے خدا کی طرف سے فضل اور عظیم اجر ہے" (وبشر المؤمنین بان لھم من اللہ فضلاً کبیرًا)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر کی بشارت کا مسئلہ صرف نیک مومنین کے اعمال کے اجر و جزا تک ہی محدود نہیں بلکہ خداوند عالم ان پر اپنے فضل و کرم کی اس قدر بخشش کرے گا کہ عمل اور اجر کے درمیان توازن کا معیار بالکل بدل جائے گا، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات اس پر شاہد ناطق ہیں۔ قرآن ایک جگہ فرماتا ہے: "من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا" (انعام۔ ۱۶۰)

قرآن دوسری جگہ فرماتا ہے:

"مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء"

(بقرۃ/ ۲۶۱)

جس کے مطابق کبھی راہِ خدا میں خرچ کرنے کا اجر سات سو گنا اور کبھی ہزار گناہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

بعض اوقات ثواب اس سے بھی اوپر چلا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

"فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین"

"کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس قدر ثواب اس کے لیے چھپا کر رکھا گیا ہے جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوگا۔" (الم سجدہ/ ۱۷)

اس طرح سے خدا کے ایک فضل و کرم کی طرف نشاندہی کی گئی ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں آسکتا بلکہ اس سے بھی بلند تر اور بالاتر ثواب کی نشان دہی کی گئی ہے۔

قرآن اس کے بعد دوسرے اور تیسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرو" (ولا تطع الکافرین والمنافقین)۔

اس میں شک نہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز کفار اور منافقین کی اطاعت نہیں کرتے تھے، لیکن معاملہ اس قدر اہم ہے کہ تاکید تو پیغمبر کو کی جارہی ہے لیکن تنبیہ دوسروں کو۔ کیونکہ سچے رہبروں کو رستے میں جو اہم خطرات درپیش ہوتے ہیں وہ یا تو سودے بازی ہوتی ہے اور یا پھر ہتھیار ڈال دینا ہوتے ہیں اور ان خطرات کا سرچشمہ یا تو دھمکیاں ہوتی ہیں یا پھر مختلف طریقوں سے لالچ ہوتا ہے حتیٰ کہ کبھی کبھار تو انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ان دو راستوں میں سے کسی ایک کو اپنا ہی لینا چاہیئے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رہبر کی تمام محنت ضائع ہوجاتی ہے اور تمام کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

تاریخ اسلام سے پتہ چلتا ہے کہ کفار اور منافقوں کے مختلف گروہوں نے بارہا کوشش کی کہ پیغمبر اسلام کو بھی مذکورہ صورت حال سے دوچار کردیں۔ چنانچہ کبھی تو انھوں نے کہا کہ بتوں کو برا بھلا نہ کہیں اور کبھی یہ پیش کش کی کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی۔ کبھی کہتے کہ ہمیں مزید ایک سال کی مہلت دیں کہ اسی طرح عمل جاری رکھیں، پھر آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ کبھی پیش کش کرتے کہ آپ ان غریبوں فقیروں کو اپنے اطراف سے ہٹادیں تاکہ مالدار اور با اثر لوگ آپ کے ہم نوا بن سکیں۔ اور

کبھی مالی امداد کی پیش کش کرتے کبھی عہدہ اور منصب و مقام اور خوبصورت عورتوں کی لالچ دیتے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اسلام کی سریع اور تیز پیش رفت اور کفر و نفاق کی بیخ کنی کی راہ میں خطرناک جال تھی۔ اگر آپ ان میں سے کسی مطالبے کو مان لیتے۔ یا اپنی طرف سے ذرہ بھر نرمی اور جھکاؤ کا اظہار کرتے تو اسلامی انقلاب کی بنیادیں متزلزل ہو جاتیں۔ اس کی عمارت دھڑام سے گر جاتی اور آپ کی کوئی کوشش کسی بھی نتیجہ کو نہ پہنچ پاتی۔

پھر چوتھے اور پانچویں حکم میں فرمایا گیا ہے۔ "ان کے آزار اور تکلیف پہنچانے کی پرواہ نہ کریں، خدا پر توکل کریں۔ اور یہی کافی ہے کہ خدا آپ کا حامی اور دفاع کرنے والا ہے"۔ (ودع اذاھم وتوکل علی اللہ وکفی باللہ وکیلا)۔

آیت کا یہ حصہ واضح کرتا ہے کہ انھوں نے پیغمبر اسلام پر جھکنے اور سر تسلیم خم کرنے کے لیے سخت دباؤ ڈالا اور انواع و اقسام کے آزار و تکالیف سے دوچار کر دیا اور وہ آزار کبھی تو زبان کے ذریعے زخم لگا کر اور بدزبانی کر کے اور کبھی جسمانی طور پر دکھ پہنچا کر، کبھی آپ کا اور آپ کے اعوان و انصار کا اقتصادی محاصرہ کر کے، غرضیکہ انھوں نے اذیتیں پہنچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ البتہ مکہ میں قیام کے دوران اذیتوں کا طریقہ اور تھا اور مدینہ میں اور تھا۔ کیونکہ "اذی" ایک ایسا لفظ ہے جو آزار اور تکلیف کی تمام قسموں کی نشاندہی کرتا ہے۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ "اذی" ہر قسم کے ضرر کے معنی میں ہے جو کسی زندہ چیز یا اس سے وابستہ افراد کو پہنچے۔ وہ ضرر چاہے، جسمانی ہو یا جانی، دنیوی ہو یا اخروی۔

البتہ یہ لفظ قرآنی آیات میں خصوصیت کے ساتھ زبانی ایذاء اور تکلیف پہنچانے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ کی آیت ۶۱ میں ہے:

"ومنھم الذین یؤذون النبی ویقولون ھو اذن"۔

"ان میں بعض لوگ پیغمبر کو اذیت پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ خوش عقیدہ انسان ہیں اور ہر شخص کی بات پر کان دھرتے ہیں"۔

لیکن دوسری آیات میں یہ لفظ جسمانی تکلیف کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ نساء کی آیہ نمبر ۱۶ میں ہے:

"والذان یاتیانھا منکم فاٰذوھما"۔

"وہ مرد اور عورتیں جو اس برے عمل (زنا) کا ارتکاب کرتے ہیں، انھیں آزار دو (ان پر شرعی حد جاری کرو)"۔

تاریخ کہتی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صدر اسلام کے مسلمانوں نے طرح طرح کی تکالیف کا پہاڑ کی طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کبھی کسی کے آگے نہیں جھکے۔ ننگ و عار کو تسلیم نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے مقاصد جلیلہ میں کامیاب و کامران ہو گئے۔

اس استقامت اور کامیابی کی وجہ صرف خدا پر توکل اور اس کی پاک ذات پر اعتماد تھا۔ وہ خدا جس کے ارادے کے آگے تمام مشکلات کافور ہو جاتی ہیں اور بقول شاعر:

اگر تیغ عالم بجنبند زجای — نبرد رگی تا نخواہد خدای

"اگر ساری دنیا کی تلواریں حرکت میں آجائیں، جب تک خدا نہ چاہے، کسی کی ایک رگ بھی نہیں کاٹ سکتیں"۔

جی ہاں! انسان کا سہارا اور جائے پناہ اس قسم کا خدا ہونا چاہیے اور بس!

جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زیر بحث آیت کا مضمون حکم جہاد سے منسوخ نہیں ہوا۔ (جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے) بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ آیات حکم جہاد کے کافی عرصہ بعد اور سورۂ احزاب سے متعلق واقعات کے ضمن میں نازل ہوئی ہیں اور ہر دور میں واجب العمل اور لازم الاجرا ہیں "تاکہ خدائی پیشوا اپنی تمام تر قوتیں مخالفین کے اذیت ناک کاموں کو اہمیت دینے میں صرف نہ کریں۔ کیونکہ اگر وہ ان کی پرواہ کریں گے اور اپنی فعال صلاحیتیں ان کے مقابلے میں صرف کر دیں گے تو دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ کیونکہ دشمن تو چاہتا ہی یہ ہے کہ مخالف کے اذہان و افکار کو الجھا دے "تاکہ اس طرح سے اس کی طاقت ضائع کر دے۔ یہی وہ منزل ہے جس کا واحد حل بے اعتنائی اور "دع اذاھم" والے فرمان پر عمل درآمد ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا پانچوں احکام جو آخری دو آیات میں ذکر ہوئے ہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ مومنین کو باایمان قوتوں کے جذب کرنے کے لیے بشارت دینا، کفار اور منافقین سے کسی قسم کی سودے بازی نہ کرنا اور نہ ہی ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، ان کے آزار و تکلیف کی پرواہ نہ کرنا اور خدا کی ذات پر توکل کرنا، مجموعی طور پر ان میں مقصد تک پہنچنے کا راز پوشیدہ ہے اور یہ راہ حق کے راہیوں کے لیے ایک مکمل اور جامع دستور العمل ہے۔

۴۹۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا ۖ فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ○

ترجمہ

۴۹۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم مؤمن عورتوں کے ساتھ نکاح کرو، اور ہم بستر ہونے سے پہلے انھیں طلاق دے دو۔ تو تمھاری وجہ سے ان پر کوئی عدت نہیں ہے کہ جس کا تم حساب رکھو، انہیں مناسب ہدیہ دے کر شائستہ طریقے سے رخصت کر دو۔

تفسیر

طلاق کے کچھ احکام:

اس سورہ (احزاب) کی آیات کو صاف طور پر مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض میں تو پیغمبرؐ کو خطاب کیا گیا ہے اور بعض میں تمام مؤمنین کو۔ اسی لیے کبھی "یا ایُّھا النبیّ" آیا ہے تو کبھی "یا ایھا الذین امنوا"۔ ان آیات میں لازمی احکام ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی ذات بھی ان احکام میں موردِ نظر تھی اور تمام مؤمنین بھی۔

زیرِ نظر آیت ان میں سے ہے، جن میں روئے سخن سب اہلِ ایمان کی طرف ہے، جبکہ گذشتہ آیات میں ظاہراً روئے سخن صرف رسول کریمؐ کی طرف تھا اور پھر آئندہ آیات میں دوبارہ پیغمبرِ اکرمؐ کو خطاب کی نوبت آئے گی اور اس سے "لف و نشر مرتب"

کی اصطلاح کے مطابق اس سورہ کا ایک حصہ تشکیل پاتا ہے۔

خدا فرماتا ہے: "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، جس وقت ایمان دار عورتوں سے نکاح کرو اور ہم بستری سے پہلے ہی انہیں طلاق دے دو تو تمہاری وجہ سے ان پر کوئی عدت نہیں ہے کہ جس کا حساب تم مدنظر رکھو" (یا ایھا الذین اٰمنوا اذا نکحتم المؤمنات ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فما لکم علیھن من عدۃ تعتدونھا)۔

یہاں پر خدا مطلقہ عورتوں کی عدت کے حکم میں ایک استثناء بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اگر دخول سے پہلے طلاق واقع ہو جائے تو پھر عدت رکھنا ضروری نہیں ہے۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے پہلے عدت کا حکم بیان ہو چکا ہے۔

"مؤمنات" کی تعبیر اس بات کی دلیل نہیں کہ غیر مومن یا غیر مسلم عورتوں سے نکاح کلی طور پر ممنوع ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ان کی اولیت کی طرف اشارہ ہو، اسی بناء پر یہ آیت کتابیہ عورتوں سے نکاح موقف (متعہ) کی روایات اور مشہور فقہاء کے فتاوی سے متصادم نہیں ہے۔

یاد رہے کہ "لکم" (تمہارے لیے) اور اسی طرح "تعتدونھا" (عدت کا حساب کرتے ہو) کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے، عورت کا عدت رکھنا دراصل مرد کا ایک قسم کا حق شمار ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ عورت واقع میں حاملہ ہو، اور عدت کو ترک کر کے دوسرے مرد سے ازدواج سبب بن جائے کہ بچے کی کیفیت غیر واضح ہو، لہٰذا مرد کا حق پامال ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ عدت کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے مرد اور عورت دونوں کو اس بات کی فرصت مل جائے گی کہ اگر طیش اور غصے کی وجہ سے نوبت طلاق تک جا پہنچی ہو تو وہ اس عدت میں اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی بھی کر سکیں۔ یہ عورت اور مرد دونوں کا حق ہے۔

رہا یہ اعتراض جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ اگر عدت مرد کا حق ہے تو اس کو ساقط بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ اعتراض ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ فقہ میں بہت سے ایسے حقوق ہیں، جن کو ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ مثل اس حق کے جو میت کے لواحقین کو اس کے مال میں حاصل ہوتا ہے یا وہ حق جو فقراء کو زکوٰۃ میں حاصل ہوتا ہے، ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد ان عورتوں کے احکام میں سے ایک اور حکم کو بیان کرتا ہے، جن کو ہم بستری سے پہلے طلاق ہو جائے۔ اس کی طرف سورہ بقرہ میں بھی اشارہ ہو چکا ہے، فرمایا گیا ہے: انہیں (مناسب ہدیہ کے ساتھ) بہرہ مند کرو (فمتعوھن)۔

اس میں شک نہیں کہ عورت کو مناسب ہدیہ دینا اس مقام پر واجب ہوتا ہے، جہاں اس کے لیے مہر معین نہ ہوا ہو۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں آیا ہے:

"لاجناح علیکم ان طلقتم النساء مالم تمسوھن او تفرضوا لھن فریضۃ ومتعوھن"

تم پر گناہ نہیں ہے کہ اگر تم عورتوں سے اختلاط سے قبل یا تعیین مہر سے پہلے (کسی وجہ سے) طلاق دے دو، لیکن اس موقع پر انہیں (مناسب ہدیہ کے ساتھ) بہرہ مند کرو۔

اسی بناء پر زیر بحث آیت اگرچہ مطلق ہے اور ایسے مواقع بھی اس میں شامل ہیں جن میں مہر کا تعین ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، لیکن

سورہ بقرہ کی آیت کے قرینے سے موجودہ آیت کو ایسے موقع کے لیے مخصوص کیا جائے گا، جہاں مہر مقرر نہ ہوا ہو۔ کیونکہ اگر مہر معین ہو چکا ہو لیکن دخول نہ ہوا ہو تو آدھا مہر ادا کرنا واجب ہے (جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۷ میں آیا ہے)۔

لیکن بعض مفسرین اور فقہا نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "مناسب ہدیہ دینے" کا حکم موجودہ آیت میں ایک عمومی حکم ہے۔ یہاں تک کہ وہ مواقع بھی شامل ہیں، جن میں مہر مقرر کیا گیا ہے۔ البتہ ایسے مواقع پر مستحب ہوتا ہے اور جن مقامات پر مقرر نہیں کیا گیا، وہاں پر واجب ہوتا ہے، چنانچہ بعض آیات اور روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ [1]

اور اس ہدیے کی مقدار کیا ہونی چاہیئے؟ قرآن مجید اسے اجمالاً بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"متاعًا بالمعروف"

"مناسب ہدیہ" (بقرہ ۲۳۶)

اسی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے،

"علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ"

جو شخص استطاعت رکھتا ہے اس کی استطاعت کے مطابق جو تنگ دست ہے اس کی اپنی استطاعت کے مطابق۔

اسی بناء پر اگر اسلامی روایات میں گھر، ملازم اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا ذکر آیا ہے، یہ اس کلیے کے مصداق ہیں جو شوہر کی استطاعت اور بیوی کے حالات کے مطابق مختلف ہوتے ہیں۔

اسی آیت کا آخری حکم یہ ہے کہ "مطلقہ عورتوں کو مناسب طریقے پر رخصت کردو اور ان سے اچھے انداز میں جدائی اختیار کرو" (وسرحوھن سراحًا جمیلًا)۔

"سراح جمیل" کا معنی ہے محبت و احترام کے ساتھ علیحدہ کر دینا اور ہر قسم کی سختی، ظلم اور بے احترامی سے اجتناب کرنا۔ خلاصہ یہ کہ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۹ میں آیا ہے کہ "بیوی کو یا تو مناسب طور پر اپنے پاس رکھنا چاہیئے یا پھر خیر و خوبی کے ساتھ اسے رخصت کر دینا چاہیئے"؛

"فامساك بمعروف او تسريح باحسان"

زوجیت کو برقرار رکھنا بھی انسانی معیار کے مطابق ہونا چاہیئے اور ایک دوسرے سے علیحدگی اور جدائی بھی۔ نہ یہ کہ جب

---

[1] مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۱ اور اس سلسلے کی متعدد روایات وسائل الشیعہ کی کتاب نکاح کے "ابواب مہور" میں سے باب ۵۰، جلد ۱۵ صفحہ ۵۹ میں بھی موجود ہیں، منجملہ ان کے ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لكل مطلقة متعة الا المختلعة"

ہر مطلقہ کے لیے مناسب ہدیہ ہونا چاہیئے، سوائے اس عورت کے جو اپنا مہر یا کوئی اور چیز دے کر طلاق لینے میں اپنے شوہر کی رضامندی حاصل کرتی ہے۔

شوہر علیحدگی کا ارادہ کرے تو اپنی بیوی کے بارے میں ہر قسم کی بے مہری، ظلم و زیادتی، بدزبانی، سختی و درشتی کا مظاہرہ کرے، کیونکہ یہ یقیناً غیر اسلامی طریقہ کار ہے۔

بعض مفسرین نے "سراح جمیل" کو اسلامی تقاضوں کے مطابق طلاق انجام پانے کے معنی میں لیا ہے اور جو روایت علی بن ابراہیم کی تفسیر اور "عیون الاخبار" میں آئی ہے، اس میں بھی یہی معنی بیان ہوا ہے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ "سراح جمیل" اس معنی میں محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کا ایک واضح مصداق ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے "سراح جمیل" کو گھر سے باہر جانے کی اجازت اور نقل مکانی کے معنی میں سمجھا ہے۔ کیونکہ یہاں عورت عدت رکھنے کی پابند نہیں ہے۔ اسی بناء پر اس کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے، تاکہ وہ جہاں جانا چاہے جا سکے۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "سراح جمیل" اور اس قسم کی دوسری تعبیرات قرآن کی دوسری آیات میں حتی کہ ان عورتوں کے بارے میں بھی جنہیں عدت گزارنی چاہیئے وارد ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

"سراح" کے اصل اور لغوی معنی کے سلسلہ میں اور یہ کہ وہ کیوں متعارف اطلاقات میں چھوڑ دینے اور طلاق دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی سورہ (احزاب) کی آیہ ۲۸ کے ذیل میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

۵۰۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

ترجمہ

۵۰۔ اے پیغمبر! ہم نے آپ کی ان بیویوں کو حلال کیا ہے، جن کا حق مہر آپ ادا کر چکے ہیں اور اسی طرح وہ کنیزیں جو غنیمت کے ذریعے ہم نے آپ کو بخشی ہیں اور آپ ان کے مالک ہوئے ہیں آپ کے چچا کی بیٹیاں، پھوپھیوں کی بیٹیاں، ماموؤں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں کہ جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے، اور جس وقت کوئی با ایمان عورت خود کو پیغمبر کے لیے ہبہ کر دے (اپنے لیے مہر کا تقاضا نہ کرے) نبی چاہے تو اس سے بیاہ کر سکتے ہیں، لیکن اس قسم کا نکاح صرف

آپ کی ذات کے لیے جائز ہے نہ کہ دوسرے مومنین کے لیے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان کے لیے ہم نے ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں کون سا حکم مقرر کیا ہے (اور ان کی مصلحت کس بات کا تقاضا کرتی ہے) یہ اس بناء پر ہے تاکہ (ادائے رسالت میں) آپ کسی مشکل سے دوچار نہ ہوں، اور خدا بخشنے والا، اور بڑا مہربان ہے۔

تفسیر

آپ کے لیے کن عورتوں سے نکاح جائز ہے؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آیات کا ایک حصّہ پیغمبر اسلام اور ان کی ذمہ داریوں کو "لف ونشر مرتب" کی صورت میں بیان کرتا ہے، لہٰذا گذشتہ آیت میں عورتوں کو طلاق دینے کے سلسلے میں کچھ احکام ذکر کرنے کے بعد یہاں رُوئے سخن نبی پاکؐ کی طرف کرتے ہوئے سات ایسے مواقع کو بیان کیا گیا ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے نکاح جائز ہے۔

۱۔ پہلے فرمایا گیا ہے۔ "اے پیغمبرؐ! ہم نے آپ کے لیے آپ کی بیویوں کو حلال کیا ہے، جن کا حق مہر آپ ادا کر چکے ہیں" (یا ایھا النبی انا احللنا لک ازواجک اللاتی اٰتیت اجورھن)۔

ان بیویوں سے مراد بعد والے جملوں کے قرینے کے مطابق وہ عورتیں ہیں جن کی پیغمبر اکرم کے ساتھ کسی قسم کی رشتہ داری نہیں تھی، لیکن انھوں نے آپ سے نکاح کیا اور شاید حق مہر ادا کرنے کا مسئلہ بھی اسی بناء پر تھا، کیونکہ رسم یہ تھی کہ غیر رشتہ داروں میں شادی کے موقع پر حق مہر نقد ادا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں حق مہر ادا کرنے میں جلدی کرنا خصوصاً اس صورت میں جب بیوی کو اس کی ضرورت ہو، بہتر ہے لیکن واجب نہیں ہے اور طرفین کی باہمی رضامندی کی صورت میں شوہر کے ذمہ سارے کا سارا یا کچھ حصّے کی ادائیگی ملتوی بھی کی جاسکتی ہے۔

۲۔ "وہ کنیزیں جو غنائم اور انفال کے ذریعے خدا نے آپ کو بخشی ہیں" (وما ملکت یمینک مما افاء اللہ علیک)۔

"افاء اللہ" "فیء" (بروزن شیء) کے مادہ سے ہے اور ایسے مال کو کہا جاتا ہے جو بغیر مشقت کے ہاتھ آئے۔ اسی لیے جنگی غنیمتوں اور اسی طرح انفال (قدرتی وسائل دولت، جو اسلامی حکومت کی ملکیت ہوتے ہیں اور ان

کا کوئی فرد واحد مالک نہیں ہوتا، پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں "فی ء" بازگشت اور اچھی حالت کی طرف لوٹنے کے معنی میں ہے اور اگر "سایہ" کو "فی ء" کہا جاتا ہے تو اس لیے کہ وہ برگشت اور لوٹنے کی حالت رکھتا ہے، آگے چل کر کہتے ہیں، بغیر کسی تکلیف اور محنت و مشقت کے حاصل شدہ مال کو بھی "فئی" کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی تمام خیر و خوبی کے باوجود بھی سائے کی مانند عارضی اور ختم ہونے والا ہوتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ جنگی غنائم میں کبھی کبھی زحمت اور مشقت زیادہ اٹھانا پڑتی ہے۔ لیکن چونکہ پھر بھی دوسرے اموال کی نسبت سر دردی اور مشقت تھوڑی ہوتی ہے اور بعض اوقات بہت سے اموال ایک حملے میں ہاتھ آجاتے ہیں، لہٰذا انہیں "فئی" کہتے ہیں۔ کیا یہ حکم آنحضرتؐ کی ازواج میں سے کس کے بارے میں صادق آتا ہے؟ اس ضمن میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آپ کی بیویوں میں سے ایک ماریہ قبطیہ غنائم میں سے اور دوسری ازواج "صفیہ" اور "جویریہ" انفال میں سے تھیں جنہیں پیغمبر اکرمؐ نے غلامی کی قید سے آزاد کر کے اپنی زوجیت کے لیے قبول فرمایا اور غلاموں کو تدریجاً آزاد کرنے اور ان کا انسانی مقام ان کی طرف لوٹانے کے لیے یہ امر بذات خود اسلام کے عمومی پروگراموں کا ایک حصہ تھا۔

۳۔ "آپ کے چچا کی بیٹیاں، پھوپھیوں کی بیٹیاں، ماموؤں اور خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے، یہ بھی آپ پر حلال ہیں" (وبنات عمك وبنات عماتك وبنات خالك وبنات خالاتك اللاتی ھاجرن معك)۔

تو اس طرح سے تمام رشتہ داروں میں سے صرف چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد عورتوں سے اس شرط کے ساتھ ازدواج جائز ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی ہے۔

ان چار گروہوں میں محدودیت واضح ہے، لیکن "مہاجرت" کی شرط اس لیے ہے، کیونکہ اس زمانہ میں ہجرت ایمان کی دلیل تھی اور ہجرت نہ کرنا کفر کی۔ یا اس بنا پر ہے کہ ہجرت انھیں زیادہ اعزاز دیتی تھی اور آیت میں بھی ان عالی مقام اور صاحب فضیلت عورتوں کو بیان کرنا مقصود ہے جو آپ کی زوجیت کے لیے مناسب اور موزوں ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چاروں مواقع جو ایک کلی حکم کے طور پر آیت میں ذکر ہوئے ہیں، آیا پیغمبرؐ کی بیویوں میں مصداق خارجی بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ صرف ایک مقام جسے ذکر کیا جا سکتا ہے، وہ ہے آپ کا اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحش کے ساتھ نکاح، جس کی داستان اسی سورہ میں گزر چکی ہے، کیونکہ جناب زینب، جحش کی بیٹی تھیں اور جحش آنحضرتؐ کی پھوپھی کا شوہر تھا۔[1]

---

[1] یہاں پر "عم" مفرد اور "عمات" جمع کی صورت میں آیا ہے اسی طرح "خال" مفرد اور "خالات" جمع آیا ہے۔ مفسرین نے اس کی کئی وجوہات بیان کی ہیں، جن کو فاضل مقداد نے کنز العرفان میں بھی نقل کیا ہے، لیکن سب سے بہتر وجہ یہ ہے کہ "عم" اور "خال" عام طور پر لغت عرب میں اسم جنس کی صورت میں استعمال ہوئے ہیں۔ جبکہ "عمہ" اور "خالہ" اس طرح نہیں ہیں اور یہ اہل لغت کا عام طریقہ ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۴۔ "جس وقت کوئی ایمان دار عورت اپنے آپ کو پیغمبر کے لیے ہبہ کردے (اور اپنے لیے کسی قسم کے حق مہر کا مطالبہ نہ کرے) اگر پیغمبر چاہیں تو اس سے عقد کر سکتے ہیں"۔ (وامرأة مؤمنة ان وهبت نفسها للنبی ان اراد النبی ان یستنکحها)۔

"لیکن اے پیغمبر! اس قسم کا نکاح صرف آپ کے لیے جائز ہے نہ کہ باقی مومنین کے لیے"۔ (خالصة لك من دون المؤمنین)۔

"ہم جانتے ہیں کہ ہم نے ان کے لیے ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں کون سا حکم مقرر کیا ہے" اور ان کی مصلحتوں کا کیا تقاضا ہے"۔ (قد علمنا ما فرضنا علیهم فی ازواجهم وما ملکت ایمانهم)۔

اسی بناء پر اگر ہم نکاح سے متعلق کچھ مسائل میں ان کے لیے بعض مواقع پر پابندی لگا دیتے ہیں تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک حکم اور قانون باقاعدہ حساب و کتاب کے تحت ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: "یہ اس بناء پر ہے کہ (فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے سلسلے میں) آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو (اور آپ اس فریضہ کی بجا آوری میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں)"۔ (لکیلا یکون علیك حرج)۔

"اور خدا بخشنے والا رحیم ہے"۔ (وکان الله غفورا رحیما)۔

چند اہم نکات

۱۔ رسول اللہ کی ایک خصوصیت: اس میں شک نہیں کہ "حق مہر کے بغیر بیوی بنانے" کی اجازت صرف پیغمبر اکرم کو ہے اور یہ آپ کے مختصات میں سے ہے اور آیت بھی اس مسئلے میں بالکل واضح ہے۔ اسی بناء پر کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی عورت سے مہر (تھوڑا ہو یا زیادہ) کے بغیر عقد کرے۔ حتی کہ اگر صیغہ عقد جاری کرتے وقت حق مہر کا ذکر نہ کیا گیا ہو اور کسی قسم کا قرینہ بھی نہ ہو تو "مہر المثل" دینا چاہیئے۔ "مہر المثل" سے مراد وہ حق مہر ہے جو اس جیسی عورتیں مختلف نوعیتوں کے تحت عام طور پر اپنے لیے مقرر کرتی ہیں۔

۲۔ اس حکم کا خارجی مصداق: اس کلی حکم نے پیغمبر اسلام کے بارے میں کوئی خارجی مصداق بھی پیدا کیا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مفسرین مثلاً ابن عباس اور کچھ دوسرے حضرات کا نظریہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کیفیت کے ساتھ کسی عورت سے نکاح نہیں کیا اور مذکورہ بالا حکم آپ کے لیے ایک ایسا کلی حکم تھا، جس سے کبھی بھی استفادہ نہیں کیا گیا۔ جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے آپ کی ان تین چار ازواج کا نام لیا ہے، جو بغیر حق مہر کے آپ کی زوجیت میں آئیں۔ وہ "میمونہ بنت حارث" اور "زینب بنت خزیمہ" جن کا تعلق

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) جسے ابن العربی نے بھی نقل کیا ہے (دیکھو کنز العرفان جلد ۲ صفحہ ۲۴۱) اور آلوسی نے روح المعانی میں بھی اس وجہ کو باقی تمام وجوہات پر ترجیح دی ہے۔

انصار سے تھا، بنی اسد کی ایک خاتون "ام شریک بنت جابر" اور "خولہ بنت حکیم" تھیں۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب خولہ نے اپنے آپ کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بخش دیا تو جناب عائشہ کی صدائے احتجاج بلند ہوئی اور انھوں نے کہا:

"مابال النساء یبذلن انفسھن بلا مھر"

ان عورتوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ حق مہر کے بغیر اپنے آپ کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیتی ہیں؟

تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی لیکن جناب عائشہ نے حضرت رسالت مآب سے کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ اللہ آپ کے مقصد کو بہت جلد پورا کر دیتا ہے" (یہ آپ پر ایک قسم کی طنز تھی)۔

تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

"وانک ان اطعت اللہ سارع فی ھواک"

"اگر تم بھی خدا کی اطاعت کرنے لگ جاؤ تو وہ تمہارے مقصد کو بھی جلد پورا کر دے"۔ [1]

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی خواتین تو صرف روحانی اعزاز حاصل کرنے کی خواہاں تھیں، جو صرف رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہی انھیں حاصل ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی حق مہر کے آپ کی زوجیت کے لیے آمادہ ہوگئیں، لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے کہ تاریخی طور پر اس قسم کا خارجی مصداق مسلم نہیں ہے۔ جو چیز مسلم ہے وہ صرف یہ کہ خدا نے پیغمبر اکرم کو اس قسم کی اجازت دے رکھی تھی، یہ سوال کہ اس کا فلسفہ کیا تھا؟ تو اس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا۔

۳۔ ھبہ اور صیغہ کا نکاح: اس آیت سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ صیغہ نکاح کا اجرا لفظ "ہبہ" کے ساتھ صرف پیغمبر کے ساتھ مخصوص تھا اور دوسرا کوئی بھی شخص اس قسم کے لفظ سے عقد نکاح جاری نہیں کر سکتا لیکن اگر عقد کا اجرا نکاح کے لفظ کے ساتھ انجام پائے تو پھر جائز ہے کہ حق مہر کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ حق مہر کے ذکر نہ کرنے کی صورت میں "مہر المثل" ادا کرنا چاہیئے۔ (جس کی حقیقت وہی ہے جو مہر المثل کی تصریح میں گزر چکی ہے)۔

۴۔ تعدد ازواج کا فلسفہ: مذکورہ بالا آیت کا آخری جملہ واقع میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان مخصوص احکام کے فلسفے کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ پیغمبر کے کچھ ایسے مخصوص حالات ہوتے ہیں جو دوسروں کے نہیں ہوتے اور یہی فرق بعض دوسرے احکام میں بھی فرق کا سبب بن جاتا ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔ تفسیر قرطبی میں بھی یہ جملہ آیا ہے:

"واللہ ما اری ربک الا یسارع فی ھواک"

"خدا کی قسم میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ خدا نے آپ کی کسی خواہش کو جلد پورا نہ کیا ہو۔"

اور آلوسی نے بھی "روح المعانی" میں مذکورہ آیت کے ذیل میں ذکر کیا ہے، چنانچہ اس قسم کی نامناسب اور چبھتی ہوئی گفتگو کا مفہوم کسی پر پوشیدہ نہیں لیکن آنحضرت اپنی عظمت اور جلالت قدر کی وجہ سے اس موقع پر بھی بڑی خوش اسلوبی اور متانت سے گزر جاتے ہیں۔

زیادہ واضح تعبیر میں قرآن کہتا ہے: مقصد یہ تھا کہ کچھ ان احکام کے ذریعے پیغمبر کے کاندھوں سے پابندیاں اور مشکلات ہٹا دی جائیں۔ یہ ایک ایسی لطیف تعبیر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا متعدد اور مختلف قسم کی عورتوں سے شادی کرنا درحقیقت آپ کی زندگی کی اجتماعی اور سیاسی مشکلات کے ایک سلسلے کو حل کرنے کے لیے تھا۔

کیونکہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ جس وقت آنحضرتؐ نے ندائے اسلام بلند کی تو اس وقت آپؐ یکہ و تنہا تھے اور بہت مدت تک سوائے معدودے چند افراد کے آپ پر کوئی بھی ایمان نہیں لایا تھا۔ آپ اپنے زمانے اور ماحول کے تمام بیہودہ اور فضول فطریات اور عقاید کے خلاف ڈٹ گئے، سب نے جہاد کرنے کا اعلان کر دیا۔ لہٰذا فطری طور پر اس معاشرے کے تمام قبیلے اور قوم آپ کے خلاف متحد اور متفق ہو گئے۔

اب ضروری تھا کہ دشمنوں کے اس ناپاک اتحاد کو توڑنے کے لیے آپؐ اپنے وسائل بروئے کار لاتے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف قبائل کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کرتے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے درمیان محکم ترین رابطہ رشتہ داری کا رابطہ شمار ہوتا تھا اور کسی قبیلے کے داماد کو اس قبیلے والے ہمیشہ اپنے میں سے سمجھتے تھے اور اس کی حمایت کرنا اپنا فریضہ جانتے تھے اور اسے چھوڑ دینا گناہ تصور کرتے تھے۔

ہمارے پاس بہت سے قرائن موجود ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی یہ شادیاں بہت سے موارد میں سیاسی اہمیت کی حامل تھیں اور بعض شادیاں مثلاً زینبؓ کے ساتھ ازدواج زمانۂ جاہلیت کی غلط رسوم کو توڑنے کے لیے تھی جس کی تفصیل اسی سورہ کی آیت ۳۷ کے ذیل میں بیان کی جا چکی ہے۔

اور کچھ دوسری شادیاں متعصب لوگوں اور ہٹ دھرم قوموں کی دشمنی میں کمی کرنے یا ان سے دوستی پیدا کرنے کے لیے تھیں۔

واضح ہے کہ جو شخص ۲۵ سال کی عمر میں جو کہ عنفوان شباب کا دور ہوتا ہے، ایک چالیس سالہ بیوہ خاتون سے شادی کرتا ہے اور ۵۳ سال کی عمر تک اسی بیوہ خاتون کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرتا ہے اور اسی طرح وہ اپنی جوانی کی بہاریں گزارنے کے بعد جب بڑھاپے کی خزاں میں قدم رکھتا ہے تو متعدد شادیاں کرتا ہے۔ تو اس کا یہ عمل یقیناً کسی فلسفے سے خالی نہیں ہے اور کسی بھی حساب سے اسے جنسی لگاؤ سے متہم نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے باوجود کہ متعدد شادیاں اس زمانے کے عربوں میں ایک عام اور معمول کا طریقہ تھا۔ بلکہ بعض اوقات پہلی بیوی دوسری بیوی کی خواستگاری کے لیے جایا کرتی تھی اور ازواج کی تعداد پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی اور پھر آنحضرت کے لیے عالم جوانی میں متعدد شادیاں کرنے سے نہ کوئی اجتماعی اور معاشرتی مسئلہ حائل تھا نہ مالی حالت اور نہ ہی یہ کام کسی قسم کا کوئی عیب اور نقص شمار ہوتا تھا۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ تاریخ میں ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف ایک ہی "باکرہ" عورت سے شادی کی تھی جن کا نام عائشہ ہے، باقی سب بیویاں بیوہ تھیں، جو فطری طور پر جذبات کو ابھارنے کا باعث ہرگز نہیں بن سکتی تھیں[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۲ صفحہ ۱۴۔

بلکہ بعض تاریخوں میں یہاں تک بھی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقد تو بہت سی خواتین سے ہوا۔ لیکن بات صرف عقد کی حد تک محدود رہی اور بس! حتی کہ کئی صورتوں میں تو صرف بعض قبائل کی عورتوں کی خواستگاری کو کافی سمجھا گیا ہے۔ [1]

وہ لوگ صرف اس حد تک خوش تھے اور فخر و مباہات کرتے تھے کہ ان کے قبیلہ کی کسی عورت کو پیغمبرؐ کی زوجہ ہونے کا شرف اور اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اس طرح سے ان کا معاشرتی تعلق پیغمبرؐ اسلام کے ساتھ مزید مستحکم ہو جاتا اور وہ آنحضرتؐ کی حمایت اور ان کا دفاع کرنے میں زیادہ مصمم ہو جاتے۔

پھر یہ کہ آنحضرتؐ یقیناً عقیم نہیں تھے۔ اس کے باوجود آپؐ نے جو اولاد چھوڑی ہے وہ نہایت ہی کم ہے۔ حالانکہ اگر ان عورتوں سے یہ شادیاں جنسی جذبے کی تسکین کے لیے ہوتیں تو چاہیئے تھا کہ آپ کے ہاں کثیر تعداد میں اولاد ہوتی۔

نیز یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ان بیویوں میں سے بعض مثلاً حضرت عائشہؓ جس وقت آنحضرتؐ کی زوجیت میں آئیں تو اس وقت بہت ہی کم سن تھیں اور کئی سال گزارنے کے بعد ایک بیوی ہونے کے قابل ہوئیں، تو یہ امر واضح کرتا ہے کہ اس قسم کی بیوی سے شادی کرنے کا کچھ اور ہی مقصد تھا اور وہ وہی تھا جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

اگرچہ دشمنان اسلام نے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد ازواج کو اپنے مطلب کا ثبوت قرار دے کر اپنے شدید ترین معاندانہ حملوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے اور کئی جھوٹے افسانے تراشے ہیں، لیکن ایک تو متعدد ازواج کے زمانے میں رسول اکرمؐ کی پیرانہ سالی، دوسرے ان خواتین کے سن اور قبائلی کیفیت اور تیسرے وہ قرائن جو بھی بیان ہو چکے ہیں، اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں اور معاندین کی سازشوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱۰۳، صفحہ ۲۲۔

۵۱۔ تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَآ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ○

ترجمہ

۵۱۔ اپنی بیویوں میں سے جس کے (مقررہ وقت کو) آپ چاہیں مؤخر کر سکتے ہیں اور جسے چاہیں اپنے پاس ٹھہرا سکتے ہیں اور ان میں سے جن بعض کو آپ نے اپنے سے الگ کر دیا ہے، اگر چاہیں تو اپنے پاس جگہ دے دیں، آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ خدائی حکم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ وہ غمگین نہ ہوں اور جو کچھ آپ انھیں دے دیں وہ اس پر راضی ہوں۔ اور خدا اس چیز کو اچھی طرح جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے اور خدا بندوں کے تمام اعمال اور ان کی مصلحتوں سے باخبر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ حلیم بھی ہے اور انھیں سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

شانِ نزول

اسی سورہ کی آیت ۲۸ اور ۲۹ کی تفسیر اور ان کی شان نزول کے بیان میں مفسرین کے بقول پیغمبر اکرم کی بعض بیویوں نے

آپ سے عرض کیا کہ ہمارے نان و نفقہ اور اخراجات میں اضافہ کیجئے۔ چونکہ ان کی نگاہ مال غنیمت پر لگی ہوئی تھی اور وہ یہ چاہتی تھیں کہ انھیں اس سے زیادہ ملنا چاہیئے اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور صراحت کے ساتھ ان کے گوش گزار کردیا کہ اگر وہ دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہیں تو ہمیشہ کے لیے پیغمبر سے الگ ہو جائیں اور اگر خدا، رسول و روزِ جزا کو چاہتی ہیں تو پھر اسی سادہ زندگی کے ساتھ نباہ کریں۔

اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے اوقات کی تقسیم کے بارے میں بھی ان کے درمیان رقابت موجود تھی جو پیغمبر اکرم کو تمام پریشانیوں اور اہم مصروفیات کے ساتھ ساتھ زبردست مشکلات سے دوچار کیے ہوئے تھی۔ اگرچہ آپ ان کے درمیان ضروری عدالت قائم رکھتے۔ لیکن پھر بھی وہ باتوں سے باز نہ آتی تھیں، لہٰذا زیر نظر آیت نازل ہوئی اور آنحضرت کو ان کے درمیان اپنے اوقات کی تقسیم میں پوری پوری آزادی دی گئی اور ساتھ ہی انھیں بھی خبردار کیا گیا کہ یہ خدائی حکم ہے، لہٰذا اس سے نہ تو کسی کو پریشانی ہو اور نہ ہی اس سے کسی قسم کا غلط نتیجہ اخذ کرسکیں۔ [1]

تفسیر
ایک اور مشکل آسان ہوتی ہے:

پیغمبر اسلام جیسا عظیم خدائی رہبر جو سخت حوادث اور وسائل میں گھرا ہوا ہو اور اس کے دشمن اس کے خلاف خطرناک داخلی اور خارجی سازشوں میں مصروف ہوں تو وہ اپنی شخصی اور خصوصی زندگی کی طرف اپنی فکر کو زیادہ مشغول نہیں رکھ سکتا، اسے اپنی گھریلو زندگی میں نسبتاً سکون اور آرام کا حامل ہونا چاہیئے تاکہ وہ جن مشکلات کے انبوہ میں گھرا ہوا ہے ان کا حل سکون و اطمینان سے تلاش کرسکے۔

اگر کسی انسان کی خارجی زندگی آشفتگی کا شکار ہو اور گھریلو حالات بھی توجہ اپنی طرف مبذول کیے ہوئے ہوں تو ایسے طوفانی لمحات انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ آیات کی تشریح میں ہم ثبوت پیش کرچکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد شادیاں زیادہ تر سیاسی اجتماعی اور انسانی ہمدردی کی بناء پر تھیں اور درحقیقت کارِ رسالت کا ایک حصہ تھیں، لیکن اس کے باوجود بعض اوقات عورتوں کے درمیان اختلاف اور ان کی معمول کی زنانہ رقابتیں رسول اللہ کے گھر میں ایک طوفان کھڑا کردیتیں اور آپ کی فکر اور ذہن کو اپنی طرف مبذول کرلیتیں۔

یہی وہ منزل ہے، جہاں خدا اپنے پیغمبر کو ایک اور خصوصیت عطا فرماتا ہے، جس سے روز روز کے جھگڑوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرکے آپ کو آسودہ خاطر اور فارغ البال کردیا گیا۔ چنانچہ اس آیت میں ہم پڑھتے ہیں: اگر آپ چاہیں تو ان عورتوں میں سے

---

[1] مجمع البیان اور دوسری تفاسیر سے اقتباس۔

ہر ایک (کے وقت) کو مؤخر کر کے کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھیں تو ایسا کر سکتے ہیں اور جسے چاہیں اپنے پاس جگہ دے سکتے ہیں: "ترجی من تشاء منھن وتؤوی الیک من تشاء"۔

"ترجی" "ارجاء" کے مادہ سے تاخیر کے معنی میں ہے اور "تؤوی" "ایواء" کے مادہ سے کسی شخص کو اپنے پاس جگہ دینے کے معنی میں ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ تعدد ازدواج کے سلسلے میں احکام اسلام کا حکم یہ بھی ہے کہ شوہر اپنے اوقات کو ان کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم کرے اور اگر ایک رات ان میں سے ایک کے ہاں ہے تو دوسری رات دوسری کے پاس رہے۔ اس سلسلے میں عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس موضوع کو اسلامی فقہ میں "حق قسم" کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رسول اسلامؐ کے خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ طوفانوں اور بحرانوں سے بھرپور زندگی کے مخصوص حالات کی بناء پر مذکورہ بالا آیت کی رُو سے "حق قسم" کی رعایت، آیت کے ذریعے آپ سے ساقط ہو گئی تھی۔ خصوصاً جب آپ مدینہ میں موجود تھے۔ یہاں بھی متعدد تھیں اور تقریباً ہر ماہ آپ کو کسی نہ کسی مسلط کردہ جنگ کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مذکورہ آیت نے آپؐ کو مکمل اختیار دے دیا کہ آپ جس طرح چاہیں اپنے اوقات کو تقسیم کر دیں۔ لیکن اس اختیار کے باوجود آپؐ کوشش کر کے عدل و مساوات فرماتے، تاریخ اسلام میں اس کی مکمل تصریح موجود ہے۔

اس خدائی حکم سے پیغمبر اکرمؐ کی بیویوں اور آپؐ کی داخلی زندگی کے ماحول کو سکون اور آرام ملا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے "جس وقت ان میں سے بعض کو ایک طرف کر دیں اور پھر چاہیں کہ انہیں اپنے پاس جگہ دیں تو بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں": "ومن ابتغیت ممن عزلت فلاجناح علیک"۔

اس طرح سے نہ صرف یہ کہ ابتداء میں آپ کو اختیار ہے، بلکہ اسے جاری اور برقرار رکھنے میں بھی آپؐ کا یہ اختیار برقرار ہے اور اصطلاح کے مطابق اس اختیار کو "تخییر استمراری" کہتے ہیں نہ کہ "تخییر ابتدائی" اور اس وسیع اور کھلے اختیارات کے حامل حکم کے بعد آپ کا اپنی بیویوں کے سلسلہ میں ہر قسم کا عذر ختم ہو جاتا ہے اور آپ اپنی فکر کو مکمل طور پر رسالت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔

ازواج پیغمبرؐ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ انہیں رسولؐ کی زوجہ ہونے کے اعزاز کے علاوہ ایک اور اعزاز بھی حاصل ہے اور وہ یہ کہ اوقات کی تقسیم کے سلسلے میں آنحضرتؐ کو جو خصوصی اختیارات حاصل ہیں، وہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کریں، جو ایک قسم کے ایثار اور فداکاری کا کھلا ثبوت ہے اور اس طرح ان پر نہ کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہے اور نہ ہی یہ کوئی معیوب بات ہے۔ کیونکہ انہوں نے حکم خدا کو تسلیم کیا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔ "یہ خدائی حکم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے ہے، اور یہ کہ کبھی غمگین نہ ہوں۔ بلکہ آپ جو کچھ انہیں دیں وہ سب اسی پر راضی ہوں": "ذالک ادنیٰ ان تقر اعینھن ولا یحزن ویرضین بما اتیتھن کلھن"۔

کیونکہ:

اولاً: یہ ان سب کے لیے ایک عمومی حکم ہے اور اس میں کسی قسم کا فرق روا نہیں رکھا گیا۔

ثانیاً: یہ حکم خدا کی طرف سے ہے جو نہایت اہم مصلحتوں کی بناء پر جاری کیا گیا ہے۔ اسی بناء پر انہیں یہ حکم خوشی خوشی قبول کر لینا چاہیئے اور پریشانی کے بجائے اظہارِ مسرت کرنا چاہیئے۔

لیکن اس کے باوجود جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوشش کرتے کہ تقسیم اوقات کے سلسلے میں عدل و مساوات کو مدنظر رکھا جائے۔ البتہ چند ایک موارد ایسے بھی ملتے ہیں کہ جہاں پر مساوات کو نظر انداز کر دیا گیا، لیکن اس کا سبب کچھ خاص اور ہنگامی حالات تھے اور یہ ازواجِ رسولؐ کی خوشنودی کا ایک اور سبب تھا۔ کیونکہ وہ دیکھتی تھیں کہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکمل اختیارات حاصل ہیں، لیکن پھر بھی حتی الامکان مساوات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آیت کے آخر میں اس سلسلۂ کلام کو اس جملے پر ختم کیا گیا ہے: جو کچھ تمہارے دلوں کے اندر ہے اسے خدا جانتا ہے اور وہ بندوں کے تمام اعمال اور مصلحتوں سے باخبر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حلیم بھی ہے اور بندوں کو عذاب و سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

(واللہ یعلم ما فی قلوبکم وکان اللہ علیماً حلیماً)

جی ہاں خدا جانتا ہے کہ تم خدا کے کس حکم پر دلی طور پر راضی ہو اور اسے تسلیم کرتے ہو اور کس کو ناپسند کرتے ہو؟

وہ جانتا ہے کہ تم کن بیویوں کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہو اور کن کی طرف تھوڑے مائل ہو؟ اور ایسے میلانات کے موقع پر کسی طرح حکم خدا کا لحاظ کرتے ہو؟

اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون لوگ پوشیدہ جگہوں میں بیٹھ کر پیغمبرؐ کے بارے میں اس قسم کے خدائی احکام پر اعتراض کرتے رہتے ہیں اور دل میں بھی آپ پر معترض ہیں اور کون خندہ پیشانی کے ساتھ ان سب کو قبول کرتے ہیں۔

اس بناء پر "قلوبکم" کی تعبیر بہت وسیع ہے۔ اس میں پیغمبر اسلام اور ان کی بیویاں بھی شامل ہیں اور وہ تمام مومنین بھی جو ان احکام کے ناتے تسلیم و رضا کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یا اعتراض اور انکار تو کرتے ہیں، لیکن اسے ظاہر نہیں کرتے۔

کیا یہ حکم آپؐ کی سب بیویوں کے بارے میں تھا؟

اسلامی فقہ میں خصائص پیغمبر کے باب میں یہ مسئلہ زیر بحث چلا آرہا ہے کہ آیا بیویوں کے درمیان اوقات کی مساوی تقسیم پیغمبر اسلامؐ پر بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح دوسرے مومنین پر یا نہیں اور یا آپؐ استثنائی اور اختیاری حکم کے حامل ہیں؟

ہمارے تمام فقہاء اور اہل سنت کے کچھ فقہا کے درمیان مشہور یہ ہے کہ آپ اس حکم سے مستثنیٰ تھے۔ اور اس کی دلیل میں وہ زیر بحث آیت کو پیش کرتے ہیں، جس میں خدا کہتا ہے:

"ترجی من تشاء منھن وتؤوی الیک من تشاء"

"جسے آپ چاہیں تاخیر میں ڈال دیں اور جسے چاہیں اپنے پاس رکھ لیں"

کیونکہ یہ جملہ پیغمبر اکرم کی تمام ازواج کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد آیا ہے، لہذا اس بات کا متقاضی ہے کہ جمع مؤنث کی ضمیر "ھن" ان سب کی طرف لوٹے اور اسی مطلب کو فقہا اور بہت سے مفسرین نے قبول کیا ہے۔

لیکن بعض حضرات اس ضمیر کو ان بیویوں کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، جنہوں نے حق مہر کے بغیر اپنے آپ کو رسول اللہ کے سپرد کر دیا تھا، حالانکہ اوّلاً تو تاریخی اعتبار سے یہ ثابت نہیں کہ اس حکم نے کوئی خارجی موضوع پیدا بھی کیا ہے یا نہیں؟ اور بعض کا نظریہ ہے کہ صرف ایک ہی مورد تھا، جس میں صرف ایک خاتون اس صورت سے رسالت مآبؐ کی زوجیت میں داخل ہوئیں، بہرحال اصل مسئلہ تاریخی لحاظ سے ثابت اور مسلم نہیں۔

ثانیاً یہ تفسیر ظاہر آیت کے خلاف ہے اور علماء نے اس آیت کی شان نزول کا جو ذکر کیا ہے، اس سے بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی بناء پر قبول کر لینا چاہیئے کہ مذکورہ بالا حکم عام ہے اور سب ازواج کے بارے میں ہے۔

۵۲۔ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا ۝

ترجمہ

۵۲۔ اس کے بعد آپ پر کوئی اور عورت حلال نہیں ہے اور نہ ہی آپ اپنی بیویوں کو دوسری بیویوں سے تبدیل کر سکتے ہیں (کہ کسی کو طلاق دے کر دوسری بیوی کو اس جگہ لے آئیں) ہر چند ان کا حسن و جمال آپ کو بھلا لگے، سوائے ان عورتوں کے جو کنیز کی صورت میں آپ کے ملک میں آجائیں اور خدا ہر چیز کا ناظر اور نگہبان ہے (اس طرح سے ہم نے قبائل کے اس دباؤ کو تجھ سے اٹھا لیا ہے کہ آپ ان کے ہاں سے بیوی کا انتخاب کریں)۔

تفسیر

ازواج رسولؐ کے بارے میں ایک اور اہم حکم:

اس آیت میں ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مربوط احکام میں سے ایک اہم حکم بیان ہوا ہے، خدا فرماتا ہے: اس کے بعد آپ پر کوئی دوسری عورت حلال نہیں ہے اور آپ کو حق نہیں پہنچتا کہ ان بیویوں کو دوسری بیویوں سے تبدیل کر لیں۔ اگرچہ ان کا حسن و جمال آپ کو بھلا لگے۔ سوائے ان عورتوں کے جو کنیز کی صورت میں آپ کے اختیار

ہیں آجائیں اور خدا ہر چیز پر ناظر اور نگہبان ہے: (لا یحل لک النساء من بعد ولا ان تبدل بھن من ازواج ولو اعجبک حسنھن الا ما ملکت یمینک وکان اللہ علی کل شیء رقیبا)۔

مفسرین اور فقہاء نے اس آیت کی تفسیر میں بہت کچھ گفتگو کی ہے اور اسلامی مآخذ میں بھی اس بارے میں مختلف روایات آئی ہیں۔ ہم پہلے تو اس آیت کا ظاہر مطلب بیان کریں گے جو اس سے پہلی اور بعد میں آنے والی آیات کے باہمی ارتباط سے پیدا ہوتا ہے، قطع نظر اس کے کہ مفسرین اس بارے میں کیا کہتے ہیں، پھر دوسرے مطلب کی طرف جائیں گے۔

"من بعد" کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بعد آپ کے لیے کوئی نئی شادی حرام ہے۔ اسی بناء پر لفظ "بعد" یا "بعد زمانی" کے معنی میں ہے، یعنی اس زمانے کے بعد آپ کے لیے کوئی نئی شادی حرام ہے۔ لہٰذا کسی نئی بیوی کو انتخاب نہ کریں۔ یا بعد اس کے کہ آپ نے اپنی بیویوں کو گزشتہ حکم خداوندی کے مطابق اختیار دے دیا ہے کہ یا تو آپ کے گھر میں سادہ زندگی گزاریں یا پھر علیحدہ ہو جائیں تو انھوں نے اپنی مرضی سے آپ کی زوجیت کو ترجیح دی ہے، تو اب اس کے بعد کسی اور عورت سے آپ کو شادی نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی ان میں سے کسی کو طلاق دے کر کسی اور بیوی کو اختیار کریں۔ بالفاظ دیگر نہ تو ان کی تعداد میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی موجودہ بیویوں کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ اس حکم کا فلسفہ: یہ حد بندی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کوئی نقص شمار نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک ایسا حکم ہے، جس کا فلسفہ بہت ہی گہرا ہے، کیونکہ تاریخی شواہد کی بناء پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مختلف افراد اور قبائل کی جانب سے مسلسل زور دیا جا رہا تھا کہ آپ اپنی زوجیت کے لیے ان کا رشتہ قبول فرمائیں اور مسلمان قبائل کا ہر شخص اس بات پر فخر محسوس کرتا تھا کہ ان کے خاندان کی کوئی عورت پیغمبر اسلام سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو، یہاں تک کہ جیسا ابھی بیان ہو چکا ہے کہ بعض عورتیں حق مہر کے بغیر تیار تھیں کہ اپنے آپ کو "ھبہ" کے عنوان سے آنحضرتؐ کے حلقہ ازدواج میں دے دیں اور غیر مشروط طور پر آپؐ سے شادی کریں۔

البتہ ان قبائل سے رشتہ ازدواج ایک حد تک آنحضرتؐ کی ذات اور ان کے سیاسی، سماجی اور اجتماعی مقاصد کے لیے گرہ کشا تھا، لیکن فطری بات ہے کہ کوئی چیز اگر حد سے گزر جائے تو خود ایک مشکل بن جاتی ہے، چونکہ ہر قبیلے کی یہی خواہش تھی کہ آپؐ کو رشتہ دیں اور اگر نبی اکرمؐ بھی ان سب کی خواہشات کو پورا کرنے لگ جاتے اور کچھ عورتوں کو صرف عقد کی صورت میں نہ کہ شادی اور بیاہ کی شکل میں اپنے دائرہ اختیار میں لے آتے تو اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اسی لیے تو خدائے حکیم ایک محکم قانون کے ذریعے آپ کو اس اقدام سے روک رہا ہے اور ہر قسم کے نئے ازدواج یا موجودہ عورتوں کی تبدیلی سے منع کر رہا ہے۔

اس دوران میں شاید کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے مقصود تک پہنچنے کے لیے یہ بہانہ بناتے تھے کہ آپ کی بیویاں عام

طور پر بیوہ ہیں اور ان میں سن رسیدہ خواتین بھی پائی جاتی ہیں۔ جو حسن و جمال سے محروم ہیں، لہٰذا مناسب ہے کہ آپؐ کسی حسین و جمیل عورت سے شادی کرلیں۔ قرآن خاص کر اس مسئلے کو مدنظر رکھ کر یہ بات زور دے کر کہتا ہے کہ اگر صاحب جمال عورتیں بھی ہوں تب بھی آپؐ ان سے حق ازدواج نہیں رکھتے۔

علاوہ ازیں حق شناسی کا تقاضا بھی ہے۔ کیونکہ آپ کی بیویوں نے آپ کے ساتھ جس وفا کا ثبوت دیا اور دُنیا کی ہر چیز پر سادہ اور روحانی زندگی کو ترجیح دی، خدا ان کے مقام کی حفاظت کے لیے پیغمبر اکرمؐ کو اس قسم کا حکم دے رہا ہے۔

باقی رہا کنیزوں کے بارے میں آنجناب کا مجاز و مختار ہونا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور پاکؐ درحقیقت آزاد عورتوں کی وجہ سے مشکلات میں مبتلا تھے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت نہیں تھی کہ اس حکم کو کنیزوں کے بارے میں بھی محدود کردیا جائے۔ اگرچہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس استثناء سے بھی استفادہ نہیں کیا گیا۔

یہ تھا وہ مفہوم جو آیت کے ظاہر سے واضح ہوتا ہے۔

۲۔ مخالف روایات: متعدد روایات میں سے بعض تو سند کے لحاظ سے ضعیف اور بعض قابلِ غور ہیں ان کے مطابق "لایحل لک النساء من بعد" کا جملہ ان عورتوں کی طرف اشارہ ہے، جن کی تحریم سورۂ نساء کی آیہ ۲۳ اور ۲۴ میں بیان ہوچکی ہے (یعنی ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی اور خالہ وغیرہ) ان روایات کے بعض کے ذیل میں یہ صراحت ہوئی ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کچھ عورتیں تو دوسرے لوگوں پر حلال ہوں، لیکن وہی رسالت مآبؐ پر حرام ہوں؟ کوئی عورت آپ پر حرام نہیں، سوائے ان کے جو سب پر حرام ہیں۔ [۱]

البتہ بعید نظر آتا ہے کہ یہ آیت ان آیات کی طرف اشارہ ہو جو سورۂ نساء میں گزر چکی ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان روایات میں سے بعض میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ "من بعد" سے مراد سورۂ نساء میں حرام شدہ عورتوں کے علاوہ ہے۔

اس بناء پر بہتر یہی ہے کہ ان روایات کی تفسیر سے چشم پوشی اختیار کی جائے جو اخبار احاد میں سے ہیں اور اصطلاحی الفاظ میں "اس کا علم اس کے اہل یعنی معصومینؑ پر چھوڑ دیں"، کیونکہ وہ روایات ظاہر آیات کے ساتھ میل نہیں کھاتیں اور ہمیں آیت کے ظاہر پر عمل کرنے کا حکم ہے اور مذکورہ اخبار در روایات ظنی ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ بہت سے حلقوں کا نظریہ ہے کہ زیر بحث آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہر قسم کی نئی شادی کرنے کو حرام قرار دیا، لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا اور آپ کو ازدواج کی اجازت مل گئی۔ لیکن آپؐ نے اس سے استفادہ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہ اس آیت "انا احللنا لک ازواجک اللاتی اٰتیت اجورھن ...." کو مذکورہ حکم کا ناسخ مانتے ہیں جو زیر بحث آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ لیکن ان کا نظریہ ہے کہ اگرچہ وہ آیت قرآن میں اس سے پہلے لکھی ہوئی ہے لیکن نازل اس کے بعد ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ فاضل مقداد "کنز العرفان" میں نقل کرتے ہیں کہ علماء کے درمیان مشہور فتویٰ اور نظریہ یہی ہے۔ [۲]

---

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۲۹۴، صفحہ ۲۹۵۔

[۲] کنز العرفان جلد ۲ صفحہ ۲۲۲۔

یہ نظریہ ایک تو مذکورہ بالا روایات کے ساتھ واضح تضاد رکھتا ہے۔ دوسرے ظاہر آیات کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ آیات کا ظاہر بتاتا ہے کہ "انا احللنالك ازواجك" والی آیت زیر بحث آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے اور نسخ کا مسئلہ قطعی و یقینی دلیل کا محتاج ہے۔

بہر حال آیت کے ظاہر سے زیادہ قابل اطمینان اور واضح ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے اور آیت کے مطابق ہر قسم کی نئی شادی یا بیویوں کی تبدیلی، اس اوپر والی آیت کے نزول کے بعد پیغمبر اکرم کے لیے حرام ہو گئی تھی اور اس حکم میں بہت بڑی مصلحت پوشیدہ ہے، جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

۳۔ آیا نکاح سے پہلے عورت کو دیکھا جا سکتا ہے؟

مفسرین کی ایک جماعت نے "ولو اعجبك حسنهن" کے جملے کو اس مشہور حکم کی دلیل سمجھا ہے جس کی طرف اسلامی روایات میں اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص کسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اسے نکاح سے پہلے اس حد تک دیکھ سکتا ہے کہ جس سے اس کی شکل صورت اور جسمانی ساخت واضح ہو سکے۔

اور اس حکم کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اچھی طرح دیکھ بھال کر اپنی بیوی کا انتخاب کر سکے تاکہ بعد کی ندامت اور پشیمانی سے بچ جائے جس سے عہد و پیمان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، جیسا کہ روایت میں ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص سے فرمایا:

جو شادی کرنا چاہتا تھا۔

"انظر اليها فانه احدران يدوم بينكما"

"پہلے سے اس عورت کو دیکھ لیں، کیونکہ یہ چیز سبب بنے گی کہ تمہارے درمیان مودت اور الفت پائدار رہے۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا:

"کیا مرد کسی عورت کے ساتھ شادی کرنے کی غرض سے اسے غور سے دیکھ سکتا اور اس کے چہرے اور پشت کی طرف نگاہ کر سکتا ہے؟

تو فرمایا:

"نعم لا بأس ان ينظر الرجل الى المرأة اذا اراد ان يتزوجها ينظر الى خلفها والى وجهها۔"

"ہاں کوئی حرج نہیں کہ جس وقت انسان کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے اسے دیکھ لے اور اس کے چہرے اور پشت کی طرف نگاہ کرے۔"[2]

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ صفحہ ۵۳۳۰۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۴ ابواب مقدمات النکاح باب ۳۵ حدیث ۲۔

البتہ اس سلسلے میں احادیث بہت موجود ہیں۔ لیکن بعض میں یہ تصریح ہوئی ہے کہ اس موقع پر شہوت اور لذت کی غرض سے نگاہ نہیں ہونی چاہیئے۔

یہ بھی واضح ہے کہ یہ حکم ان مواقع کے ساتھ مخصوص ہے، جب انسان واقعاً اس عورت کے بارے میں تحقیقات کرنا چاہے کہ اگر اس میں مطلوبہ شرائط پائی جائیں تو اس سے شادی کرے گا۔ لیکن اگر کسی نے ابھی تک شادی کا فیصلہ ہی نہیں کیا، تو وہ صرف شادی کے احتمال یا جستجو کے نام پر عورتوں کی طرف نظر نہیں کر سکتا۔

البتہ بعض مفسرین نے زیر بحث آیت میں یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ ان نگاہوں کی طرف اشارہ ہے، جو اتفاقیہ طور پر کسی عورت پر جا پڑتی ہیں تو اس صورت میں یہ آیت مذکورہ حکم پر دلالت نہیں کرے گی، بلکہ اس حکم کا مسلک صرف روایات ہوں گی۔ لیکن "ولو اعجبك حسنهن" (اگرچہ ان کا حسن آپ کو بھلا معلوم ہو) کا جملہ اتفاقیہ اور غیر ارادی نگاہوں کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ لہذا اس کی دلالت اس سے پہلے والے حکم پر بعید نظر نہیں آتی۔

۵۳۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا ○

۵۴۔ اِنْ تُبْدُوْا شَیْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ○

ترجمہ

۵۳۔ اے ایمان لانے والو! پیغمبرؐ کے گھروں میں داخل نہ ہونا، مگر یہ کہ تمہیں کھانا کھانے کی اجازت دی جائے (اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مقررہ

وقت سے پہلے نہ آؤ اور) کھانے کے وقت کی انتظار میں نہ بیٹھو، لیکن جب تمھیں دعوت ہو تو داخل ہو جاؤ اور جس وقت کھانا کھالو تو نکل جاؤ اور (کھانا کھا لینے کے بعد) بحث و مباحثہ اور باتیں کرنے کے لیے نہ بیٹھو۔ یہ عمل پیغمبر کو پریشان کرتا ہے مگر وہ تم سے شرم کرتے ہیں لیکن خدا حق (کے بیان کرنے) سے نہیں شرماتا اور جس وقت وسائل زندگی میں سے کوئی چیز (عاریتاً) ان (رسول کی بیویوں) سے طلب کرو تو درمیان میں پردہ حائل ہونا چاہیئے یہ کام تمھارے اور ان کے دل کو زیادہ پاک رکھتا ہے۔ اور تم حق نہیں رکھتے کہ پیغمبر خدا کو آزار (و اذیت) پہنچاؤ اور نہ ہی کبھی ان کے بعد ان کی بیویوں کو اپنی زوجیت میں لانا، کیونکہ یہ کام خدا کے نزدیک بہت بڑی جسارت ہے۔

۵۴۔ کسی چیز کو ظاہر کرو یا مخفی رکھو، خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں مفسرین نے یوں نقل کیا ہے:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب بنت جحش سے ازدواج کے موقع پر دعوت ولیمہ کا اچھا خاصا بندوبست کیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ اہتمام اس بنا پر تھا۔ تاکہ زمانہ جاہلیت کی اس غلط رسم کو توڑا جائے جو منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی کے ساتھ نکاح کی حرمت کے سلسلہ میں تھی اور اس رسم کو دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں ختم کر دیا جائے تاکہ معاشرے میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو جائے۔ نیز زمانہ جاہلیت کی اس غلط رسم کو بھی ختم کر دیا جائے کہ آزاد کردہ غلاموں کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح معیوب ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص خادم انس کہتے ہیں کہ آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ میں آپؐ کے اصحاب کو کھانے کی دعوت دوں، چنانچہ میں نے سب کو دعوت دی اور وہ ٹولیوں کی صورت میں آکر کھانا کھاتے اور حجرے سے باہر نکل جاتے۔ یہاں تک کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اب کوئی شخص باقی نہیں رہ گیا ہے کہ جسے میں نے دعوت دی ہو اور وہ نہ آیا ہو۔ تو آپؐ نے

فرمایا کہ بس ٹھیک ہے۔ اب دسترخوان بڑھاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تو سب لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔ لیکن تین افراد اسی طرح آپؐ کے حجرے میں بیٹھے رہے اور بحث و مباحثہ اور گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ جب ان کی گفتگو لمبی ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں بھی آپ کے ہمراہ کھڑا ہو گیا تاکہ وہ لوگ متوجہ ہو جائیں اور اُٹھ کر چلے جائیں۔ پیغمبر اکرمؐ باہر آ گئے حتیٰ کہ جناب عائشہ کے حجرے تک پہنچ گئے اور پھر لوٹ گئے۔ میں بھی آپ کی خدمت میں آیا اور دیکھا کہ وہ لوگ اسی طرح بیٹھے ہوئے ہیں تو زیر نظر آیت نازل ہوئی اور اس قسم کے مسائل کے سلسلے میں ضروری احکام کی تعلیم دی۔ [1]

نیز بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ہمسائے اور کبھی دوسرے لوگ معمول کے مطابق چیزیں عاریتاً لینے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض بیویوں کے پاس آتے۔ اگرچہ وہ اس زمانے کی سادہ زندگی کے مطابق کسی غلط کام کے مرتکب نہیں ہوتے تھے، لیکن ازواج رسول کی قدر و منزلت کے پیش نظر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اور مومنین کو حکم دیا گیا کہ جب رسول اللہؐ کے ہاں ان کی کسی بیوی سے کوئی چیز لینا چاہیں تو پردے کی اوٹ سے لیں۔

ایک اور روایت میں ہے:

رسول اللہؐ کے بعض مخالفین نے کہا:

"پیغمبرؐ کیونکر ہماری بعض بیوہ عورتوں کو اپنے نکاح میں لے آئے ہیں۔ بخدا جب اس دُنیا سے ان کی آنکھیں بند ہوں گی تو ہم ان کی بیویوں سے شادی کریں گے۔"

اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور آپؐ کے بعد آپؐ کی بیویوں سے شادی کی کلی طور پر ممانعت کر دی گئی اور اس سازش کو بھی ناکام بنا دیا گیا۔ [2]

تفسیر

اس آیت میں ایک بار پھر روئے سخن مومنین کی طرف ہے اور کچھ مزید احکام خصوصاً جو پیغمبر اکرمؐ اور خاندان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاشرت کے آداب سے متعلق ہیں۔ مختصر، واضح اور صریح جملوں میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ پیغمبرؐ کے گھروں میں بغیر اجازت کے ہرگز داخل نہ ہونا مگر جب تمہیں کھانا کھانے کے لیے اجازت دے دی جائے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ صحیح وقت پر آؤ نہ یہ کہ پہلے سے آ جاؤ اور کھانے کے وقت کے انتظار میں بیٹھے رہو: (یا ایھا الذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یؤذن لکم الی طعام غیر ناظرین اناہ) [3]

---

[1] مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۳۶۶ آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۳۶۶ و صفحہ ۳۶۷۔

[3] "اناہ" "الی یأنی" کے مادہ سے کسی چیز کا موقع آجانے کے معنی میں ہے، لیکن یہاں پر کھانے کی تیاری کے معنی میں ہے۔

قرآن اس طرح سے معاشرت کے ایک اہم ادب کو بیان کرتا ہے اور وہ بھی ایسے ماحول میں جہاں پر اس کا بہت کم لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ گفتگو پیغمبر اکرمؐ کے گھر کے بارے میں ہے، لیکن مسلم ہے کہ یہ حکم آپؐ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ کسی بھی موقع پر کسی کے گھر میں بھی بغیر اجازت کے داخل نہیں ہونا چاہیئے (جیسا کہ سورۂ نور کی آیت ۲۷ میں بھی آیا ہے) حتی کہ خود پیغمبر اکرمؐ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ جس وقت اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر میں جاتے تو باہر کھڑے ہو کر اجازت لیتے۔ بلکہ ایک دن جابر بن عبداللہ انصاری آپؐ کے ساتھ تھے، جہاں آپؐ نے اپنے لیے اجازت مانگی وہاں جابر کے لیے بھی اجازت طلب کی اور پھر اندر گئے۔[1]

علاوہ ازیں جس وقت مدعوین کو کھانے کی دعوت ہو تو انہیں وقت شناس ہونا چاہیئے اور بے موقع و محل صاحب خانہ کے لیے اسباب زحمت فراہم نہیں کرنے چاہئیں۔

اس کے بعد دوسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "لیکن جب تمہیں دعوت دی جائے تو اندر جاؤ اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو نکل جاؤ" (ولکن اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا)۔

یہ حکم درحقیقت گزشتہ حکم کی تاکید اور تکمیل ہے۔ یعنی نہ تو اس گھر میں بے وقت داخل ہونا چاہیئے، جہاں دعوت دی گئی ہے اور نہ ہی دعوت قبول کرنے میں بے پرواہی سے کام لینا چاہیئے اور نہ ہی کھانا کھا لینے کے بعد بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کی خلاف ورزی میزبانی کے لیے موجب زحمت ہے اور اخلاقی اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

تیسرے حکم میں فرمایا گیا ہے: "کھانا کھا لینے کے بعد دل لگی اور گفتگو کی مجلس پیغمبرؐ کے گھر میں (اور کسی بھی دوسرے میزبان کے گھر میں) نہ جماؤ" (ولا مستانسین لحدیث)۔

البتہ ممکن ہے کہ خود میزبان اس قسم کی مجلس خلوص و محبت کا خواہاں ہو تو ایسی صورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے، گفتگو اس لیے ہے جہاں صرف کھانا کھانے کی دعوت دی گئی ہے نہ کہ عیش و شب کی۔ تو اس قسم کے مقام پر کھانا کھا لینے کے بعد محلبوں کو ترک کر دینا چاہیئے خصوصاً جبکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر جیسا گھر ہو۔ جو عظیم ترین خدائی فرائض کے انجام پانے کا مرکز ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے مقام پر اسباب زحمت فراہم نہ کیے جائیں، جن سے وقت ضائع ہو۔ اس کے بعد اس حکم کی علت کو یوں بیان کیا گیا ہے: "یہ کام پیغمبر خدا کو اذیت و آزار پہنچاتا ہے، مگر وہ تم سے شرم کرتے ہیں۔ لیکن خدا حق بیان کرنے میں رو رعایت سے کام نہیں لیتا" (ان ذالکم کان یؤذی النبی فیستحیی منکم واللہ لا یستحیی من الحق)۔

البتہ رسول اللہ بھی ایسے مواقع پر بیان کرنے میں رو رعایت نہیں کرتے جو ذاتی نہیں ہوتے، کیونکہ یہ اچھا نہیں لگتا کہ انسان اپنے بارے میں آپ بات کرے۔ البتہ دوسروں کے بارے میں ہو تو بات کرنا بھی مناسب ہوتا ہے۔

یہ آیت بھی ایسے ہی موقع کی مناسبت سے ہے۔ اخلاقی اصولوں کا تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا دفاع خود نہ کریں بلکہ خدا ان کا دفاع کرے۔

---

[1] کافی جلد ۵ ص ۵۲۰۔

چہرہ چوتھا حکم پردے کے سلسلے میں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: "جس وقت ازواج رسول سے ضروریات زندگی کی کوئی چیز طلب کرنا چاہو تو پردہ کی اوٹ میں طلب کرو: (واذا سألتموھن متاعا فاسئلوھن من وراء حجاب)۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عربوں اور بہت سے دوسرے لوگوں میں سے معمول تھا کہ بوقت ضرورت ضروریاتِ زندگی کی کئی چیزیں وقتی طور پر ہمسایوں سے عاریتاً لی جاتی تھیں اور پیغمبر اکرم کا گھر بھی اس طریقہ کار سے مستثنیٰ نہیں تھا کبھی کبھار لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے بھی چیزیں عاریتاً لے لیتے۔ واضح رہے کہ ازواج رسولؐ کا لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آنا اگرچہ اسلامی حجاب کے ساتھ سہی، کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ لہٰذا حکم ہوگیا کہ آئندہ کے لیے یا تو پردہ کے پیچھے سے آکر چیز لیا کریں۔ یا پھر دروازے کے پیچھے سے۔

یہاں پر جو نکتہ قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں "حجاب" سے مراد عورتوں کا عام پردہ نہیں ہے۔ بلکہ اس پر ایک اضافی حکم ہے جو ازواج رسولؐ کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ یہ کہ لوگ اس بات کے پابند تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی حرمت کے پیشِ نظر جب کبھی آپ کی بیویوں سے کوئی چیز لینا چاہیں تو پردے کے پیچھے سے لیا کریں اور ازواجِ رسولؐ پردے کے ساتھ بھی لوگوں کے سامنے نہ آیا کریں۔

البتہ یہ حکم صرف ازواجِ رسولؐ سے مختص ہے اور عام عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی وہ اسلامی حجاب کے ساتھ عام لوگوں کے سامنے آسکتی ہیں۔

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ لفظ "حجاب" روزمرہ کے استعمال میں عورت کے پردے کے معنی میں آتا ہے، لیکن لغت میں اس کا یہ مفہوم نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے فقہاء نے اسے اس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

"حجاب" لغت میں اس چیز کے معنی میں ہے جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہوتی ہے[1]

اسی بنا پر جو پردہ انتڑیوں، دل اور پھیپھڑے کے درمیان موجود ہے اسے "حجاب حاجز" کا نام دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ ہر جگہ پردہ یا رکاوٹ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۵ میں ہے:

"جعلنا بینک وبین الذین لا یؤمنون بالآخرۃ حجابا مستورا"

"ہم نے تیرے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے پوشیدہ پردہ قرار دیا ہے"۔

سورۂ ص کی آیہ ۳۲ میں ہے:

"حتی توارت بالحجاب"

"یہاں تک کہ سورج افق کے پردے کے پیچھے پنہاں ہوا"۔

نیز سورہ شوریٰ کی آیت ۵۱ میں آیا ہے:

"وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب"۔

---

[1] لسان العرب مادہ "حجب"۔

"کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے، مگر وحی کے ذریعے یا پس پردہ (غیب) سے"۔

فقہاء کے کلمات میں قدیم الایام سے اب تک عورتوں کے پردے کے بارے میں عام طور پر "ستر" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اسلامی روایات میں بھی یہی یا اس سے ملتی جلتی تعبیر آئی ہے اور عورتوں کے پردے کے بارے میں لفظ "حجاب" کا استعمال ایسی اصطلاح ہے جو زیادہ تر ہمارے زمانے میں رائج ہوئی ہے اور اگر کسی تاریخ میں یا روایت میں بھی مل جائے تو بہت کم ایسا ہوگا۔

دوسرا شاہد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصوصی خادم انس بن مالک کہتے ہیں کہ میں اس آیت حجاب کے بارے میں سب سے زیادہ آگاہ ہوں۔ کیونکہ جب جناب زینب کی پیغمبر اکرم سے شادی ہوگئی اور وہ آپ کے گھر میں آگئیں تو آپ نے دعوتِ ولیمہ کا بندوبست کیا، لوگوں نے کھانا کھالیا، لیکن کچھ لوگ کھانا کھانے کے بعد اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوت النبی۔ تا۔ من وراء حجاب۔

تو اس وقت پردہ ڈال دیا گیا اور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے [1]

ایک اور روایت میں انس کہتے ہیں:

"ارخی الستر بینی وبینہ"

"پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا اور لوگوں نے جب یہ دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور منتشر ہو گئے"۔ [2]

اسی بناء پر اسلام نے مسلمان عورتوں کو پردہ نشینی کا حکم نہیں دیا اور عورتوں کے بارے میں "پردہ نشین" یا اس قسم کی دوسری تعبیریں اسلامی حیثیت نہیں رکھتیں، جو کچھ کسی مسلمان عورت کے لیے ضروری ہے، وہی اسلامی پردہ ہے، لیکن ازواج رسول کا معاملہ کچھ اور ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن بہت زیادہ تھے اور مفاد پرست ٹولہ اسی ٹوہ میں لگا رہتا تھا کہ کوئی موقع ہاتھ لگے اور ازواج رسول کو اپنی تہمت کا نشانہ بنائیں، تاکہ اس طرح سے سیاہ دل لوگوں کے ہاتھ میں دستاویز آجائے۔ لہٰذا انھیں یہ خاص حکم دیا گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں اُمت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ازواج رسول سے کوئی چیز طلب کرتے وقت ان سے پردے کی اوٹ میں بات کیا کریں۔ خصوصاً "وراء" کی تعبیر اس معنی کی گواہ ہے۔

اسی لیے قرآن مجید اس حکم کے بعد اس کے فلسفے کو یوں بیان کرتا ہے۔ "یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے بہتر ہے"۔ (ذالکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن)۔

اگرچہ تعلیل کی یہ قسم استحبابی کے منافی نہیں لیکن "فاسئلوھن" میں امر کے وجوب میں ظہور کو بھی متزلزل نہیں کرتی کیونکہ اس قسم کی تعلیل بعض اوقات دوسرے واجب احکام میں بھی آئی ہے۔

پانچویں حکم کو اس صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ تم حق نہیں رکھتے کہ رسول خدا کو تکلیف پہنچاؤ۔ وما کان لکم

---

[1] صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۲۵۔

[2] صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۲۵۔

ان تؤذوا رسول اللہ)۔

اگرچہ اذیت ناک اور تکلیف دہ عمل خود اسی آیت میں بیان ہوگیا ہے اور وہ ہے بے موقع و محل پیغمبر اسلامؐ کے گھر جانا، کھانا کھا لینے کے بعد بیٹھ جانا اور ان کے لیے مشکلات پیدا کرنا۔ اور شانِ نزول والی روایات میں بھی آیا ہے کہ بعض دل کے اندھوں نے قسم کھائی تھی کہ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کی بیویوں سے عقد کریں گے، یہ ایک اور تکلیف دہ بات تھی۔ لیکن آیت کا مفہوم ہر حالت میں عام ہے اور ہر قسم کی تکلیف اور اذیت پہنچانے سے منع کرتا ہے۔

آخر میں چھٹا اور آخری حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی ازواج کے ساتھ شادی کی حرمت کے بارے میں یوں بیان ہوا ہے: "تم ہرگز یہ حق نہیں رکھتے کہ رسول اللہ کے بعد آپ کی بیویوں کو اپنے حلقہ ازدواج میں لاؤ، کیوں کہ یہ کام خدا کے نزدیک بہت بڑی جسارت والا ہے" (ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا ان ذالکم کان عند اللہ عظیما)۔

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا نے کس طرح پیغمبر اکرمؐ کی بیویوں کو آپ کے بعد شادی کے حق سے محروم کر دیا۔ جبکہ بوقت وفات آپ کی کچھ بیویاں جوان بھی تھیں؟

اس سوال کا جواب حرمت کے فلسفے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ:

اولاً: جیسا کہ آیت کی شان نزول سے معلوم ہو چکا ہے کہ بعض لوگ آنحضرتؐ سے انتقام لینے اور آپ کی ذاتِ اقدس کی توہین کرنے کے لیے اس قسم کا ارادہ کر چکے تھے۔ اس طرح سے وہ چاہتے تھے کہ آنحضرت کی عزت اور عظمت پر ضرب لگائیں۔

ثانیاً: اگر یہ مسئلہ جائز ہوتا تو کچھ لوگ رسول اکرمؐ کی بیوہ کو اپنے حلقۂ زوجیت میں لے آنے کے بعد ممکن تھا کہ اس اقدام سے ناجائز مفاد حاصل کرتے اور اسے وہ معاشرے میں اپنی جھوٹی شہرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیتے یا اس عنوان سے کہ رسول اللہ کے گھریلو حالات سے باخبر ہیں اور ان کی تعلیمات اور مکتب کی خصوصی معلومات انھیں حاصل ہیں۔ لہٰذا اسلام میں تحریف کا ارتکاب کرتے۔ یا منافق لوگ، معاشرے میں ایسی باتیں پھیلانا شروع کر دیتے جو آنحضور کے شایانِ شان نہ تھیں۔ (غور کیجیے گا)

اس متوقع خطرے کو اس وقت تقویت ملتی ہے، جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے بالکل تیار کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اس کا زبانی طور پر اظہار بھی کر دیا تھا اور کچھ لوگوں نے شاید ابھی دل میں رکھا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں جن اشخاص کا بعض اہل سنت مفسرین نے یہاں پر نام لیا ہے ان میں سے ایک طلحہ بھی تھا۔[1]

وہ خدا جو نہاں اور آشکار را اسرار سے آگاہ ہے، اس نے اس قبیح سازش کو ظاہر کرنے کے لیے ایک فیصلہ کُن حکم صادر فرما دیا، جس سے ان تمام امور کا مکمل طور پر سدباب ہو گیا۔ اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے ازواج رسولؐ کو

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ صفحہ ۵۳۱۰۔

"ام المومنین" کا لقب دے دیا تاکہ لوگ جان لیں کہ ان سے عقد کرنا اپنی ماں سے ازدواج کرنے کے مترادف ہے۔

مذکورہ وجوہات کی بنا پر واضح ہو جاتا ہے کہ ازواج رسولؐ پر کیوں واجب قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ اس محرومیت کو خوشی خوشی گلے لگائیں؟

انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے اہم مسائل پیش آجاتے ہیں، جن کی خاطر اسے فداکاری اور قربانی کی مثالیں قائم کرنا پڑتی ہیں اور اپنے بعض مسلّم حقوق سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے، خاص طور پر جب عظیم اعزازات کے ساتھ عظیم اور سنگین ذمہ داریاں بھی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ازواج رسولؐ نے جب آپ سے عقد کر لیا تو انھیں ایک نہایت ہی عظیم اعزاز مل گیا۔ جب اس قدر عظیم اعزاز انہیں نصیب ہو گیا تو انہیں اسی قدر ایثار و قربانی کا مظاہرہ بھی کرنا چاہیئے تھا۔

اسی بنا پر ازواج رسولؐ، آپؐ کے بعد اسلامی اُمّہ کے درمیان نہایت ہی قابلِ احترام زندگی بسر کرتی رہیں اور اپنی اس کیفیت سے بہت ہی خوش تھیں اور نئے ازدواج سے محرومی کو اس اعزاز کے مقابلے میں حقیر اور ناچیز سمجھتی تھیں۔

خداوند عالم دوسری آیت میں لوگوں کو بڑی سختی کے ساتھ خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے "اگر کسی چیز کو تم آشکار اور ظاہر کرو یا مخفی رکھو، خدا بہرحال ان تمام امور سے آگاہ ہے" (ان تبدوا شیئاً او تخفوہ فان اللہ کان بکل شیء علیماً)۔

یہ گمان نہ کرو کہ خدا اپنے پیغمبرؐ کے بارے میں اذیت ناک اور تکلیف دہ منصوبوں سے باخبر نہیں، وہ تو ان سے بھی باخبر ہے جنہوں نے دل کا حال زبان پر جاری کیا ہے اور ان سے بھی جو دل میں رکھتے تھے، غرض کہ سب کو اچھی طرح سے جانتا ہے اور وہ ہر شخص سے اس کے کام اور نیت کے مطابق سلوک کرے گا۔

چند نکات

چونکہ زیر بحث آیات میں رسول پاکؐ کی طرف سے ایک دعوت کے اس موقعے پر مسلمانوں کے کچھ فرائض کا ذکر ہوا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "مہمان نوازی، مہمان کا حق اور میزبان کے فرائض" کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کا ایک گوشہ بیان کیا جائے۔

۱۔ مہمان نوازی: اسلام مہمان نوازی کے مسئلے کو خاص اہمیت دیتا ہے، یہاں تک کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"الضیف دلیل الجنۃ"

مہمان جنت کا راستہ ہے۔ [1]

مہمان کی اہمیت اور احترام اس قدر زیادہ ہے کہ اسلام میں اسے ایک آسمانی ہدیہ کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے،

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۵، صفحہ ۴۰ (حدیث ۱۸) باب ۹۳۔

ارشاد پیغمبرؐ ہے:

" اذا اراد اللہ بقوم خیرا اھدی الیھم ھدیۃ ،
قالوا وما تلک الھدیۃ؟
قال الضیف، ینزل برزقہ، ویرتحل بذنوب اھل البیت۔"

" جب خدا کسی قوم کی بہتری چاہتا ہے تو اس کی طرف انمول تحفہ بھیج دیتا ہے۔"
" لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ وہ انمول تحفہ کیا ہے۔
فرمایا مہمان، جو اپنا رزق لے کر آتا ہے اور گھر والوں کے گناہ لے کر جاتا ہے اور وہ بخشے جاتے ہیں۔[1]

قابل توجہ یہ ہے کہ کسی نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا:
میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں۔ میرا طرز عمل یہ ہے کہ مکمل وضو کرتا ہوں، نماز قائم کرتا ہوں، زکوٰۃ بر محل ادا کرتا ہوں اور مہمان کی خندہ پیشانی سے خدا کی خوشنودی کے لیے تواضع کرتا ہوں۔
تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

" بخ بخ بخ، مالجھنم علیک سبیل ان اللہ قد برأک من الشح ان کنت کذلک۔"

" کیا کہنا، مرحبا، واہ واہ، جہنم کے راستے تم پر بند ہیں اور اگر تیری حالت یہی ہے تو خدا نے تجھے ہر قسم کے بخل سے پاک کر دیا ہے۔"

اس سلسلے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن اختصار کو مدنظر رکھ کر اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۲۔ میزبانی میں سادگی: اس ساری اہمیت کے باوجود جو مہمان کو حاصل ہے، پر تکلف اور انواع و اقسام کے کھانے کھلانا اسلام کی نظر میں نہ صرف یہ کہ اچھا کام نہیں، بلکہ باقاعدہ طور پر اس سے منع بھی کیا گیا ہے۔ اسلام کا یہ حکم ہے کہ میزبانی اور خاطر تواضع سادہ قسم کی ہو اور اس نے مہمانی اور میزبانی کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کے طور پر ایک نہایت ہی منصفانہ حد بندی کر دی ہے اور وہ یہ کہ میزبان کے پاس جو کچھ موجود ہے اس سے پہلو تہی نہ کرے اور مہمان بھی اس سے زیادہ کی توقع نہ رکھے۔ اسی سلسلے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

" المؤمن لا یحتشم من اخیہ، وما ادری ایھما اعجب؟ الذی یکلف اخاہ اذا دخل علیہ ان یتکلف لہ، او المتکلف لاخیہ؟

" مومن اپنے مومن بھائی کے ساتھ بے تکلف ہوتے ہیں، میں نہیں جانتا کہ ان دو میں سے کون سا شخص زیادہ عجیب ہے، آیا وہ جو اپنے بھائی کے پاس جا کر اسے تکلف میں ڈال دیتا ہے یا وہ جو خود سے مہمان کے

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۵، صفحہ ۲۶۰ (حدیث ۴) باب ۹۳۔

لیے تکلف میں پڑجاتا ہے؟ [1]

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"ان لا تتکلف للضیف مالیس عندنا وان نقدم الیہ ما حضرنا"

"جو چیز ہمارے پاس نہیں ہے اس کے لیے مہمان کے واسطے تکلف نہ کریں اور جو موجود ہے اس سے پیشوتہی نہ کریں" [2]

۳۔ مہمان کا حق: ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں مہمان ایک آسمانی تحفہ اور خدائی عنایت ہے۔ اس کی عزت بھی اسی طرح کرنا چاہیئے، جس طرح اپنی عزت کی جاتی ہے اور اس کے بارے میں انتہائی احترام ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے حتیٰ کہ امیرالمومنین علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ:

"من حق الضیف ان تمشی معہ فتخرجہ من حریمک الی البر"

"مہمان کے حقوق میں سے یہ ہے کہ اسے خدا حافظ کہنے کے لیے گھر کے دروازے تک جائیں۔ [3] اور تکلف میں پڑے بغیر اس کے آرام و آسائش کے وسائل فراہم کیے جائیں۔ حتیٰ کہ ایک حدیث میں ہے کہ:

"قال رسول اللہ ان من حق الضیف ان یعدلہ الخلال۔ [4]

"مہمان کے حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے خلال تک مہیا کریں۔"

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہمان کم گو اور شرمیلے ہوتے ہیں اسی بنا پر حکم دیا گیا ہے کہ ان سے کھانا کھانے کے بارے میں نہ پوچھا جائے بلکہ دسترخوان بچھا دیا جائے، اگر ضرورت ہوگی تو کھالیں گے۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لا تقل لاخیک اذا دخل علیک اکلت الیوم شیئا؟ ولکن قرب الیہ ما عندک فان الجواد کل الجواد من بذل ما عندہ"

"جب تمہارا بھائی تمہارے پاس آئے تو اس سے یہ نہ پوچھو کہ آج تم نے کھانا کھایا ہے یا نہیں، بلکہ جو کچھ تمہارے پاس ہو، اس کے لیے حاضر کر دو۔ کیونکہ صحیح معنوں میں سخی وہی ہوتا ہے جو اس چیز کے خرچ کرنے میں گریز نہ کرے جو اس کے پاس ہے۔ [5]

خدا کی بارگاہ میں میزبان کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ جو کھانا اس نے تیار کیا ہے اسے حقیر نہ سمجھے، کیونکہ نعمت خدا جو

---

[1] بحار الانوار جلد ۵، صفحہ ۲۵۱۔
[2] مجمۃ البیضاء جلد ۳ صفحہ ۲۹ باب ثالث۔
[3] بحار الانوار جلد ۵، صفحہ ۲۵۵۔
[4] بحار الانوار جلد ۵، صفحہ ۲۵۵۔

بھی تو معزز اور محترم ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت مند اور تکلف کے دلدادہ لوگوں کے ہاں معمول ہے کہ دستر خوان کو جتنا بھی کھانوں سے بھر دیں، پھر بھی کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ یا کہتے ہیں کہ آپ کے شایان شان کھانا تیار نہیں ہوا وغیرہ۔ اسی طرح مہمان کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ اسے حقیر اور معمولی نہ سمجھے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ھلک امرؤ احتقر لاخیہ ما یحضرہ وھلک امرؤ احتقر من اخیہ ما قدم الیہ"

"میزبان نے اپنے بھائی کے لیے جو کچھ تیار کیا ہے، اگر وہ اسے حقیر سمجھے وہ ہلاک (و گمراہ) ہوگا۔ اسی طرح جو مہمان تیار شدہ چیز کو حقیر سمجھے وہ بھی ہلاک ہوگا۔"[1]

اسلام نے مہمان کی قدر دانی اور احترام کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ یہاں تک کہ فرمایا گیا ہے کہ جب مہمان تمہارے پاس آجائے تو آنے پر اس کی مدد کرو، لیکن گھر سے جاتے وقت اس کی مدد نہ کرو، مبادا اس کے دل میں خیال آجائے کہ آپ اس کے جانے کی ترکیبیں کر رہے ہیں۔"[2]

۴۔ مہمان کی ذمہ داری: ہمیشہ حقوق اور فرائض برابر کی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی جس طرح مہمان کے لیے میزبان کی کچھ اہم ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اسی طرح میزبان کی طرف سے مہمان پر بھی کچھ اہم ذمہ داریاں عاید ہیں۔ چنانچہ جو کچھ مذکورہ بالا احادیث میں بیان ہو چکا ہے، اس کے علاوہ بھی مہمان کا فریضہ ہے۔ جو کچھ اسے صاحب خانہ اپنے گھر میں پیش کرے، اسے قبول کرے، مثلاً جو کچھ بیٹھنے کے لیے حاضر کرے اسے قبول کرے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں،

"اذا دخل احدکم علی اخیہ فی رحلہ فلیقعد حیث یأمرہ صاحب الرحل فان صاحب الرحل اعرف بعورۃ بیتہ من الداخل علیہ"

جس وقت تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کے گھر میں داخل ہو تو جہاں وہ بیٹھنے کے لیے کہے وہیں بیٹھ جائے، کیونکہ صاحب خانہ اپنے گھر کی کیفیت اور ان حصوں سے جنہیں آشکار نہیں ہونا چاہیئے زیادہ واقف ہوتا ہے۔[3]

خلاصہ یہ کہ مہمان نوازی اور میزبانی کے آداب و فرائض اور اسلامی معاشرے میں اس کی خصوصیات بہت بحث طلب ہیں۔ جو لوگ اس سلسلے میں مزید وضاحت چاہتے ہیں، انہیں بحار الانوار کی جلد ۷، کتاب العشرۃ کے باب ۱ سے لے کر ۴ تک

---

[1] محجۃ البیضاء، جلد ۳ صفحہ ۳۰۔

[2] بحار الانوار، جلد ۵، صفحہ ۴۵۵ (حدیث ۱۲)۔

[3] بحار الانوار، جلد ۵، صفحہ ۴۵۱۔

اور کتاب "محجۃ البیضاء جلد ۳ باب "فضیلۃ الضیافۃ" کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مادیت پرستی کے اس دور میں یہ قدیم انسانی اور اخلاقی رسم محدود ہو کر رہ گئی ہے بلکہ بعض معاشروں میں تو قریباً ختم ہو چکی ہے۔ اور شنید میں آیا ہے کہ جب وہاں کے لوگ اسلامی ممالک میں آتے ہیں اور ان علاقوں میں کھلے دل سے مہمان نوازی کے روح پرور مناظر دیکھتے ہیں اور مہمانوں کے ساتھ گرمجوشی اور مہر و محبت کے سلوک کا مشاہدہ کرتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں کہ کس طرح یہ لوگ اپنے گھر میں موجود زندگی کے بہترین وسائل اور قیمتی غذائیں ایسے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے وقف کر دیتے ہیں جن سے تھوڑا بہت رابطہ ہے یا جن سے سفر کے دوران مختصر سی آشنائی ہوئی ہے۔ لیکن اگر اسلامی روایات کو مدنظر رکھا جائے کہ جن کا تھوڑا سا حصہ بیان ہوا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس قدر ایثار و فداکاری کی کیا وجوہات ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کہ اس بارے میں معنوی اور روحانی پہلو کو مدنظر رکھا جاتا ہے، جو مادیت کے پرستاروں کی سوچ اور حساب سے بالاتر ہے۔

۵۵۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْ آبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝

ترجمہ

۵۵۔ ان (ازواجِ رسول) پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد، اولاد، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، مسلمان عورتوں اور اپنے غلاموں سے (بغیر حجاب و پردہ کے ملیں)۔ اور اللہ کا تقوٰے اختیار کرو، کیونکہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ آیۂ حجاب (گذشتہ آیہ) کے نازل ہونے کے بعد ازواج رسولؐ کے آباؤ اولاد اور دیگر رشتہ داروں نے آپ کی خدمت اقدس میں عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم بھی ان کے ساتھ پردے کی اوٹ میں رہ کر بات کیا کریں؟ تو اس پر زیرِ نظر آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا کہ یہ حکم تمہارے لیے نہیں ہے۔

تفسیر

قانونِ حجاب سے مستثنٰی موارد:

چونکہ گزشتہ آیت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کے حجاب کے بارے میں ایک مطلق حکم آیا تھا

جس سے یہ گمان پیدا ہوتا تھا کہ ان کے محرم بھی اس حکم پر عمل کرنے کے پابند ہیں اور انھیں بھی ازواج رسولؐ سے پردے میں رہ کر ملاقات کرنا چاہیئے تو اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس حکم کی تشریح کر دی گئی۔

خدا فرماتا ہے "پیغمبر کی بیویوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپ، اولاد، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، مسلمان عورتوں اور اپنے غلاموں کے ساتھ بغیر حجاب کے ملاقات کریں" لا جناح علیھن فی اٰبائھن ولا ابنائھن ولا اخوانھن ولا ابناء اخوانھن ولا ابناء اخواتھن ولا نسائھن ولا ما ملکت ایمانھن۔

دوسرے لفظوں میں ان کے محرم جو ان چھ گروہوں پر منحصر ہیں، وہ مستثنیٰ ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کچھ اور افراد بھی تو محرم ہیں جن کا ان چھ گروہوں میں نام نہیں آیا مثلاً چچے اور ماموں وغیرہ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید چونکہ اپنی فصاحت و بلاغت کو اعلیٰ صورت میں ملحوظ رکھتا ہے اور اصولِ فصاحت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی اضافی لفظ گفتگو میں نہ آنے پائے۔ لہٰذا یہاں پر چچاؤں اور ماموؤں کے ذکر سے اجتناب کیا ہے۔ کیونکہ بھتیجیوں اور بھانجوں کے ذکر سے چچاؤں اور ماموؤں کا محرم ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ محرمیت ہمیشہ دونوں طرف سے ہوتی ہے، جس طرح کسی کا بھتیجا اس کا محرم ہوتا ہے، اسی طرح وہ بھی بھتیجے کے ساتھ محرم ہوگی (اور معلوم ہے کہ ایسی عورت انسان کی پھوپھی شمار ہوگی)۔ نیز جس طرح بھانجا کسی کا محرم ہوتا ہے، اسی طرح وہ بھی بھانجے کی محرم ہوگی (اور معلوم ہے کہ ایسی عورت اس کی خالہ شمار ہوگی)۔

جس طرح پھوپھی اور خالہ بھتیجے اور بھانجے کی محرم ہوگی تو چچا اور ماموں بھی تو بھتیجی اور بھانجی کے محرم ہوں گے۔ (کیونکہ چچا اور پھوپھی، نیز ماموں اور خالہ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے) اور یہ امر قرآن کے گہرے نکات میں سے ہے۔ (غور کیجئے گا)

یہاں پر ایک اور سوال پیش آتا ہے کہ شوہر کا باپ اور شوہر کا بیٹا بھی تو عورت کے محرم شمار ہوتے ہیں تو پھر یہاں پر ان کا ذکر کیوں نہیں آیا، جبکہ سورۂ نور کی آیت ۳۱ میں ان کو محرم کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں گفتگو صرف آنحضرتؐ کی بیویوں کے بارے میں ہے اور معلوم ہے ——— کہ ان آیات کے نزول کے وقت نہ تو آپ کے والدِ گرامی زندہ تھے نہ ہی اجداد اور نہ ہی آپ کا کوئی بیٹا تھا۔ (پھر غور کیجئے گا)۔ [1]

رضاعی بھائی بہنوں اور اس قسم کے دیگر افراد کا ذکر نہ کرنا بھی اسی بنا پر ہے کہ وہ بھی بھائی بہنوں اور دوسرے محرموں کے ضمن میں شمار ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

آیت کے آخر میں گفتگو کے لب و لہجہ "غائب" سے "خطاب" کی طرف تبدیل کر کے ازواجِ رسول کو مخاطب کرتے

---

[1] مورخین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین بیٹوں کا ذکر کیا ہے، قاسم اور عبداللہ (جن کا لقب طیب اور طاہر تھا) یہ دونوں حضرت خدیجہ کے بطن مبارک سے تھے اور مکہ میں بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اور تیسرے حضرت ابراہیم جو آٹھویں ہجری کو پیدا ہوئے اور ۱۶ یا ۱۸ ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔ بہرحال ان میں سے کوئی بھی سورۂ احزاب کے نزول کے وقت موجود نہیں تھا۔ ابراہیم اس واقعے کے بعد ہوئے اور بچپن ہی میں دنیا سے آنکھیں بند کر گئے۔ (اسد الغابہ اور تاریخ و رجال کی دوسری کتب کی طرف رجوع فرمائیں)۔

ہوئے قرآن کہتا ہے۔ "تقوٰی اختیار کرو، کیونکہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے" اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے" (واتقین اللہ ان اللہ کان علٰی کل شیء شہیدا)۔

کیونکہ حجاب اور اس قسم کے امور گناہ سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہیں اور بس۔ مقصود تو درحقیقت وہی تقوٰی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ ذرائع بھی کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔

یہاں پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "نسائہن" (ان کی عورتیں) ہم مذہب اور مسلمان عورتوں کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ جس طرح سورۂ نور کی تفسیر میں ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمان عورتوں کے لیے اچھا نہیں ہے کہ وہ غیر مسلم عورتوں کے سامنے بغیر پردہ کے آئیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ چیزیں اپنے شوہروں سے جاکر بیان کریں۔[1]

باقی رہا "ما ملکت ایمانہن" کا جملہ تو جیسا سورہ نور کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں کنیزیں بھی شامل ہیں اور غلام بھی، لیکن بعض روایات کے مطابق یہ حکم کنیزوں کے ساتھ مختص ہے۔ اسی بنا پر ممکن ہے کہ ان کا ذکر عورتوں کے کلی ذکر کے بعد اس لحاظ سے ہو کہ غیر مسلم کنیزیں بھی اس حکم میں شامل ہوں (غور کیجیے گا)

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۴ صفحہ ۳۰۶ سے بعد کی طرف رجوع فرمائیں (اردو ترجمہ)

۵۶۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

۵۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝

۵۸۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝

ترجمہ

۵۶۔ خدا اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر درود بھیجو اور سلام کرو اور ان کے فرمان پر سر تسلیم خم کرو۔

۵۷۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں، خدا انہیں دنیا اور آخرت میں اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور اس نے ان کے لیے خوار کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۵۸۔ اور جو اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو بلاوجہ اذیت پہنچاتے ہیں، وہ بہتان اور واضح

گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تفسیر[1]

آنحضرتؐ پر درود و سلام:

گزشتہ آیات میں پیغمبر اسلامؐ کی حرمت کی حفاظت کے لیے اور انہیں کسی قسم کی تکلیف اور آزار نہ پہنچانے کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور ان آیات میں پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خدا اور اس کے فرشتوں کا خصوصی تعلق اور لگاؤ بیان کیا گیا ہے۔ پھر اسی سے متعلق مومنین کو حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ کو دکھ پہنچانے والوں کے لیے دردناک عذاب اور ان کے منحوس انجام کی خبر دی گئی ہے۔ آخر میں ان لوگوں کے عظیم گناہ کا تذکرہ کرتا ہے جو مومنین کو تہمت کے ذریعے تکلیف پہنچاتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔ "خدا اور فرشتے نبی پر رحمت اور درود بھیجتے ہیں" (ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ اس قدر بلند و بالا ہے کہ عالم ہستی کا آفریدگار اور حق تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اس کائنات کی تدبیر کرنے والے فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں۔ اب جبکہ ایسا ہے تو تم بھی اس وسیع پیغام سے ہم آہنگ ہو جاؤ۔ "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ان پر درود بھیجو اور انھیں سلام کرو اور ان کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دو" (یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما)۔

وہ عالم آفرینش کا ایک انمول گوہر ہیں اور اگر خدا کی مہربانی سے تمھیں میسر ہیں تو مبادا انہیں ارزاں سمجھ لو، مبادا اس کی عظمت اور مقام کو فراموش کر دو جو خدا اور اس کے فرشتوں کے نزدیک ہے، وہ ایک ایسا عظیم انسان ہے، جو تمھارے ہی درمیان کھڑا ہے، لیکن وہ ایک عام انسان نہیں، بلکہ ایسا انسان ہے، جس کا وجود پوری کائنات کا خلاصہ ہے۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ "صلات" کی جمع "صلوات" ہے اور جس وقت اس کلمہ کو خدا کی طرف نسبت دی جائے تو رحمت نازل کرنے اور رحمت بھیجنے کے معنی میں ہوگا اور جب اس کی نسبت فرشتوں اور مومنین کی طرف ہو تو پھر طلب رحمت کے معنی میں ہوگا۔[2]

---

[1] یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ان آیات کی تفسیر کی ابتدا شب میلاد رسولؐ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ میں ہوئی ہے۔

[2] راغب نے مفردات میں اس مفہوم کو دوسرے لفظوں میں پیش کیا ہے۔

۲۔ "یصلون" کو فعل مضارع کی صورت میں لانا اس کے استمرار کی دلیل ہے، یعنی ہمیشہ خدا اور فرشتے اس پر رحمت بھیجتے اور درود بھیجتے رہتے ہیں، مسلسل اور جاودانی رحمت اور درود۔

۳۔ "صلوا" اور "سلموا" کے درمیان کیا فرق ہے؟ مفسرین نے اس پر بہت بحث کی ہے، لیکن جو کچھ ان دو الفاظ کے لغوی مفہوم اور قرآنی آیت کے ظاہری معنی سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ "صلوا" پیغمبر اکرم پر طلب رحمت اور درود بھیجنے کا حکم ہے۔

رہا "سلموا" تو وہ یا تو پیغمبر اسلام علیہ وآلہ وسلم کے احکام اور فرامین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۶۵ میں آیا ہے:

"ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما"

"مومن وہ ہیں جو آپ کے فیصلے کو دل و جان سے قبول کریں، حتیٰ کہ آپ کے کسی فیصلے میں ذرہ بھر بھی ناراضی کا اظہار نہ کریں، بلکہ مطلق طور پر تسلیم کریں"

نیز ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابوبصیر نے عرض کیا: پیغمبر اکرم پر صلوات بھیجنے کو تو میں سمجھ گیا ہوں، لیکن اس تسلیم کا کیا معنی ہے؟

تو امامؑ نے فرمایا:

"ھو التسلیم لہ فی الامور"

"ہر کام میں ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔"[1]

یا پھر پیغمبر اکرم پر "السلام علیک یا رسول اللہ" اور اس قسم کے کسی طریقے سے سلام بھیجنے کے معنی میں ہے، جس کا مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ خداوندی سے سلامتی کی درخواست کرنا ہے۔

ابو حمزہ ثمالی، پیغمبر اکرمؐ کے کعب نامی ایک صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا: آپ پر سلام کرنا تو ہم جانتے ہیں، لیکن صلوات کس طرح بھیجنی ہے؟ تو آپ نے فرمایا یوں کہا کرو:

"اللھم صل علی محمد و آل محمد کما صلیت علی ابراھیم انک حمید مجید، وبارک علی محمد و آل محمد کما بارکت علی ابراھیم و آل ابراھیم انک حمید مجید"

اس حدیث سے پیغمبر اکرم پر درود و صلوٰۃ کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے اور سلام کا معنی بھی۔[2]

---

[1] مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں اور دوسری حدیث شیعہ اور سنی کتابوں میں متعدد طریقوں سے قریب قریب ایک جیسی عبارتوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

[2] مجمع البیان اسی آیات کے ذیل میں یہ حدیث شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں متعدد طریقوں سے تقریباً ایک جیسی عبارتوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

اگرچہ سلام کے یہ دونوں معانی مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں ایک ہی نقطے کی طرف پلٹتے ہیں۔ اور وہ ہے پیغمبر اکرم کے حضور قولی اور عملی تسلیم کیونکہ جو شخص ان پر سلام بھیجتا ہے اور خدا سے ان کی سلامتی طلب کرتا ہے تو درحقیقت وہ ان سے اپنے عشق اور محبت کا ثبوت دیتا ہے اور انھیں واجب الاطاعت پیغمبر کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔

۴۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ پر صلوات بھیجنے کی کیفیت کے سلسلے میں بے شمار شیعہ اور سنی روایات میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ "محمدؐ پر صلواۃ بھیجتے وقت آلِ محمدؐ" کا اضافہ بھی کرو۔

درمنثور میں "صحیح بخاری"، "صحیح مسلم"، "سنن ابوداؤد"، "سنن ترمذی"، "سنن نسائی"، "سنن ابن ماجہ"، "ابن مردویہ" اور دوسرے راویوں نے کعب بن عجرہؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

"اما السلام علیک فقد علمنا فکیف الصلاۃ علیک؟"

"آپ پر سلام کرنا تو ہم جانتے ہیں، لیکن فرمایئے صلات کیسے بھیجی جائے؟"

تو آپؐ نے فرمایا۔ یوں کہو:

"اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم انک حمید مجید، اللھم بارک علی محمد وعلی آلِ محمد کما بارکت علی ابراھیم و آلِ ابراھیم انک حمید مجید"۔

سیوطی (تفسیر درمنثور کے مؤلف) نے اس حدیث کے علاوہ اٹھارہ دوسری احادیث بھی نقل کی ہیں، جن میں تصریح ہوئی ہے کہ صلوات میں "آل محمدؐ" کا بھی ذکر کرنا چاہیئے۔

ان احادیث کو اہل سنت کی مشہور و معروف کتب اور صحابہ کی ایک جماعت سے نقل کیا گیا ہے، جن میں ابن عباسؓ، طلحہ، ابو سعید خدری، ابوہریرہ، ابومسعود انصاری، بریدہ، ابن مسعود، کعب بن عجرہ اور امیر المومنین حضرت علیؑ شامل ہیں۔ [1]

برادران اہل سنت کی مشہور حدیث کی کتاب صحیح بخاری میں اس بارے میں متعدد احادیث نقل ہوئی ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے قارئین کرام اصل کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔ [2]

صحیح مسلم میں بھی اس سلسلے میں دو روایات آئی ہیں۔ [3]

تعجب کی بات ہے کہ اس کتاب میں باوجود یکہ ان دو احادیث میں محمد و آل محمد کا کئی بار باہم تذکرہ ہوا ہے، لیکن باب کا جو عنوان منتخب کیا گیا ہے وہ "باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (ذکر آل کے بغیر) ہے۔ [4]

---

[1] تفسیر درمنثور آیہ مذکورہ کے ذیل میں اور تفسیر المیزان جلد ۱۶، صفحہ ۳۹۵۔ صفحہ ۳۹۶ کے مطابق۔

[2] صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۵۱۔

[3] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۳۰۵ باب الصلاۃ علی النبی۔

[4] پاکستان میں بھی ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، کتب، رسائل اور تقاریر میں خصوصاً موحی صاحبان جب آنحضرت کا ذکر کرتے ہیں تو "صلی اللہ علیہ وسلم" (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اہل سنت اور متعدد شیعہ روایات میں "محمد" اور "آل محمد" کے درمیان لفظ "علی" کے ساتھ فاصلہ تک بھی نہیں ہے اور صلاۃ کی کیفیت اس طرح ہے: "اللھم صل علی محمد و آل محمد"

اس گفتگو کو ہم اسلام کے عظیم الشان پیغمبر کی ایک اور حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں: ابن حجر مکی اپنی کتاب صواعق محرقہ میں نقل کرتے ہیں کہ آنجناب نے ارشاد فرمایا:

"لا تصلوا علی الصلاۃ البتراء فقالوا وما الصلاۃ البتراء؟ قال تقولون اللھم صل علی محمد وتمسکون بل قولوا اللھم صل علی محمد و آل محمد"

"مجھ پر کبھی (ناقص اور) ادم بریدہ صلوات نہ بھیجا کرو۔"

اصحاب نے عرض کی: حضور! وہ ناقص صلوٰۃ کیا ہے؟

فرمایا: اگر فقط "اللھم صل علی محمد" کہو اور اس سے آگے نہ بڑھو اور رک جاؤ۔ بلکہ چاہیئے کہ یوں کہا کرو:

"اللھم صل علی محمد و آل محمد" [1]

انہی روایات کی بنا پر اہل سنت کے بزرگ فقہا کی ایک جماعت حضور ختمی مرتبت کے نام کے ساتھ "آل محمد" کے اضافہ کو نماز کے تشہد میں واجب سمجھتی ہے [2]

۵۔ آیا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلاۃ بھیجنا واجب ہے یا نہیں، اگر واجب ہے تو کہاں کہاں واجب ہے؟ یہ وہ سوال ہے، جس کا جواب فقہا نے دیا ہے۔

تمام فقہا شیعہ اسے نماز میں پہلے اور دوسرے تشہد میں واجب سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ باقی تمام مقامات پر مستحب جانتے ہیں۔ علاوہ ان احادیث کے جو اہل بیت کے طریقوں سے اس سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں، کتب اہل سنت میں بھی وہ روایات کم نہیں جو وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔

ان میں سے ایک مشہور روایت میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

"سمعت رسول اللہ یقول لا یقبل صلاۃ الا بطھور، وبالصلاۃ علی"

"میں نے رسول اللہ سے سنا انھوں نے فرمایا کہ نماز طہارت اور مجھ پر درود بھیجے بغیر قبول نہیں ہوگی۔" [3]

فقہاء اہل سنت میں سے امام شافعی دوسرے تشہد میں صلوٰۃ پڑھنا واجب سمجھتے ہیں اور امام احمد اور دوسرے کئی فقہا کے بارے میں دو طرح کی روایات نقل ہوئی ہیں، البتہ امام ابوحنیفہ جیسے بعض افراد اسے واجب نہیں سمجھتے [4]

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ہی لکھتے اور بولتے ہیں "آلہ" ادا نہیں کرتے تعجب ہے (مترجم)

[1] صواعق محرقہ ص ۱۴۳۔

[2] علامہ حلیؒ کتاب تذکرہ کی بحث تشہد میں اس قول کو تمام علماء شیعہ کے علاوہ امام احمد بن حنبل اور بعض شافعیوں سے بھی نقل کرتے ہیں۔

[3] تذکرہ علامہ حلی جلد ۱ ص ۱۲۶۔

لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت امام شافعی اس فتوے کو اپنے شعر میں نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یا اھل بیت رسول اللہ ! حبکم فرض من اللہ وفی القرآن انزلہ
کفاکم من عظیم القدر انکم من لم یصل علیکم لا صلاۃ لہ

"اے اہل بیت رسول! تمہاری محبت خدا کی جانب سے قرآن میں واجب قرار دی گئی ہے۔"
"تمہارے مقام کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ جو شخص تم پر درود نہ بھیجے اس کی نماز باطل ہے۔"[1]

بعد والی آیت حقیقت میں گزشتہ آیت کے نقطہ مقابل کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: "جو لوگ خدا اور اس کے رسول کو ایذا اور تکلیف پہنچاتے ہیں، خدا انھیں دنیا اور آخرت میں اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور ان کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کیے ہوئے ہے" (ان الذین یؤذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاٰخرۃ و اعد لھم عذابا مھینا)۔

پروردگار کو ایذا پہنچانے سے کیا مراد ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ مراد کفر و الحاد ہے، جو خدا کو غضبناک کرتا ہے کیونکہ خدا کے بارے میں آزار اور اذیت کا استعمال درحقیقت خدا کے غضب کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ خدا کو ایذاء دینے سے مراد رسول خدا اور مومنین کو ایذاء پہنچانا ہو اور یہاں پر خدا کا ذکر اس مطلب کو اجاگر کرنے کے لیے ہے۔ لیکن پیغمبر اسلام کی ایذاء کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اس میں ہر وہ کام شامل ہے جو آپ کو ایذاء پہنچائے خواہ وہ کفر و الحاد ہو یا احکام الٰہی کی مخالفت، نیز آپ کی طرف ناروا نسبتیں اور تہمتیں یا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں اپنے گھر دعوت دیں تو اس وقت آپ کے لیے زحمت اور مشقت پیدا کرنا۔ جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۵۳ میں ابھی گزر چکا ہے۔ یعنی "ان ذلکم کان یؤذی النبی .....": تمہارا یہ کام پیغمبر کو تکلیف دیتا ہے۔

یا وہ امر جو سورۂ توبہ کی آیت ۶۱ میں آچکا ہے کہ پیغمبر اکرم کو آپ کی مشفقانہ گفتگو کی وجہ سے دشمن آپ پر سادہ لوحی اور خوش فہمی کا الزام دیتے تھے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

"ومنھم الذین یؤذون النبی ویقولون ھو اذن"

"ان میں سے کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو نبی کو تکلیف پہنچاتے اور کہتے کہ وہ خوش فہم انسان ہیں جو ہر ایک کی بات پر کان دھر لیتا ہے۔"

اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔

یہاں تک کہ اس آیت کے ذیل میں وارد ہونے والی روایات سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خاندان رسالت خصوصاً حضرت

---

[1] "کتاب الغدیر" میں ان اشعار کی نسبت امام شافعی کی طرف "شرح المواھب زرقانی" جلد ۷، ص ۷ میں ایک اور جماعت سے بھی نقل کی گئی ہے۔

علیؑ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دختر نیک اختر حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کو تکلیف دینا بھی اسی آیت میں شامل ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری جزء پنجم میں آیا ہے کہ رسول خدا نے فرمایا۔

" فاطمۃ بضعۃ منی فمن اغضبھا اغضبنی "

فاطمہ میرا جگر کا ٹکڑا ہے، جو شخص اسے غضب ناک کرے گا وہ مجھے غضب ناک کرے گا۔[1]

یہی حدیث صحیح مسلم میں اس طرح آئی ہے،

" ان فاطمۃ بضعۃ منی یوذینی ما اٰذاھا "

" فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جو چیز اسے تکلیف دیتی ہے، وہ مجھے تکلیف دیتی ہے "[2]

آنحضرتؐ کا اس سے ملتا جلتا فرمان حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے:[3]

باقی رہا زیر بحث آیت میں لفظ تو جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اس کا معنی ہے "رحمتِ خدا سے دوری" یہ بالکل رحمت اور صلوٰۃ کے مدمقابل ہے، جس کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔

"لعن" اور رحمت الٰہی سے دھتکارا جانا اور وہ بھی خود خدا کی طرف سے کہ جس کی رحمت بے پایاں اور وسیع ہے، درحقیقت عذاب کی بدترین قسم ہے، خصوصاً جب کہ رحمت سے یہ دوری دنیا اور آخرت دونوں میں ہو۔ (جیسا کہ اسی آیت میں ہے) اور شاید اسی بناء پر "لعن" کا ذکر "عذاب مہین" سے پہلے ہوا ہے " اَعَدَّ " (تیار کر چکا ہے) کی تعبیر اس عذاب کی تاکید اور اہمیت کی دلیل ہے۔

❊ ❊ ❊

اس سلسلے کی آخری آیت مومنین کی ایذا کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور خدا اور پیغمبرؐ کے بعد اس امر کی حد سے زیادہ اہمیت بتاتی ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "جو لوگ صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کو اس کام کی وجہ سے جو انہوں نے انجام نہیں دیا آزار پہنچاتے ہیں وہ بہتان اور آشکار گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں" (والذین یؤذون المؤمنین والمؤمنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا واثما مبینا)۔

کیونکہ مؤمن، ایمان کی وجہ سے خدا اور اس کے رسول کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اسی وجہ سے یہاں پر خدا اور رسول کے بعد اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

" بغیر ما اکتسبوا " کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کسی ایسے گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے جو آزار و اذیت کا سبب ہو۔ یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس وقت ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے جو حد، قصاص یا تعزیر

---

[1] صحیح بخاری جزء ۵ صفحہ ۳۔

[2] صحیح مسلم جلد ۴ صفحہ ۱۹۰۳ (باب الفضائل فاطمہؑ)۔

[3] مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

کا موجب ہو تو پھر ان پر حدود و قصاص وغیرہ کے اجرا میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی یہ چیزیں شامل نہیں ہیں۔

"بھتان" کو "اثم مبین" پر مقدم کرنا اس کی اہمیت کی وجہ سے ہے، کیونکہ بہتان کا شمار عظیم ترین اذیتوں میں ہوتا ہے اور اس کا زخم نیزے اور خنجر کے زخم سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے، جیسا کہ کسی عرب شاعر نے کہا ہے:

جراحات السنان لها التيام ولا يلتام ما جرح اللسان

"نیزے کے زخم تو مندمل ہو سکتے ہیں، لیکن زبان کے زخم نہیں مل سکتے۔"

اسلامی روایات میں اس بات کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہم پڑھتے ہیں۔

خداوند عزوجل ارشاد فرماتا ہے:

"لیأذن بحرب منی من اذا عبدی المؤمن۔"

"جو شخص میرے مومن بندے کو تکلیف پہنچاتا ہے، وہ میرے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔"[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کچھ لوگ رہتے تھے جو مومنین کے خلاف غلط افواہیں پھیلاتے اور ان کی طرف ناروا باتیں منسوب کرتے تھے (حتی کہ خود پیغمبر اسلام بھی ان موذیوں کی زبان سے محفوظ نہیں رہ سکے تھے)۔ وہی لوگ جو دوسرے معاشروں خصوصاً موجودہ دور میں کم نہیں ہیں، ان کا کام نیک اور مقدس لوگوں کے خلاف سازشیں تیار کرنا، جھوٹ بولنا اور بہتان تراشی کرنا ہوتا ہے۔

قرآن مجید انہیں اپنے سخت ترین حملوں کا نشانہ بناتا ہے اور ان کے اعمال کو بہتان اور واضح گناہ قرار دیتا ہے۔ بعد والی آیات میں بھی اس سلسلے میں بات ہوگی۔

ایک اور حدیث میں جسے امام رضا علیہ السلام اپنے جدِ امجد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کرتے ہیں، اس طرح آیا ہے:

"من بهت مؤمنا او مؤمنة او قال فيه ما ليس فيه اقامه الله تعالى يوم القيامة على تل من نار حتى يخرج مما قاله فيه۔"

"جو شخص مومن مرد یا مومن عورت پر بہتان باندھے، یا اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کرے جو اس میں نہیں ہے، تو خدا اسے قیامت میں آگ کے ٹیلے پر قرار دے گا اور وہ اس وقت تک وہیں رہے گا، جب تک اپنے کیے کی سزا نہ پالے۔"[2]

---

[1] اصول کافی جلد ۲، صفحہ ۳۵۰۔

[2] بحار الانوار جلد ۵، صفحہ ۱۹۳۔

۵۹- یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ
نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ
جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ○
۶۰- لَىِٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّكَ
بِهِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَاۤ اِلَّا قَلِیْلًا ○
۶۱- مَّلْعُوْنِیْنَ ۚ اَیْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا
تَقْتِیْلًا ○
۶۲- سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ
لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ○

ترجمہ

۵۹- اے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مؤمنین کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے اوپر ڈال لیا کریں تاکہ (وہ کنیزوں اور گناہ سے آلودہ عورتوں سے الگ) پہچانی جائیں اور کسی کی طرف سے انہیں دکھ اور تکلیف نہ پہنچے اور (اگر اب تک خطا اور کوتاہی سرزد ہوئی ہے تو) خدا ہمیشہ غفور رحیم ہے۔

۶۰۔ اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو مدینہ میں جھوٹی خبریں اور بے بنیاد افواہیں پھیلاتے ہیں اپنی کارستانیوں سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے خلاف تیار کریں گے، پھر وہ تھوڑی سی مدت کے سوا آپ کے نزدیک اس شہر میں نہیں رہ سکیں گے۔

۶۱۔ اور ہر جگہ سے دھتکارے جائیں گے اور جہاں کہیں ملیں گے گرفتار کر لیے جائیں گے اور قتل کر دیئے جائیں گے۔

۶۲۔ گذشتہ اقوام میں خدا کی یہی سنت جاری رہی ہے اور آپ خدا کی سنت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

شانِ نزول

تفسیر علی بن ابراہیم میں پہلی آیت کی شان نزول یہ بیان کی گئی ہے کہ اس زمانے میں مسلمان عورتیں مسجد میں جا کر رسول پاکؐ کے پیچھے نماز پڑھا کرتی تھیں۔ رات کے وقت جب وہ مغرب اور عشاء کی نماز کے لیے جاتیں تو کچھ بے ہودہ اور اوباش نوجوان ان کے راستے میں بیٹھ جاتے اور اخلاق سے گری ہوئی باتیں کر کے انھیں تکلیف پہنچاتے اور ان کا راستہ روکتے۔ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ اچھی طرح سے پردہ کریں تاکہ واضح ہو سکے کہ یہ مسلمان عورتیں ہیں اور کوئی شخص مزاحمت کے لیے بہانہ نہ بنا سکیں۔

اسی کتاب میں دوسری آیت کی شان نزول اس طرح لکھی ہے کہ مدینہ میں منافقین کا ایک ٹولہ تھا جس کا کام یہ تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض موقعوں پر جنگ کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ آپ کے بارے میں مختلف افواہیں پھیلاتا، کبھی کہتا کہ پیغمبرؐ قتل ہو گئے ہیں، کبھی کہتا انھیں قید کر لیا گیا ہے، وہ مسلمان جو جنگ کرنے کی توانائی نہ رکھتے تھے اس سے انھیں سخت پریشانی ہوتی۔ جب پیغمبر اکرمؐ کے پاس اس امر کی شکایت کی گئی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان افواہ پھیلانے والوں کو سختی سے تنبیہ کر دی گئی۔[1]

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۳۰۷ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم۔

تفسیر

زبردست انتباہ:

خداوندِ عالم نے گذشتہ آیات میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کو ایذاء اور تکلیف پہنچانے کی ممانعت کے بعد یہاں پر اذیت کے ایک اور مورد کا ذکر کیا ہے اور اس سے نبٹنے کے دو طریقے بیان کیے ہیں۔ سب سے پہلے صاحبِ ایمان عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ایسا کام نہ کریں، جس سے بدطینت لوگوں کے ہاتھ کوئی بہانہ آسکے۔ اس کے بعد منافقین، چھیڑ خوانی کرنے والے اوباشوں اور افواہیں پھیلانے والے عناصر کو زبردست تنبیہ کی گئی ہے اور ایسی زبردست تنبیہ جس کی مثال قرآنی آیات میں بہت کم ملے گی۔

پہلے حصہ میں فرمایا گیا ہے۔ "اے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں تاکہ واضح ہو جائیں اور انہیں کوئی اذیت نہ پہنچا سکے" (یا ایھا النبی قل لازواجک و بناتک ونساء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذالک ادنی ان یعرفن فلا یؤذین)۔

"یعرفن" (پہچانے جانے) سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان اس بارے میں دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے متضاد بھی نہیں ہیں۔ پہلا یہ کہ اس زمانے میں معمول تھا کہ کنیزیں سر اور گردن کو چھپائے بغیر گھر سے باہر نکلتی تھیں۔ اور چونکہ یہ کیفیت اخلاقی لحاظ سے اچھی نہیں تھی، لہٰذا کبھی کبھی اوباش اور بے ہودہ قسم کے نوجوان ان سے چھیڑ خوانی کرتے تھے، لہٰذا یہاں پر آزاد مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اسلامی حجاب کی مکمل طور پر پابندی کریں تاکہ وہ کنیزوں سے جدا پہچانی جائیں اور بے ہودہ اور اوباش افراد کے لیے چھیڑ خوانی کا کوئی بہانہ نہ بنیں۔

واضح رہے کہ اس گفتگو کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اوباش اور بدقماش لوگوں کو کنیزوں سے چھیڑ چھاڑ کا حق حاصل ہو گیا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ بدفطرت لوگوں کے ہاتھوں میں کسی قسم کا بہانہ باقی رہنے نہ پائے۔

دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان عورتیں پردے کے بارے میں سہل انگاری اور بے پرواہی نہ برتیں، جیسا کہ بعض لاابالی قسم کی عورتیں پردہ کے ہوتے ہوئے بھی بے پردہ ہوتی ہیں اور ان کے جسم کے زیادہ تر حصے نمایاں ہوتے ہیں۔ جو بے ہودہ افراد کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔

"جلباب" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین اور اربابِ لغت نے اس کے چند ایک معانی ذکر کیے ہیں،

۱۔ "ملحفہ" (چادر) اور بڑا سا کپڑا جو دوپٹے سے بڑا ہوتا ہے اور سر اور گردن اور سینہ وغیرہ کو چھپا دیتا ہے۔

۲۔ مقنعہ اور خمار (دوپٹہ اور اوڑھنی)۔

۳۔ لمبا اور ڈھیلا ڈھالا کرتہ۔ [1]

اگرچہ یہ معانی آپس میں مختلف ہیں، لیکن ان سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ بدن کو ایسے کپڑے کے ذریعے چھپایا جائے۔ (توجہ رہے کہ "جلباب" جیم پر زبر اور زیر دونوں سے پڑھا جاتا ہے) لیکن زیادہ بہتر یہ نظر آتا ہے کہ اس سے مراد پہننے کا وہ کپڑا ہے جو دوپٹے سے بڑا اور چادر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ جیسا کہ "لسان العرب" کے مؤلف نے بیان کیا ہے۔

اور "یدنین" (قریب کریں) سے مراد یہ ہے کہ عورتیں اوڑھنیوں کو اپنے بدن کے قریب کریں تاکہ وہ ٹھیک طرح سے انھیں چھپا سکے نہ یہ کہ اسے آزاد چھوڑ دیں کہ جو کبھی ہٹ جائے اور بدن نظر آنے لگے۔ یعنی وہ اسے لپیٹے رکھیں۔

باقی رہی یہ بات کہ اس جملے سے بعض لوگ یہ استفادہ کرنا چاہتے ہیں کہ چہرے کو بھی چھپایا جائے، تو اس مفہوم کی کوئی دلیل نہیں ملتی اور بہت کم مفسرین نے اس آیت کے مفہوم میں چہرے کے چھپانے کو داخل سمجھا ہے۔ [2]

بہرحال اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پردے کا حکم آزاد عورتوں کے لیے اس سے پہلے نازل ہو چکا تھا، لیکن بعض عورتیں سادہ لوحی کی وجہ سے اس کی پابندی نہیں کرتی تھیں۔ اسی لیے یہ آیت تاکید کر رہی ہے کہ اس کی پابندی کرنے میں خوب توجہ سے کام لیں۔

چونکہ اس حکم کے نازل ہونے سے بعض صاحب ایمان عورتیں گذشتہ زمانے کی بابت فکر میں پڑ گئیں، لہٰذا آیت کے آخر میں اضافہ کیا گیا ہے: "خدا ہمیشہ غفور و رحیم ہے" (وکان اللہ غفورا رحیما)۔

اگر تم سے اب تک اس معاملے میں کوتاہی ہوئی ہے تو چونکہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھی لہٰذا خدا تمھیں بخش دے گا۔ توبہ کرو اور اس کی طرف لوٹ آؤ اور عفت و پاک دامنی اور حجاب کے فریضے کو اچھی طرح انجام دو۔

صاحب ایمان عورتوں کو پردے کی پابندی کا حکم دینے کے بعد دوسرے مسئلے یعنی اوباش اور اراذل افراد کی تکلیف دہ کارروائیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔ اگر منافقین اور بیمار دل لوگ نیز وہ افراد بھی جو مدینہ میں جھوٹی افواہیں پھیلاتے ہیں، اپنی کارستانیوں سے باز نہ آئے تو ہم بھی آپ کو ان کے خلاف اٹھائیں گے اور آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے پھر وہ ایک مختصر سی مدت کے علاوہ اس شہر میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے: (لئن لم ینتہ المنافقون والذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینۃ لنغرینک بھم ثم لا یجاورونک فیھا الا قلیلا)۔ [3]

---

[1] ملاحظہ ہوں یہ کتب: لسان العرب، مجمع البحرین، مفردات راغب، اقرب الموارد اور تاج العروس۔

[2] حجاب کے فلسفے اور اس کی اہمیت، اسی طرح ہاتھوں کے دکھائی دینے کے استثناء کے سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۱۴ سورۂ نور کی آیہ ۳۰ و ۳۱ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

[3] "قلیلا" یہاں پر ایک محذوف سے مستثنیٰ ہے اور تقدیری طور پر اس طرح تھا: "لا یجاورونک زمانا الا زمانا قلیلا"۔

"مرجفون" "ارجاف" کے مادہ سے ہے اور ایسی افواہیں پھیلانے کے معنی میں ہے جو دوسروں کو دکھ دینے کے لیے گھڑی جائیں اور یہ کلمہ دراصل "ارجاف" یعنی اضطراب اور تزلزل کے معنی میں ہے اور چونکہ افواہیں عام لوگوں میں اضطراب پیدا کر دیتی ہیں، لہٰذا یہ لفظ ان کے لیے بولا جاتا ہے۔

"نغرینک" "اغراء" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے، کسی کام کے انجام دینے یا کسی چیز کے حاصل کرنے کی دعوت دینا، جس میں ترغیب و تشویق اور برانگیختہ کرنا بھی شامل ہے۔

آیت کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں تین گروہ تخریب کاری میں مشغول تھے، ان میں ایک ٹولہ اپنے ناپاک عزائم پورا کرنا چاہتا تھا اور یہ کام باقاعدہ سوچی سمجھی سکیم اور منظم منصوبے کے تحت انجام دیتا تھا نہ کہ شخصی اور انفرادی صورت میں پہلے تو وہ منافقین تھے جو اسلام کے خلاف اپنی سازشوں سے اسے تباہ کر دینا چاہتے تھے۔

دوسرے وہ اوباش اور آوارہ لوگ تھے، جنہیں قرآن پاک "دل کے بیمار" قرار دیتا ہے (الذین فی قلوبھم مرض) جیسا کہ یہی تعبیر اسی سورۂ (احزاب) کی آیت ۳۲ میں بھی ہوا و ہوس کے مریض و شہوت پرست افراد کے بارے میں آئی ہے:

"فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض"۔

"اے ازواج رسول! جس وقت بات کرو تو نرمی کے ساتھ بات نہ کیا کرو، وگرنہ دل کے مریض لوگ تمہارے بارے میں طمع کرنے لگ جائیں گے۔"

تیسرے وہ لوگ تھے، جن کا کام مدینہ میں افواہیں پھیلانا تھا خصوصاً ایسے مواقع پر جب پیغمبر خدا اور لشکر اسلام جنگ کو جاتے تو وہ مدینہ میں رہ جانے والے لوگوں کے حوصلے پست کرنے اور ان کے دلوں کو کمزور کرنے کے لیے رسول پاک اور مومنین کی شکست کی خبریں پھیلانا شروع کر دیتے تھے۔

بعض مفسرین کے بقول یہ یہودیوں کا گروہ تھا۔ بہرحال قرآن مجید نے تینوں گروہوں کو زبردست سرزنش کی ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تینوں تخریبی پروگرام منافقین کی کارستانیاں تھیں ان کو الگ الگ کر کے اس لیے پیش کیا گیا تاکہ ان کے طریقۂ واردات کو واضح کر کے بتا دیا جائے۔

بہرحال قرآن کہتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے اس قبیح اور ناشائستہ کام کو جاری رکھا تو ہم ان کے خلاف ایک عمومی حملے اور یورش کا حکم صادر کر دیں گے تاکہ مؤمنین کے ایک ہی مردانہ وار اقدام سے مدینہ کے تمام منافقین کی بیخ کنی ہو جائے اور پھر وہ کبھی اس شہر میں رہنے کے قابل نہ رہ سکیں۔

اور جب وہ اس شہر سے نکال دیئے جائیں گے اور اسلامی حکومت کی حفاظت سے محروم ہو جائیں گے "تو جہاں کہیں بھی ملیں گے دھر لیے جائیں گے اور قتل کر دیئے جائیں گے" (ملعونین اینما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتیلا)۔

"ثقفوا" "ثقف" اور "ثقافت" کے مادہ سے بڑی مہارت کے ساتھ کسی چیز کو حاصل کرنا یہ جو کلچر کو "ثقافت" کہا جاتا ہے تو وہ بھی اس مفہوم کی بنا پر ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اس عمومی حملے کے بعد کہیں بھی امان نہیں پاسکیں گے اور انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے گا۔

آیا اس آیت سے مراد یہ ہے کہ انھیں مدینہ سے باہر تلاش کر کے قتل کر دیا جائے؟ یا عمومی جلاوطنی کے حکم کے بعد اگر مدینہ میں رہ جائیں گے تو اس قسم کے انجام سے دوچار ہوں گے؟ اس بارے میں دو احتمال ہیں اور دونوں میں کسی قسم کا تضاد موجود نہیں، وہ اس لحاظ سے کہ اس سازشی، بیمار دل اور افواہیں پھیلانے والے تخریب کار ٹولے سے جب اسلامی حکومت اپنی حفاظت کی ذمہ داری اٹھا لے گی تو انھیں مدینہ سے نکل جانے کا حکم مل جائے گا تو پھر وہ وہیں پر رہ جائیں یا وہاں سے نکل جائیں، شجاع اور جاں بکف مسلمان انہیں کہیں بھی امان سے نہیں رہنے دیں گے۔

پھر آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے بلکہ "یہ خدا کی ہمیشہ سنت ہے جو گذشتہ اقوام میں بھی تھی، کہ جس وقت کوئی تخریب کار اور مفسد ٹولہ بے شرمی کا مظاہرہ کرے اور سازشیں کرنے میں حد سے بڑھ جاتا تھا تو ان کے لیے عمومی حملے کا حکم صادر ہو جاتا تھا (سنة الله فی الذین خلوا من قبل)۔

اور چونکہ یہ حکم ایک خدائی سنت ہے، لہٰذا اس میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی، کیونکہ "تم خدا کی سنت کے لیے کبھی تغیر اور تبدیلی نہیں پاؤ گے" (ولن تجد لسنة الله تبدیلا)۔

یہ تعبیر حقیقت میں اس تنبیہ کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنانے کو واضح کرتی ہے کہ وہ جان لیں کہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی، لہٰذا انھیں چاہیئے کہ یا تو اپنے شرمناک اعمال میں تبدیلی پیدا کریں یا پھر اس قسم کے دردناک انجام کے انتظار میں رہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ پہل خود سے کرنا چاہیئے: جو حکم ان آیات میں اسلامی حجاب کو مکمل طور پر ملحوظ رکھنے کے سلسلے میں آیا ہے اور قرآن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہے کہ یہ حکم پہنچا دو تو پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی ازواج کو مدِ نظر رکھا گیا ہے، پھر آپ کی اولاد پھر مومن عورتیں اور یہ اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ ہر قسم کی اصلاح کا آغاز اپنے آپ اور اپنے گھرانے سے کرنا چاہیئے اور یہی لائحہ عمل بنی نوع انسان کے تمام مصلحین کے لیے ہے۔

بیویوں اور اولاد میں سے پہلے بیویوں کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ انسان کے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، جبکہ اولاد کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے شوہروں کے گھر منتقل ہو جاتی ہیں۔

۲۔ دونوں طریقوں سے بچاؤ: چونکہ اجتماعی برائیوں کا عام طور پر ایک سبب نہیں ہوتا، بلکہ کئی اسباب ہوتے ہیں لہٰذا ان کا ہر طرف سے مقابلہ ہونا چاہیئے۔ مذکورہ بالا آیات میں بدمعاش اور آوارہ لوگوں کی شرارتوں سے نمٹنے کے لیے صاحب ایمان عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسا کوئی کام نہ کریں، جس سے اُن کے ہاتھ کوئی بہانہ آجائے اور دوسری طرف چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو زبردست سرزنش اور تنبیہ کے ساتھ روکا گیا ہے اور یہ ایک دائمی

اور عمومی طریقہ ہے کہ دوست کی اصلاح کرنا چاہیئے اور دشمن کا طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے۔

۳۔ مسلمانوں کی طاقت و پوزیشن: ان آیات کی سخت اور طاقت پر مبنی تنبیہات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جب بنی قریظہ کا ماجرا ختم ہو گیا اور مسلمانوں کے اس داخلی دشمن کی بیخ کنی ہو گئی تو مدینہ میں مسلمانوں کی پوزیشن پورے طور پر مستحکم ہو گئی۔ اب صرف ان منافقین کی طرف سے مخالفت ہوتی تھی جو بطور ناشناختہ مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے، یا پھر اوباش و آوارہ لوگ تھے یا پھر افواہیں پھیلانے والے۔ لہٰذا اس موقع پر آنحضرت نے ان سے طاقت کی زبان میں بات کی اور خبردار کیا کہ اگر وہ اپنے زہریلے پروپیگنڈے اور ناپاک سازشوں سے دست بردار نہ ہوئے تو ایک ہی حملہ سے ان کا حساب چکا دیا جائے گا، چنانچہ اس فیصلہ کن اور سوچی سمجھی تنبیہ نے اپنا اثر دکھا دیا۔

۴۔ فساد کو جڑ سے کاٹ دو: اسلام کے خلاف سازش کرنے والے منافقوں، مسلمانوں کی ناموس سے چھیڑ خانی کرنے والوں اور افواہیں پھیلانے والوں کی فتنہ پردازیوں سے نمٹنے کے لیے مندرجہ بالا آیات نے جو طریقہ کار بتایا ہے، آیا وہ تمام زمانوں میں اور تمام اسلامی حکومتوں کے لیے بھی اپنانا جائز ہے؟

اس بارے میں بہت کم مفسرین نے بحث کی ہے، لیکن یوں نظر آتا ہے کہ یہ حکم باقی اسلامی احکام کی طرح کسی زمان و مکان اور اشخاص کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتا۔

اگر واقعاً زہریلا پروپیگنڈہ اور سازش حد سے گزر جائے اور ایک تحریک کی صورت اختیار کر لے اور اسلامی معاشرے کو صحیح معنوں میں خطرات سے دوچار کر دے تو کیا حرج ہے کہ اسلامی حکومت مندرجہ بالا آیات کے حکم کو نافذ کر دے اور لوگوں کو فساد کی جڑیں کاٹنے کے لیے ایک جھنڈے تلے جمع کر لے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے امور خاص کر جنہیں تبدیل نہ ہونے والی سنت کہا گیا ہے، ان کا نفاذ انسان از خود نہیں کر سکتا بلکہ صرف اور صرف مسلمانوں کے ولی و سرپرست اور حاکم شریعت کی اجازت سے نافذ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ خدا کی اٹل سنتیں: ان آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قرآن نے خدا کی تبدیل نہ ہونے والی سنتوں میں سے ایک سنت یہ بتائی ہے کہ سازشیں کرنے والوں کی بیخ کنی کے لیے ایک عمومی حملے کا حکم دیا، اور یہ چیز گذشتہ امتوں میں بھی تھی۔ اس جیسی تعبیر قرآن مجید کے ایک اور مقام پر بھی آئی ہے۔

منجملہ ان کے اسی سورہ احزاب کی آیت ۳۸ میں زمانۂ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کی اجازت صادر کی گئی ہے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے عقد جائز ہے، پھر فرمایا گیا ہے:

"پیغمبر کے لیے جرم اور گناہ نہیں ہے کہ وہ امر الٰہی کو نافذ کریں چاہے جو بھی ہو"

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے:

"سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل وکان امر اللہ قدرا مقدورا"

یہ پروردگار کی سنت ہے جو گذشتہ اقوام اور انبیائے ماسلف میں بھی تھی اور خدا کا فرمان ثابت اور اٹل معیار پر قائم ہے۔

سورۂ فاطر کی آیت ۴۳ میں کفار اور مجرم اقوام کو ہلاکت کی تنبیہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے،

" فھل ینظرون الا سنۃ الاولین فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا "

" کیا وہ اسی بُرے انجام کا انتظار کرتے ہیں، کہ جس نے پہلی قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، لیکن آپ کبھی سُنّت الٰہی میں تبدیلی نہیں پائیں گے اور نہ ہی سُنّت الٰہی کے لیے کوئی تغیر ہے۔"

سورہ مؤمن کی آیت ۸۵ کے مطابق گذشتہ اقوام میں سے ہٹ دھرم کفار نے جب تباہ کن عذاب کا مشاہدہ کیا تو اس موقع پر ایمان کا اظہار کیا، لیکن ایسا ایمان ان کے لیے مفید ثابت نہ ہوسکا۔ ارشاد ہوتا ہے،

" سنۃ اللہ التی قد خلت فی عبادہ وخسر ھنالک الکافرون "

" یہ خدائی سنت ہے جو گذشتہ زمانے میں بھی اس کے بندوں میں جاری ہوچکی ہے اور وہاں کفار نقصان اور خسارے میں گرفتار ہوئے۔"

نیز سورۂ فتح کی آیت ۲۳ میں مومنین کی کامیابی، کفار کی شکست اور جنگوں میں ان کے لیے یار و مددگار نہ ہونے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے،

" سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا "

" یہ پروردگار کی سنت ہے جو گذشتہ زمانے میں بھی تھی اور خدا کی سُنّت ہرگز تبدیل نہیں ہوتی۔"

نیز سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۶ میں جہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جلاوطن کرنے یا ان کا کام تمام کرنے کی سازش کو بیان فرمایا گیا ہے،

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے،

" اگر وہ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پناتے تو وہ بھی آپ کے بعد زیادہ دیر باقی نہ رہتے "

" سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسُنّتنا تحویلا "

" یہ ان پیغمبروں کی سنت ہے، جنھیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے اور آپ ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھ پائیں گے "

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ ایسے مواقع پر "سنت" سے مراد خدا کے "تشریعی" یا "تکوینی" ثابت اور اساسی قوانین ہیں، جن میں کبھی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں عالم تکوین و تشریع میں خداوندِ عالم کے کچھ اصول و قوانین ہیں، جن میں کسی وقت بھی تبدیلی رونما نہیں ہوتی اور یہ انسانوں کے ساختہ و پرداختہ قوانین کی طرح تبدیلی کا شکار نہیں ہوتے یہ قوانین اقوام گذشتہ پر بھی حکم فرما تھے اور آئندہ بھی نافذ رہیں گے۔

انبیاء کی مدد کرنا، کفار کو شکست دینا، خدائی احکام پر ضروری عمل کرنا خواہ ماحول اسے ناپسند کرے، عذاب الٰہی کے

نازل ہونے کے وقت توبہ کا مفید نہ ہونا اور اس قسم کے دوسرے امور ان دائمی سُنّتوں کا حصہ ہیں۔

اس قسم کی تعبیریں ایک طرف تو راہِ حق کے تمام راہیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور انھیں سکون کی نعمت عطا کرتی ہیں اور دوسری طرف انبیاء کے اتحاد اور نظام آفرینش اور انسانوں کی زندگی کے نظام پر حاکم قوانین کے یکساں ہونے کو واضح کرتی ہیں جو درحقیقت دلائل توحید میں سے ہے۔

۶۳- یَسْئَلُکَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَکُوْنُ قَرِیْبًا ۝

۶۴- اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِیْرًا ۝

۶۵- خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۚ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ۝

۶۶- یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝

۶۷- وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ۝

۶۸- رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا ۝

ترجمہ

۶۳- لوگ آپ سے قیامت (کے وقت) کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے: اس کا علم صرف خداوندِ عالم کے پاس ہے۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ شاید قیامت نزدیک ہو۔

۶۴۔ خدا نے کافروں پر لعنت کی ہے (اور انھیں اپنی رحمت سے دُور رکھا ہے) اور ان کے لیے جلانے والی آگ تیار کر رکھی ہے۔

۶۵۔ وہ اس میں ابد تک رہیں گے اور وہاں ان کا نہ کوئی سرپرست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔

۶۶۔ وہ دن جس میں ان کے چہرے (جہنّم کی آگ کے باعث) تبدیل ہو جائیں گے (اور وہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے اور) کہیں گے اے کاش ہم نے خدا اور پیغمبر کی اطاعت کی ہوتی۔

۶۷۔ اور کہیں گے خداوندا! ہم نے اپنے بڑوں اور وڈیروں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔

۶۸۔ پروردگارا! تو انھیں دُوگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت فرما۔

تفسیر

قیامت کب آئے گی؟

گذشتہ آیات اشرار اور منافقین کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں ان آیات میں ان کے تخریبی منصوبوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کبھی تو وہ استہزاء اور مسخرہ پن کے طور پر اور کبھی سادہ دل لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے یہ سوال پیش کرتے تھے کہ قیامت ان اوصاف کے ساتھ جو محمدؐ بیان کرتے ہیں، کب برپا ہوگی؟ ارشاد ہوتا ہے۔ "لوگ آپ سے قیام قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں" (یسئلک الناس عن الساعۃ)۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بعض مومنین بھی تحقیق اور جستجو کی غرض سے یا معلومات میں اضافہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قسم کا سوال کرتے ہوں، لیکن بعد والی آیات کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ پہلی تفسیر آیت کے معنی سے زیادہ قریب ہے۔

اس بات کی گواہ ایک اور آیت ہے جو اس بارے میں سورہ شوریٰ میں آئی ہے:

"وما یدریک لعل الساعۃ قریب یستعجل بھا الذین لا یؤمنون بھا والذین اٰمنوا مشفقون منھا ویعلمون انھا الحق"

"آپ کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہو، لیکن جو لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے اس کے لیے جلدی کرتے ہیں البتہ مومنین اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ حق ہے۔

(شوریٰ ۱۷ و ۱۸)

اس کے بعد موجودہ آیت میں انھیں اس طرح جواب دیا گیا ہے۔"اے پیغمبر! کہہ دیجیے اس بات کا علم صرف خدا کے پاس ہے اور خدا کے علاوہ دوسرا کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں"(قل انما علمھا عند اللہ)۔

خواہ وہ انبیاء مرسل ہوں یا ملک مقرب کوئی بھی یہاں باخبر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

پھر فرمایا گیا ہے۔"آپ کو کیا معلوم شاید قیامت نزدیک ہو"(وما یدریک لعل الساعۃ تکون قریبا)۔

اسی بنا پر ہمیشہ قیامت کے انتظار میں رہنا چاہیئے اور اصولی طور پر اس کے مخفی رہنے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو امان میں نہ سمجھے اور قیامت کو دور خیال نہ کرے اور خود کو عذاب اور خدائی سزا سے محفوظ تصور نہ کرے۔

اس کے بعد کفار کو تنبیہ اور اس کے دردناک عذاب کی نوعیت کا ایک گوشہ پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔"خدا نے کافروں کو اپنی رحمت سے دور کردیا ہے اور ان کے لیے جلانے والی آگ فراہم کر رکھی ہے"(ان اللہ لعن الکافرین واعد لھم سعیرا)۔

"وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جلانے والی آگ میں رہیں گے اور اپنے لیے کوئی سرپرست اور مددگار نہ پائیں گے"(خالدین فیھا ابدا لا یجدون ولیا ولا نصیرا)۔

خدا ہی تو ہے جو کسی کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اپنے مقصد تک پہنچ جائے، لیکن قیامت کے دن کفار کا نہ تو کوئی ولی ہوگا اور نہ ہی کوئی نصیر۔

اس کے بعد قیامت میں ان کے دردناک عذاب کے ایک حصے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔"اس دن کو یاد کرو جب ان کے چہرے جہنم کی آگ کے سبب بدل جائیں گے"(یوم تقلب وجوھھم فی النار)۔

یہ تغیر یا تو چہرے کے رنگ کے لحاظ سے ہو کہ کبھی وہ سرخ اور نیلے ہو جائیں گے اور کبھی زرد اور پژمردہ یا آگ کے شعلوں پر ہونے کے لحاظ سے، یعنی کبھی ان کی ایک سمت آگ پر ہوگی اور کبھی دوسری سمت (اعاذنا اللہ)

یہ وہ مقام ہے، جہاں ان کی حسرت بھری آہیں بلند ہوں گی اور وہ فریاد کرکے کہیں گے اے کاش ہم نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی"(یقولون یا لیتنا اطعنا اللہ واطعنا الرسولا)۔

اگر ہم اطاعت کرتے تو اس قسم کے دردناک انجام سے دوچار نہ ہوتے۔

اور کہیں گے "پروردگارا! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی، انھوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے" (وقالوا ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیلا)۔ [1]

"سادہ" "سید" کی جمع ہے جو بڑے مالک کے معنی میں ہے، جس کے ذمہ اہم شہروں یا ملک کا نظم ونسق ہوتا ہے۔ اور "کبراء" "کبیر" کی جمع ہے اور بڑے لوگوں کے معنی میں ہے، خواہ یہ بزرگی عمر کے لحاظ سے ہو یا علم کی وجہ سے یا معاشرتی طور پر۔

اس لحاظ سے لفظ "سادہ" معاشرے کے اہم افراد اور سرداروں کی طرف اشارہ ہے اور "کبراء" وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان کے ماتحت رہ کر ان کے معاون اور مشیر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ حقیقت میں ہم نے خدا کی اطاعت کے بجائے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی اور انبیاء کی اطاعت کے بجائے "کبراء" کی اطاعت کی تھی اس لیے مختلف لغزشوں اور بدبختیوں کا شکار ہو گئے۔

واضح رہے کہ ان کے نزدیک "سیادت" اور "بزرگی" کا معیار صرف طاقت، لاٹھی، غیر شرعی مال وثروت اور مکر وفریب تھا اور یہاں پر دو تعبیروں کا انتخاب اس لیے ہے کہ وہ کسی حد تک اپنے عذر کی توجیہ کریں گے اور کہیں گے کہ ہم ان کے ظاہری جاہ وجلال اور رعب ودبدبہ سے مرعوب ہو گئے تھے۔

اس موقع پر یہ گمراہ جہنمی غصے میں پاگل ہو جائیں گے اور خدا سے اپنے گمراہ کرنے والوں کے لیے سخت عذاب کا مطالبہ کریں گے اور کہیں گے۔ "خداوندا! انھیں دوگنا عذاب دے (ایک تو ان کی اپنی گمراہی پر اور دوسرا ہمیں گمراہ کرنے پر)" (ربنا اٰتھم ضعفین من العذاب)۔

"اور ان پر بہت بڑی لعنت بھیج" (والعنھم لعنا کبیرا)

یقیناً وہ عذاب اور لعنت کے مستحق ہیں۔ لیکن "عذاب مضاعف" اور "لعن کبیر" کا استحقاق دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی وجہ سے رکھتے تھے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سورۂ اعراف میں ہے کہ جس وقت یہ گمراہ پیروکار اپنے سرداروں اور پیشواؤں کے لیے کئی گنا عذاب کا تقاضا کریں گے تو ان سے کہا جائے گا:

"لکل ضعف ولٰکن لا تعلمون۔" (اعراف آیت ۳۸)

"ان کے لیے بھی کئی گنا عذاب ہے اور تمھارے لیے بھی۔ لیکن تم جانتے نہیں ہو۔" [2]

---

[1] "الرسولا" اور "السبیلا" کے آخر میں جو الف ہے "الف اطلاق" کہلاتا ہے چونکہ الف لام اور تنوین اکٹھے نہیں ہو سکتے، اور یہ آیتوں کے اواخر کی ہم آہنگی کے لیے ہے۔

[2] قابل توجہ یہ ہے کہ زیر بحث آیات میں "ضعفین" اور سورۂ اعراف کی آیت میں "ضعف" آیا ہے۔ لیکن "ضعف" کے مفہوم میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ دونوں ایک ہی معنی کے حامل ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ائمہ کفر وضلال کے عذاب کا کئی گنا ہونا تو واضح ہے۔ لیکن ان گمراہ پیروکاروں کے عذاب کا کئی گنا ہونا کس بنا پر ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک گناہ تو گمراہی کی وجہ سے ہوگا اور دوسرا گناہ ظالموں کو تقویت پہنچانے اور ان کی کمک کرنے کی وجہ سے ہوگا۔ کیونکہ ظالم لوگ اکیلے کسی کام کو آگے نہیں بڑھا سکتے، بلکہ ان کے یار و مددگار ان کے میدان کی آگ کو بھڑکانے اور ان کے ظلم وکفر کے تنور کو مزید گرم کرنے کے لیے وہ کام کرتے ہیں۔ پھر بھی باہمی تناسب سے پیشواؤں اور سرداروں کا عذاب زیادہ سخت اور دردناک تر ہوگا۔

اس بارے میں ہم اسی سورہ کی آیت ۳۰ کی تفسیر میں زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔

۶۹۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا ۚ

۷۰۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۚ

۷۱۔ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۚ

ترجمہ

۶۹۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنہوں نے موسیٰ کو تکلیف پہنچائی اور خدا نے موسیٰ کو اس چیز سے مبرّا کیا جو وہ ان کے حق میں کہتے تھے اور وہ خدا کے نزدیک آبرومند اور (باعظمت) تھے۔

۷۰۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور حق بات کرو۔

۷۱۔ تاکہ خدا تمہارے اعمال کی اصلاح کرے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، وہ عظیم کامیابی سے سرفراز ہوگا۔

تفسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ناروا تہمتیں:

گذشتہ آیات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام اور آپ کو کسی قسم کی اذیت نہ دینے کے حکم کے فوراً بعد ان آیات میں روئے سخن مومنین کی طرف کر کے قرآن کہتا ہے۔ "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی۔ لیکن خدا نے موسیٰ کو ان تمام ناروا نسبتوں سے مبرا اور پاک قرار دیا اور وہ بارگاہ خداوندی میں آبرومند اور عظیم منزلت کے مالک تھے" (یا ایھا الذین امنوا لاتکونوا کالذین اٰذوا موسیٰ فبرأہ اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیھا)۔

اذیت پانے والے انبیاء میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ بنی اسرائیل کے لوگوں نے جتنی تکلیف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی اتنی کسی اور نبی کو نہیں پہنچائی۔ پھر کچھ تکلیفیں ایسی تھیں جو ان منافقین کی تکلیفوں سے ملتی جلتی تھیں جو وہ رسول اسلام کو دیتے تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف دینے سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید نے اسے کیوں مجمل طور پر بیان کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں علماء نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔ جن میں سے یہ بھی ہیں کہ:

۱۔ ایک روایت کے مطابق حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون ایک پہاڑ کی چوٹی پر گئے اور حضرت ہارون کی وہاں پر وفات ہوگئی۔ افواہیں پھیلانے والے بنی اسرائیلیوں نے ان کی موت کا الزام حضرت موسیٰ پر کر دیا۔ مگر خدا نے حقیقت امر کو واضح کر دیا اور پروپیگنڈا کرنے والوں کی قلعی کھول دی۔

۲۔ جیسا کہ سورۂ قصص کی آخری آیات کے ذیل میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ مکار قارون نے زکوٰۃ سے بچنے اور فقراء و مساکین کے حقوق ادا نہ کرنے کے لیے ایک سازش تیار کی اور وہ یہ کہ ایک بدکار عورت کو تیار کیا گیا کہ وہ اپنے غیر مشروع روابط کے نام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائے۔ لیکن خدا کی مہربانی سے نہ صرف یہ کہ سازش کارگر ثابت نہ ہوئی، بلکہ اس شیطانی منصوبے کے برخلاف اس عورت نے حضرت موسیٰ کی پاکدامنی کی گواہی دے کر قارون کی سازش کو طشت از بام کر دیا۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے ایک ٹولے نے انھیں جادو، جنون اور خدا پر جھوٹ کی تہمت باندھنے کا الزام دیا۔ لیکن خدا نے انھیں واضح معجزات کے ذریعے ان ناروا نسبتوں سے مبرا اور پاک قرار دے دیا۔

۴۔ بنی اسرائیل کے جاہلوں کی ایک جماعت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو برص وغیرہ جیسے چند ایک جسمانی عیوب

سے متہم کیا۔ کیونکہ آپ نہانے دھونے کے وقت اپنے کپڑے لوگوں کے سامنے نہیں اتارتے تھے، چنانچہ ایک دن انھوں نے نہانے کی غرض سے لوگوں سے دُور جاکر کپڑے اتارے اور ایک پتھر پر رکھ دیئے اور وہ پتھر کپڑے لے کر چل دیا اور بنی اسرائیل نے ان کے بدن کو دیکھ لیا کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔

۵۔ بنی اسرائیل کی جبلّت سازی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکلیف کا ایک اور عامل تھی۔ کبھی تو وہ تقاضا کرتے کہ انھیں خدا کا دیدار کرایا جائے، کبھی کہتے کہ من وسلویٰ جیسی غذا ہمارے لیے مناسب نہیں ہے، کبھی کہتے کہ ہم اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ بیت المقدس میں داخل ہوکر عمالقہ کے ساتھ جنگ کریں، تو اور تیرا پروردگار جاؤ اس جگہ کو فتح کردو، پھر ہم بعد میں آ جائیں گے۔

لیکن جو کچھ آیت کے معنی میں زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ آیت ایک کلی اور جامع حکم بیان کرتی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مختلف طریقوں سے اذیت پہنچاتے تھے، جو مدینہ کے لوگوں کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی بعض اذیتوں کے مشابہ تھیں، افواہیں پھیلاتے، طرح طرح کے جھوٹ گھڑتے اور آپ کی ایک بیوی کی طرف ناروا نسبت جیسی اذیتیں کہ جس کی تفصیل سورۂ نور کی تفسیر (تفسیر نمونہ جلد ۱۴ ذیل آیہ ۱۱ تا ۲۰) میں گزر چکی ہے۔ یا جیسے وہ اعتراضات جو رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زینبؓ سے ازدواج کے بارے میں تھے، یا وہ تکلیفیں جو آپ کے گھر میں آکر پہنچاتے یا غیر مہذب طریقے سے آپ کو پکارنے کے سلسلے میں اذیتیں تھیں۔

باقی رہا سحر وجنون وغیرہ کی نسبت یا بدنی عیوب کی بات اگرچہ یہ تہمتیں حضرت موسیٰ کے بارے میں تھیں۔ لیکن "یا ایھا الذین آمنوا" کا خطاب پیغمبر اسلام کے بارے میں مناسبت نہیں رکھتا، کیونکہ مومنین نے نہ تو حضرت موسیٰؑ کو اور نہ ہی حضرت محمد مصطفےٰ کو سحر وجادو سے کبھی متہم کیا اور اس طرح جسمانی عیوب کا اتہام بالفرض حضرت موسیٰ کے بارے میں تھا۔ اور خدا نے انھیں مبرّا کیا، لیکن پیغمبر اسلام کے بارے میں تاریخ کوئی مثال پیش نہیں کرتی۔

بہر حال اس آیت سے یہ استفادہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ جس وقت کوئی شخص بارگاہ خداوندی میں آبرومند اور صاحب قدر ومنزلت ہو تو خداوند عالم موذی لوگوں کی ناروا تہمتوں سے اس کا دفاع اور حمایت خود کرتا ہے۔ بشرطیکہ انسان کا اپنا دامن صاف ہو اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی آبرومندی کا بھی پاس کرے، تو وہ بھی یقیناً انسان کی پاک دامنی کو مناسب موقع پر ظاہر کردیتا ہے۔ اگرچہ بدخواہ قسم کے لوگ تہمت لگانے میں ایڑی چوٹی کا زور ہی کیوں نہ لگادیں۔

ہم نے اس بات کی تصدیق پاک دامن یوسف علیہ السلام کی داستان میں دیکھی ہے کہ کس طرح خدا نے انہیں عزیز مصر کی زوجہ کی خطرناک تہمت سے بری کردیا۔

اسی طرح جناب عیسیٰ کی والدہ حضرت مریمؑ کے بارے میں ہے کہ جن کے نوزاد شیر خوار نے ان کی پاکی داماں اور عفت کی گواہی دی اور ان بدطینت اسرائیلیوں کی زبان بند کردی جو انھیں متہم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب زمانۂ پیغمبر کے مومنین سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ ان کے بعد بھی عرصہ وجود میں قدم رکھیں اور ایسا کام کریں جو آپؐ کی روح مقدس کو رنجیدہ اور آزردہ کردے، آپؐ

کے دین کو حقیر سمجھیں، آپ کی تمام زحمات کو برباد کردیں، آپؐ کی میراث کو بھلادیں۔ تو یہ آیت ان کے لیے بھی ہوگی۔

اسی لیے بعض روایات جو اہل بیتؑ سے وارد ہوئی ہیں ان میں ہے کہ "جن لوگوں نے حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کو تکلیف پہنچائی ہے وہ بھی اس آیت کے مشمول ہیں۔"[1]

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ جب ہم خدا کے عظیم پیغمبروں کے حالات کی طرف توجہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ بھی جاہل اور منافق قسم کے لوگوں کی زبان کے زخم سے محفوظ نہیں تھے تو کسی کو یہ توقع نہیں رکھنا چاہیئے کہ پاک اور مومن لوگ اس قسم کے افراد سے محفوظ رہیں گے، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان رضا الناس لا یملک والسنتھم لاتضبط"

"نہ تو تمام لوگوں کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ ہی تمام لوگوں کا منہ بند کیا جاسکتا ہے۔"

اور آخر میں فرماتے ہیں:

"کیا انھوں نے موسیٰ علیہ السلام پر کئی طرح کی تہمتیں نہیں لگائیں اور انھیں تکلیف نہیں پہنچائی؟ یہاں تک کہ خدا نے انہیں تمام اتہامات سے بری قرار دے دیا۔"[2]

اعمال کی درستی کے لیے حق بات کیا کرو:

جب افواہ پھیلانے والوں اور زبان سے ایذا پہنچانے والوں کے بارے میں گفتگو ہوچکی تو اس کے بعد والی آیت ایک حکم صادر کرتی ہے جو درحقیقت اس عظیم معاشرتی مسئلے کا علاج ہے، چنانچہ خدا فرماتا ہے: "اے وہ لوگو! جو ایمان لے آئے ہو، خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور حق بات کہا کرو": (یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وقولوا قولا سدیدا)۔

"سدید" "سد" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "محکم اور استوار" جس میں کسی قسم کا خلل پیدا نہ ہوسکے اور وہ قول جو حق اور واقعے کے مطابق ہو، جو محکم سد (بند) کی طرح باطل کی موجوں کو روک دیتا ہے۔

بعض مفسرین نے اسے "صواب" (درست) کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے جھوٹ اور لغو سے پاک ہونے، نیز بعض نے ظاہر اور باطن کے ہم آہنگ ہونے اور "صلاح و رشاد" وغیرہ کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے۔ یہ سب معانی مذکورہ بالا جامع معنی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

بعد والی آیت "قول سدید" اور "حق بات" کا نتیجہ یوں بیان کرتی ہے۔ "خداوند عالم تقویٰ اور حق بات

---

[1] نورالثقلین جلد ۴ صفحہ ۳۰۰۔

[2] تفسیر نورالثقلین جلد ۴ صفحہ ۳۰۰۔

کی بناء پر تمہارے اعمال کی اصلاح کرتا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے "(یصلح لکم اعمالکم و یغفر لکم ذنوبکم)۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ ، اصلاح زبان کی بنیاد اور حق بات کا سرچشمہ ہے اور حق بات اصلاح اعمال کے موثر عوامل میں سے ہے ، اور اصلاح اعمال گناہوں کی بخشش کا سبب ہے ، کیونکہ :

"ان الحسنات یذھبن السیئات"

"نیک اعمال گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں" (ہود/۱۱۴)

علماء اخلاق نے کہا ہے کہ زبان بدن کا سب سے زیادہ بابرکت عضو اور اطاعت ، ہدایت اور اصلاح کا سب سے موثر وسیلہ ہے اور اس کے باوجود بدن کے سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ گناہگار عضو بھی شمار ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ تیس گناہان کبیرہ اس چھوٹے سے عضو سے جنم لیتے ہیں ۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"لا یستقیم ایمان عبد حتی یستقیم قلبہ ولا یستقیم قلبہ حتی یستقیم لسانہ"

"کسی بندے کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا ، جب تک اس کا دل راست نہ ہو اور دل اس وقت تک سیدھا نہیں ہو سکتا ، جب تک اس کی زبان سیدھی نہ ہو"[2]

ایک اور قابل توجہ حدیث ہے جو امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے ۔ آپ فرماتے ہیں :

"ہر شخص کی زبان روزانہ صبح کے وقت تمام دوسرے اعضاء کی احوال پرسی اور خیریت دریافت کرتی ہے اور

---

[1] امام غزالی نے "احیاء العلوم" میں بیس ایسی لغزشیں جو زبان سے سرزد ہوتی ہیں یا گناہان کبیرہ جن کا تعلق زبان سے ہوتا ہے ذکر کیے ہیں ۔ ۱۔ جھوٹ ۔ ۲۔ غیبت ۔ ۳۔ چغل خوری ۔ ۴۔ زبان سے منافقت کا اظہار ۔ ۵۔ بے جا مدح و ثنا (خوشامد) ۔ ۶۔ بدزبانی اور گالی دینا ۔ ۷۔ غنا اور غلط اشعار ۔ ۸۔ مزاح میں حد سے تجاوز ۔ ۹۔ مسخرہ پن اور استہزاء ۔ ۱۰۔ دوسروں کے راز فاش کرنا ۔ ۱۱۔ وعدہ خلافی کرنا ۔ ۱۲۔ بے جا لعنت کرنا ۔ ۱۳۔ لڑائی جھگڑا ۔ ۱۴۔ باطل امور میں گفتگو ۔ ۱۵۔ زیادہ باتیں کرنا ۔ ۱۶۔ ایسے امور کے بارے میں گفتگو کرنا جو انسان سے متعلق نہیں ہیں ۔ ۱۷۔ شراب ، جوا اور گناہ کی دوسری محفلوں میں تعریف کرنا ۔ ۱۹۔ ایسے مسائل کے بارے میں سوال اور جستجو جو انسان کے ادراک سے ماورا ہیں ۔ ۲۰۔ بات کرنے میں تصنع اور تکلیف سے کام لینا ۔ اس کے علاوہ دس اور چیزوں کا ہم اضافہ کرتے ہیں ۔ ۱۔ تہمت لگانا ۔ ۲۔ جھوٹی گواہی دینا ۔ ۳۔ فحاشی اور بے بنیاد افواہیں پھیلانا ۔ ۴۔ خودستائی ۵۔ بے جا اصرار ۔ ۶۔ گفتگو میں سختی کرنا ۔ ۷۔ زبانی ایذا رسانی ۔ ۸۔ ایسے شخص کی مذمت کرنا جو مذمت کا مستحق نہ ہو ۔ ۹۔ زبان کے ساتھ کفران نعمت کرنا ۔ ۱۰۔ باطل کا پرچار ۔

[2] بحار الانوار جلد ۱ ، صفحہ ۱۰۸ ۔

کہتی ہے: "کیف اصبحتم ؟"

"تم نے کیسے صبح کی ؟"

وہ سب زبان کے اظہار محبت کے جواب میں کہتے ہیں: "بخیر ان ترکتنا"

"خیریت ہے، اگر تو نے رہنے دی۔"

پھر وہ مزید کہتے ہیں: تجھے ہم خدا کی قسم دے کر کہتے ہیں کہ ہمارا خیال رکھنا۔

"انما نثاب بلثمہ ونعاقب بلثمک"

"ہمیں تیرے ذریعے ثواب ملے گا اور تیری ہی وجہ سے عذاب۔" [1]

اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں جو سب کی سب زبان کے انتہائی زیادہ اثرات پر دلالت کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ انسانی نفوس کی تہذیب اور اصلاحِ اخلاق میں زبان کا بڑا کردار ہے۔ اسی بناء پر ایک حدیث میں ہے:

"ما جلس رسول اللہ علی ھذا المنبر قط الا تلا ھذہ الآیۃ یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیدا"

"جب بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس منبر پر تشریف فرما ہوتے، تو اس آیت کی تلاوت فرماتے: اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور سچی بات کہو۔" [2]

آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے۔ "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، وہ بہت بڑی کامیابی سے ہمکنار ہوگا" (ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزا عظیما)۔

کونسی کامیابی اس سے بالاتر ہوگی کہ انسان کے اعمال پاک ہوں، اس کے گناہ بخشے جائیں اور بارگاہ رب العزت میں سرخرو اور سرفراز ہو کر پیش ہو۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۰، صفحہ ۳۷۸

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۶ صفحہ ۳۴۷ بحوالہ تفسیر درمنثور۔

۷۲۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ

۷۳۔ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

ترجمہ

۷۲۔ ہم نے امانت (ذمہ داری اور ولایتِ الٰہیہ) کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے (اس کا بوجھ) اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا، وہ بہت ہی ظالم اور جاہل تھا (اس نے اس مقام کی قدر و منزلت کو نہ پہچانا اور اپنے اوپر ظلم کیا)۔

۷۳۔ مقصد یہ تھا کہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کی صفیں مومنین سے جدا ہو جائیں اور خدا (ان) کو عذاب دے، اور اپنی رحمت صاحبِ ایمان مردوں اور با ایمان عورتوں پر نازل کرے اور

خدا ہمیشہ غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

نوعِ بشر کا بہت بڑا اعزاز:

سورۂ احزاب کی یہ دونوں آخری آیات ان اہم مسائل کی تکمیل کرتی ہیں جو اس سورہ میں ایمان، عمل صالح، جہاد، ایثار، عفت و پاک دامنی، ادب اور اخلاق کے سلسلے میں آئے ہیں اور یہ بھی واضح کرتی ہیں کہ انسان کس قدر ممتاز حیثیت کا مالک ہے کہ خدا کی عظیم ذمہ داری کو اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر اپنے وجود کی قدر و قیمت کو نہ پہچانے اور اس سے جاہل ہو جائے تو کس طرح اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتا ہے اور اسفل السافلین میں جا گرتا ہے۔

پہلے تو انسان کے تمام عالم خلقت میں اہم ترین اور عظیم ترین اعزاز کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی" (انا عرضنا الامانة علی السماوات والارض والجبال)۔

لیکن عالم خلقت کے ان عظیم اور بڑے موجودات نے اس امانت کے بوجھ کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اپنی ناتوانی کا اظہار کیا اور اس کام سے ڈرتے تھے: (فابین ان یحملنها واشفقن منها)۔

واضح ہے کہ ان کا انکار تکبر کی وجہ سے نہیں تھا، جیسا کہ شیطان اور آدم کو سجدہ کرنے سے اس کی روگردانی کرنے کے سلسلے میں بیان ہوا ہے:

ابی واستکبر (بقرہ/۳۴)

بلکہ ان کا انکار "اشفاق" یعنی ایسے خوف و ہراس کے ساتھ تھا، جس میں توجہ بھی تھی اور خضوع و خشوع بھی۔ لیکن اسی اثنا میں انسان جو عالم آفرینش کا عجوبہ ہے، آگے بڑھا اور اس نے اس کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا: (وحملها الانسان)۔

لیکن افسوس کہ "اسی ابتداء ہی میں اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچانا اور جو کچھ اس امانت کے اٹھانے کے لائق تھا، اسے انجام نہیں دیا": (انه کان ظلوما جهولا)۔

عظیم مفسرین نے اس آیت کے سلسلے میں بہت کچھ گفتگو کی ہے اور "امانت" کے معنی کی حقیقت معلوم کرنے اور بیان کرنے میں بہت زیادہ کوشش کی ہے اور مختلف نظریات کا اظہار کیا ہے، جن میں سے ہم بہترین نظریہ کو ان قرائن کی جستجو سے منتخب کرتے ہیں، جو خود آیت میں چھپے ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر معانی اور مفہوم سے لبریز اس آیت میں یہ پانچ نکات زیادہ قابل غور ہیں:

۱۔ "امانت الٰہی" سے کیا مراد ہے ؟
۲۔ اسے آسمان و زمین اور پہاڑوں کو پیش کرنے کا کیا مقصد ہے ؟
۳۔ کیوں اور کس طرح ان موجودات نے اس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا ؟
۴۔ کس طرح انسان اس امانت کے بوجھ کا حامل ہُوا ؟
۵۔ کیوں اور کس طرح وہ "ظلوم" اور "جہول" ٹھہرا ؟

"امانت" کے متعلق مختلف تفاسیر ذکر ہوئی ہیں، جن میں سے یہ بھی ہے کہ، اس سے مراد ارادے کی آزادی اور اختیار ہے جو انسان کو باقی موجودات سے ممتاز اور نمایاں کرتی ہے یا مراد عقل ہے جس پر ثواب عذاب کا دار و مدار ہوتا ہے" امانت سے مراد" صفت عبودیت کا کمال جو معرفت اور عمل صالح کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یا اس سے مراد "انسانی جسم کے اعضاء و جوارح" ہیں، مثلاً آنکھ خدا کی امانت ہے، جسے محفوظ رکھنا چاہیئے اور اسے گناہ کی راہ میں صرف نہیں کرنا چاہیئے۔ کان، ہاتھ، پاؤں اور زبان میں سے ہر ایک خدا کی امانت ہے، جن کی حفاظت کرنا ہر انسان پر واجب و لازم ہے۔

یا مراد" وہ امانتیں ہیں جو انسان ایک دوسرے سے لیتے ہیں۔ اور "عہد و پیمان کو پورا کرنا" بھی مراد ہو سکتا ہے۔
یا مراد "اللہ کی معرفت" ہے۔
یا مراد "خدائی واجبات اور فرائض الٰہی ہیں مثلاً نماز، روزہ اور حج وغیرہ۔
لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ بعض کو ایک دوسرے میں مدغم کیا جا سکتا ہے، بعض لوگوں نے اصل مطلب کے کچھ حصوں کو اور بعض نے تمام گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

ایک جامع جواب کے حصول کے لیے ہمیں انسان پر ایک نظر ڈالنا چاہیئے کہ اس کے پاس کونسی ایسی چیز ہے، جو نہ تو آسمان اور زمین میں ہے اور نہ ہی پہاڑوں کے پاس ؟

انسان ایک ایسی مخلوق ہے، جس میں انتہائی زیادہ استعداد موجود ہے اور وہ اس استعداد سے استفادہ کرتے ہوئے "خلیفۃ اللہ" کا مصداق اتم بن سکتا ہے اور کسب معرفت، تہذیب نفس اور کمالات کے ذریعے عزت و افتخار اور اعزازات کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور فرشتوں سے بھی آگے نکل سکتا ہے۔

یہ استعداد ارادہ و اختیار کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا راستہ ہے جسے اس نے صفر سے شروع کیا ہے اور لامتناہی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا جا رہا ہے اور اپنے ہی ارادے اور اختیار سے اسے طے کرتا جا رہا ہے۔

آسمان و زمین اور پہاڑ بھی ایک طرح کی معرفت الٰہی کے حامل ہیں، وہ خدا کا ذکر اور تسبیح بھی کرتے ہیں اور اس کی عظمت کے سامنے گڑگڑانے والے اور سجدہ گزار بھی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ذاتی، تکوینی اور جبری شکل میں ہے۔ اسی بنا پر ان کے وجود میں تکامل اور ارتقاء نہیں ہے۔

صرف ایک موجود ایسا ہے، جس کی نزولی اور صعودی قوس لامتناہی ہے اور غیر محدود طور پر ارتقائی بلندیوں تک پرواز کر سکتا ہے اور ان تمام کاموں کو اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دیتا ہے اور وہ "انسان" ہے۔ یعنی یہ ہے وہ

خدائی امانت اٹھانے الاجس کے اٹھانے سے تمام موجودات نے انکار کر دیا۔ یوں اکیلے اُس نے میدان میں تُرک کر اسے اپنے کندھے پر رکھ لیا۔

اسی لیے ہم بعد والی آیت میں دیکھتے ہیں کہ انسان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، مومن، کافر اور منافق۔ اسی بنا پر ایک مختصر سے جملے میں کہا جا سکتا ہے کہ امانتِ الٰہی وہی غیر محدود صورت میں ارتقائی قابلیت ہے، جس میں ارادہ اور اختیار کی آمیزش ہوتی ہے جس سے وہ انسانیت کے کمال اور خدا کی خاص بندگی کے مقام تک پہنچ کر ولایت الٰہیہ کو قبول کرتا ہے۔

لیکن یہ کہ صرف اس امر کو "امانت" سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے، جبکہ ہماری ساری زندگی اور ہمارا سب کچھ خدا کی امانت ہے؟ درحقیقت یہ چیز انسان کے اس اہم اور عظیم امتیاز کی بنا پر ہے، وگرنہ خدا کی باقی نعمتیں بھی اسی کی امانت ہیں، لیکن اس کے مقابلے میں ان کی بہت ہی کم اہمیت ہے۔

یہاں پر امانت الٰہی کا ایک اور مفہوم لیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ "امانت الٰہی" سے مراد "عہد اور ذمہ داری" کو قبول کرنا ہے۔

اسی لیے جن لوگوں نے امانت کو ارادہ و اختیار کی آزادی کی صفت سمجھا ہے، انھوں نے اس عظیم امانت کے صرف ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے اس کی تفسیر "عقل" یا "اعضاء بدن" یا "لوگوں کی آپس کی امانتیں" یا "فرائض و واجبات" یا "تمام شرعی احکام کی ادائیگی بیان کی ہے، ان میں سے ہر ایک نے ایک عظیم پھل دار درخت کی صرف ایک شاخ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے اور اس کا ثمر حاصل کیا ہے۔

یا امانت کے پیش کرنے سے مراد اشیاء کا باہمی موازنہ کرنا ہے، یعنی جب اس امانت کا ان کی استعداد سے موازنہ کیا تو انھوں نے زبان حال کے ساتھ اس عظیم امانت کو قبول کرنے سے اپنی عدم اہلیت کا اعلان کیا۔

دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اور اس طرح سے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں نے زبان حال سے پکار کر کہا کہ اس امانت کا بوجھ اُٹھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔

یہاں سے تیسرے سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا کہ کس طرح ان موجودات نے اس عظیم امانت کے اٹھانے سے انکار کیا اور بڑے ادب کے ساتھ اپنا خوف و ہراس ظاہر کر دیا۔

یہیں سے ان کی اس امانت الٰہی کے اٹھانے کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

کیونکہ انسان اس طرح سے پیدا کیا گیا ہے جو ایفائے وعدہ اور ذمہ داری کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا سکتا ہے، خدا کی ولایت کو قبول کر سکتا ہے، عبودیت اور کمال کے جادہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور اس راہ کو پروردگار کی مدد سے اپنے ہی پاؤں کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ذریعے پہنچنے والی متعدد روایات بتاتی ہیں کہ اس امانت الٰہی سے مراد "امیر المومنین علیؑ اور ان کی اولاد امجاد علیہم السلام کی ولایت" ہے۔ تو اس کا مقصد یہ ہے کہ انبیاء کرامؑ اور ائمہ اطہارؑ کی ولایت درحقیقت اس ولایت مطلقہ الٰہیہ کی ایک طاقتور شعاع ہے اور اولیاء خدا کی والایت کو قبول کیے بغیر عبودیت تک رسائی اور ارتقاء کی جادہ پیمائی قطعاً ناممکن ہے۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے جب کسی نے "عرض امانت" والی آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

"الامانة الولاية من ادعاها بغير حق كفر"

"امانت وہی ولایت ہی تو ہے، جس کا ناحق دعویٰ کرنے والا مسلمانوں کے زمرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ [1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے جب اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

"الامانة الولاية، والانسان هو ابو الشرور المنافق"

"امانت وہی ولایت ہے اور انسان جس کی ظلوم وجہول سے توصیف کی گئی ہے، بہت سے گناہوں کا مرتکب اور منافق ہے۔ [2]

ایک اور نکتہ جس کی طرف یہاں پر اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ ہم سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۲ کے ذیل میں عالم ذر کے بارے میں بتا چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب خدا نے انسان سے عالم ذر میں توحید کا اقرار لیا تھا وہ انسان کی فطرت، استعداد اور سرشت کے ذریعے تھا۔ درحقیقت عالم ذر، عالم استعداد و فطرت کا دوسرا نام ہے۔

اسی طرح خدائی امانت کے قبول کرنے کے بارے میں بھی یہی کہنا ہوگا کہ یہ قبولیت کسی مقررہ قاعدہ کلیہ کے تحت یا محض تکلف کی بناء پر نہیں تھی۔ بلکہ عالم استعداد کے مطابق ایک تکوینی قبولیت ہے۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے انسان کے "ظلوم وجہول" ہونے کا مسئلہ۔

کیا انسان کی توصیف ان دو الفاظ کے ساتھ جو ظاہر طور پر اس کی مذمت کر رہے ہیں، اس امانت کے قبول کرنے کی وجہ سے ہے؟

یقیناً اس سوال کا جواب منفی ہے، کیونکہ اس امانت کو قبول کر لینا انسان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ اتنا بڑا اعزاز حاصل کر لینے کے بعد اس کی مذمت کی جائے؟

یا تو یہ توصیف اس بناء پر ہے کہ انسان بہت نسیان کا شکار ہوتا ہے اور اپنی ذات پر ظلم کرتا رہتا ہے اور آدمیت کی قدر و منزلت سے ناآشنا ہے، جس کام کی ابتدا ہی سے نسل آدم میں "قابیل" کے ذریعے بنیاد پڑ چکی تھی اور قابیل کے نقش قدم پر چلنے والوں نے اسے آگے بڑھایا اور اب تک اسے جاری رکھے ہوئے ہے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۳۴۱۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۳۴۱۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

وہ انسان جسے عرش کی بلندیوں سے صدا آتی رہتی ہو، وہ بنی آدم جس کے سر پر "کرمنا" کا تاج سجایا گیا ہو، وہ انسان جو "إني جاعلٌ في الارض خليفة" کے مصداق زمین میں خدا کا نمایندہ ہو، وہ بشر جو معلم اور مسجود ملائکہ ہو وہ "ظلوم و جہول" نہیں تو اور کیا ہوگا کہ جو اپنی ان عظیم اقدار کو طاقِ نسیان میں رکھ کر خود کو اس عالم کا اسیر بنا لے اور شیاطین کی صف میں شامل ہو کر اسفل السافلین کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرے۔

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس انحرافی راستے پر چلنے والے لوگ عرصہ دراز سے چلتے آرہے ہیں۔ جو انسان کے "ظلوم و جہول" ہونے کی قوی دلیل ہے۔ حتی کہ خود حضرت آدم علیہ السلام جو بلسلہ آدمیت کی پہلی کڑی اور طہارت و عصمت کے مقام پر فائز تھے، اپنے اوپر ظلم کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔ بارگاہِ خدا میں عرض کرتے ہیں:

"ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين"

(سورۂ اعراف ۲۳)

درحقیقت اس عظیم امانت کی عظمت کے ایک گوشے کو فراموش کرنے کی بدولت ہی ان سے ترکِ اولیٰ سرزد ہوا تھا بہرحال اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان جو ظاہراً چھوٹی اور کمزور سی مخلوق ہے، لیکن تخلیق عالم کا ایک ایسا عجوبہ ہے، جس نے اس عظیم امانت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا ہے، جسے اٹھانے سے زمین و آسمان اور پہاڑ عاجز آ گئے تھے۔ ہاں اس کے مقام یہ عظمت اسی صورت میں ہے کہ وہ اپنے اس مقام کو بھول جائے۔[1]

بعد والی آیت حقیقت میں انسان کے سامنے اس امانت کو پیش کرنے کی علت ہے اور اس حقیقت کا بیان ہے کہ انسان اس عظیم خدائی امانت کا بار اُٹھا لینے کے بعد تین حصّوں میں بٹ گئے۔ منافق، مشرک اور مؤمن۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے "مقصد یہ ہے کہ خدا منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو ان کے کیفرِ کردار تک پہنچائے نیز خدا صاحب ایمان مردوں اور باایمان عورتوں پر رحمت نازل کرے، خدا ہمیشہ سے غفور و رحیم ہے": (ليعذب الله المنافقين والمنافقات والمشركين والمشركات ويتوب الله على المؤمنين

---

[1] جو کچھ ہم نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس امر کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ہم آیت میں کسی چیز کو مقدر مانیں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے اور انھوں نے آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے امانت پیش کرنے سے مراد ان میں رہنے والوں کے سامنے امانت پیش کرنا ہے۔ یعنی ملائکہ اور فرشتوں کے سامنے اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ جن چیزوں نے امانت کو قبول کرنے سے انکار کیا انہوں نے اسے ادا کر دیا اور جنھوں نے قبول کیا انہوں نے خیانت کا ارتکاب کیا، یہ تفسیر نہ صرف تقدیر کی احتیاج کی بنا پر خلاف ظاہر ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی قابلِ اعتراض ہے کہ فرشتے بھی ایک طرح کی تکلیف پر عمل پیرا ہیں اور ایک حصّہ امانت کے حامل ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر، پہاڑ میں رہنے والوں کو فرشتوں سے تعبیر کرنا عجیب و غریب ہی ہے۔ (غور کیجئے گا)

والمؤمنات وکان اللہ غفورا رحیما ۔

عربی قاعدہ کے تحت "لیعذب" کی "لام" کونسی لام ہے؟ اس سلسلے میں دو احتمال ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ "لام غایت" ہے جو کسی چیز کے انجام کو بیان کرنے کے لیے ذکر ہوتی ہے۔ اس بنا پر آیت کا مفہوم یوں ہوگا:

"اس امانت کو اٹھانے کا انجام یہ ہوا کہ ایک گروہ نے نفاق کی راہ اختیار کی اور ایک گروہ نے شرک کی، اور اس خدائی امانت میں خیانت کرنے کی وجہ سے اس کے عذاب میں گرفتار ہوئے اور اہل ایمان کا ایک گروہ اس امانت کو ادا کرنے اور اپنے فرائض پر قائم رہنے کی بنا پر رحمت الٰہی کا مستحق قرار پایا۔"

۲۔ دوسرا یہ کہ یہ لام علت ہے اور اس میں ایک جملہ مقدر ہے۔ اس بنا پر آیت کی تفسیر یوں ہوگی:

"امانت کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تمام انسان آزمائش کی کٹھالی میں قرار پائیں اور ہر شخص اپنے اپنے باطنی حالات کو ظاہر کرکے اپنے استحقاق کے مطابق جزا اور سزا پا سکے۔"

چند اہم نکات

۱۔ اہل نفاق کو مشرکین پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ منافق اپنے آپ کو "امین" ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ وہ خائن ہوتا ہے۔ لیکن مشرک کی خیانت واضح ہے۔ اس لیے منافق عذاب کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔

۲۔ ان دونوں گروہوں کو مؤمنین پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ گزشتہ آیت کا آخری حصہ "ظلوم اور جہول" پر ختم ہوتا ہے اور "ظلوم وجہول" منافق اور مشرک کے ساتھ مناسب ہے۔ منافق "ظالم" اور مشرک "جاہل" ہے۔

۳۔ لفظ "اللہ" منافقین اور مشرکین دونوں کے عذاب کے بارے میں ایک مرتبہ آیا ہے اور مؤمنین کی جزا کے سلسلے میں بھی ایک مرتبہ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انجام کے لحاظ سے پہلے دونوں گروہ ایک جیسے ہیں اور مومنین کا معاملہ ان سے بالکل جدا ہے۔

۴۔ مؤمنین کے بارے میں "جزا" کے بجائے "توبہ" کا لفظ آیا ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ انھیں زیادہ تر خوف اپنی ان لغزشوں کی وجہ سے ہوتا ہے جو کبھی کبھی ان سے سرزد ہوتی ہیں۔ لہٰذا خداوند تعالیٰ انہیں اطمینان دلاتا ہے کہ ان کی لغزشوں کو معاف کردیا جائے گا۔

یا اس بنا پر ہے کہ خدا کا بندوں کی توبہ قبول کرنے کا مقصد اس کی رحمت کی طرف بازگشت ہوتا ہے اور معلوم ہے کہ لفظ "رحمت" میں ہر قسم کی جزا اور بخشش چھپی ہوئی ہے۔

۵۔ پروردگار کی "غفور ورحیم" کے ساتھ توصیف یا تو اس لیے ہے کہ یہ کلمہ "ظلوم" اور "جہول" کے مقابلے میں یا پھر مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کے بارے میں توبہ کی مناسبت سے۔

اب جبکہ ہم فضل پروردگار سے سورۂ احزاب کے اختتام کو پہنچ گئے ہیں، اس نکتے کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سورہ کے آغاز و انجام کی ہم آہنگی نہایت ہی قابلِ غور ہے۔ کیونکہ یہ سورہ (احزاب) پیغمبر کو خدا کا تقویٰ اختیار کرنے اور کفار و منافقین کی اطاعت سے روکنے اور خدائے علیم و حکیم کی ذات پر توکیہ کرنے سے شروع ہوئی ہے اور انسان کی زندگی کے عظیم ترین مسئلے یعنی امانت الٰہی کے اُٹھا لینے کے ذکر پر اور پھر انسانوں کو تین گروہوں (منافق، کافر اور مؤمن) میں تقسیم کرنے اور خدائے غفور و رحیم کا ذکر کرنے پر ختم ہوئی ہے۔

ان دونوں مباحث کے درمیان ان تینوں گروہوں سے متعلق گفتگو ہوئی ہے کہ انہوں نے امانت الٰہی کے ساتھ کس طرح سلوک کیا ہے؟ جو سب ایک دوسرے کی تکمیل اور ایک دوسرے کو واضح کرتی ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

پروردگارا! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے، جنہوں نے تیری امانت کو خلوص دل کے ساتھ قبول کیا اور عشق کی حد تک اس کی حفاظت کی اور اپنے فریضے سے عہدہ برآ ہوئے۔

خداوندا! ہمیں ایسا مؤمن بنا جس پر تیری رحمت اور مغفرت نازل ہوئی ہے۔ منافقین اور مشرکین سے قرار نہ دے کہ جو "ظلوم و جہول" ہونے کے باعث عذاب کے مستحق ٹھہرے ہیں۔

خداوندا! اس دور میں جبکہ "احزاب کفر" دوبارہ "مدینۂ اسلام" کا محاصرہ کر چکے ہیں۔ ان پر اپنے غیظ و غضب کا خوفناک طوفان نازل فرما اور ان کے تصور و محلات کو ان کے سروں پر گرا دے اور ہمیں ایسی طاقت و استقامت عطا فرما کہ ان حساس لمحات میں پہاڑ کی طرح ڈٹ جائیں اور اپنے جان و دل سے "مدینۂ اسلام" کی پاسداری کریں۔ آمین یارب العالمین!

سورۂ احزاب تمام شد

تفسیر نمونہ کی سترھویں جلد کا اختتام بروز جمعہ ۲ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ کو ہوا۔